یادگار ولی

مرتبہ

سید محمد ایم۔اے

1766
S

مطبوعہ

مطبع برقی مکتبہ ابراہیمیہ
حیدرآباد دکن

قیمت عہ

سنہ ۱۹۳۷ء

[illegible]	۲۴۸۸۷
[illegible]	ج ۵۰ ۲ / ۹۲۸۶۹۱۳
[illegible]	[illegible] ۱۳۵۵

یادگارِ ولی

۲۳۷۵۲
تذکرہ
۲۹۳

۲۳۰
۲۳۵

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	نگارندۂ مضمون	صفحہ قرطاس
۱	یوم ولی		۹
۲	خطبۂ استقبالیہ	مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی (کینٹب)	۱۷
۳	پیامات		۲۰
۴	خطبۂ صدارت	عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر بالقابہم	۳۰
۵	" "	نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن)	۳۴
۶	استاد الاساتذہ ولی (نظم)	مولانا سید احمد حسین امجد (حیدرآبادی)	۳۶
۷	تذکرۂ ولی		۳۷
۸	ولی اورنگ آبادی (نظم)	سید سکندر علی صاحب وجد بی اے (عثمانیہ)	۴۵
۹	ولی کا وطن	ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)	۴۷
۱۰	جگت پریم	مولوی غلام طیب صاحب بی اے بی ٹی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد	۶۰
۱۱	ولی کا سنہ وفات	مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو	۶۱
۱	ولی (نظم)	" مخدوم محی الدین صاحب ایم اے (عثمانیہ)	۶۴
	ولی کی شاعری	" ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج	۶۵

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	نگارندۂ مضمون	صفحۂ قرطاس
۱۴	مطرب اولین (نظم)	مولوی عبدالقیوم صاحب باقی ام اے (عثمانیہ)	۷۹
۱۵	ولی کا اسلوب شعر و جدید شاعری	״ ״ ״ ״	۸۱
۱۶	ولی دکھنی (نظم)	״ بدرالدین صاحب شکیب بی اے ال ال بی (عثمانیہ)	۹۲
۱۷	ولی اور اس کی شاعری	موسیو گارساں دی تاسی مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین صاحب پی ایچ ڈی	۹۳
۱۸	ولی میر (نظم)	مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج	۱۰۱
۱۹	ہمارا قومی شاعر	سہمانی	۱۰۲
۲۰	ولی (نظم)	صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش (عثمانیہ)	۱۰۶
۲۱	ولی کی اہمیت	مولوی شیخ چاند صاحب مرحوم ام اے	۱۰۷
۲۲	عہد ولی میں دکن کی علمی و تمدنی حالت	״ عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے - ال ال بی (عثمانیہ)	۱۱۰
۲۳	ولی سے پہلے دکن کی اردو شاعری	״ نصیرالدین صاحب ہاشمی	۱۱۷
۲۴	یاد ایام ولی (نظم)	عبدالعزیز صاحب غوثی متعلم جامعۂ عثمانیہ	۱۲۵
۲۵	ولی کے تلامذہ کا دور	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام اے - ال ال بی (عثمانیہ)	۱۲۶
۲۶	شاعر اعظم (نظم)	مرزا باقر علی صاحب زاہد متعلم سٹی کالج	۱۳۴
۲۷	اردو شاعری میں ولی کا رتبہ	محمد عبدالحکیم صاحب متعلم ام اے ابتدائی جامعۂ اسلامیہ علیگڑھ	۱۳۵
۲۸	״ ״ ״	زین العابدین صاحب متعلم بی اے آنرز ״ ״ ״	۱۵۷
۲۹	״ ״ ״	سید کوثر صاحب ہندو کالج دہلی	۱۷۸
۳۰	چاسر ہند (نظم)	سید عباس حسین صاحب امید متعلم جامعۂ عثمانیہ	۱۹۴
۳۱	شعرائے دکن کا سفر شمالی ہند	خلیق احمد صاحب نعمانی متعلم جامعۂ عثمانیہ	۱۹۶
۳۲	دیوان ولی کے قلمی نسخے	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور دیگر حضرات	۲۲۱
۳۳	مخطوطات اردوئے قدیم		۲۲۷
۳۴	انتخاب کلام ولی	سید محمد	۲۴۵

فہرستِ تصاویر

	صفحہ
۱- عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر سرپرست و صدر جلسۂ اول	۳۰
۲- عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر جلسۂ دوم	۳۴۱
۳- جلسۂ اول یوم ولی	۴۷
۴- قطب شاہی خوشنویس محمد رضا کی ایک وصلی	۶۰
۵- قلعہ گول کنڈہ (محمد نگر)	۶۸
۶- مقبرہ شاہان گول کنڈہ	″
۷- سلطان محمد قلی قطب شاہ بانی سلطنت گولکنڈہ	۸۴
۸- ″ جمشید قلی قطب شاہ	″
۹- ″ ابراہیم قلی قطب شاہ	۹۲
۱۰- ″ محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد	″
۱۱- ″ محمد قطب شاہ	۱۰۰
۱۲- ″ عبداللہ قطب شاہ	″

	صفحہ
۱۳- سلطان ابوالحسن تانا شاہ	۱۰۱
۱۴- ابن نشاطی مصنف "پھول بن"	۱۲۰
۱۵- غواصی مصنف "طوطی نامہ"	″
۱۶- لوح دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ (نسخۂ شاہی)	۱۲۸
۱۷- دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ کا ایک صفحہ	۱۲۹
۱۸- لوح دیوان سلطان عبداللہ قطب شاہ	۱۶۸
۱۹- یوسف زلیخا تصنیف ہاشمی بیجاپوری کا ایک صفحہ	۱۸۴
۲۰- گلشن عشق تصنیف ملک الشعرا نصرتی کا ایک صفحہ	۲۰۰
۲۱- نورس نامہ تصنیف سلطان ابراہیم عادل شاہ	۲۱۶
۲۲- نمائش مخطوطات یوم ولی کا ایک منظر	۲۲۴
۲۳- نمائش مخطوطات یوم ولی کا ایک اور منظر	۲۴۰
۲۴- مجلس ادارت الموسی ۱۳۴۶ ف	۲۵۶

داخلہ نمبر ۲۲۸۸۷
فن نمبر ح ۰ ۵ ۲

یوم ولیؔ

قدیم دکنی ادبیات کے "خاتم الشعراء" اور جدید اردو شاعری کے "باوا آدم" استاد الاساتذہ ولی اورنگ آبادی کا دوصد سالہ جشن یادگار منانے کی تحریک ابتداءً ہماری بزم ادب کے سرگرم نائب صدر خلیل احمد صاحب آزاد نے اپنی کابینہ کی متفقہ قرارداد کے ساتھ جناب صدر صاحب کلیّہ کی خدمت میں پیش کی۔ صاحب معزکو فنِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبیات کا اعلیٰ ذوق اور خصوصاً اُردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی کا غیر معمولی خیال ہے انھوں نے اس گراں قدر تحریک کو نہ صرف رسماً منظور فرمایا بلکہ بطور خاص دلچسپی لی اور مندرجۂ ذیل اصحاب کی ایک مجلسِ انتظامی مقرر فرما کر اس اہم کام کو بہ عجلت ممکنہ عملی جامہ پہنانے پر زور دیا۔

۱۔ مولوی غلام قادر صاحب بی، اے نائب صدر کلیّہ
۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ام، اے، پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ
۳۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام، اے، ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ
۴۔ مولوی ابوالظفر عبدالواحد صاحب ام، اے لکچرار اُردو سٹی کالج
۵۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام، اے، ال ال بی لکچرار اُردو جامعہ عثمانیہ
۶۔ مولوی میر حسن صاحب ام، اے مددگار سٹی کالج
۷۔ خلیل احمد صاحب آزاد نائب صدر انجمن اتحاد سٹی کالج

۸ ۔ سید محمدؐ (معتمد)

اس مجلس نے جناب صدر صاحب کے دولت خانہ پر کئی اجلاس منعقد کیے اور "جشن یادگار ولی" سے متعلق نظام العمل وغیرہ مرتب کیا۔ اس سلسلہ میں بہ اتفاق آرا طے پایا کہ

(۱) حیدرآباد اور بیرونِ حیدرآباد کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کو قلمی اعانت کے لیے مدعو کیا جائے۔

(۲) ہندوستان کے مختلف جامعات کے طیلسانی اور غیر طیلسانی طلبہ سے حسبِ ذیل موضوع پر مسابقتی مضامین لکھائے جائیں۔ "اردو شاعری میں ولی کا رتبہ"

(۳) قدیم اردو (دکنی) کے نادر اور گراں بہا مخطوطات نیز اس دور سے متعلق قدیم قلمی تصاویر کی ایک شایان شان نمائش کی جائے۔

(۴) سٹی کالج میگزین "الموسی" کا ایک خاص نمبر "یادگار ولی" شایع کیا جائے۔

اس مجلس نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے اساتذہ، طلبہ اور دیگر ہمدردوں کی ذیلی کمیٹیاں بھی مقرر کیں۔ جو حسبِ ذیل ہیں:۔

ادبی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ
(۲) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۳) " عبدالقادر صاحب سروری لکچرار جامعہ عثمانیہ
(۴) سید محمدؐ (معتمد)

ڈرامے کی کمیٹی

(۱) مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب لکچرار سٹی کالج
(۲) " رکن الدین احمد صاحب قریشی مددگار سٹی کالج
(۳) مسٹر سیون مددگار سٹی کالج
(۴) مسٹر جے ایس بھان مددگار سٹی کالج

نمائش کی کمیٹی

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صدر
(۲) مولوی عبدالرحمن شریف صاحب مددگار سٹی کالج
(۳) " غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج
(۴) صاحبزادہ محمد علی خاں میکش متعلم جامعہ عثمانیہ
(۵) سراج الدین صاحب متعلم سٹی کالج
(۶) سید محمد (معتمد)

دکن کے اس مایۂ ناز شاعر کے دوصد سالہ جشن یادگار کی صدارت کے لیے اس کے شایانِ شان ہستی کا انتخاب کیا گیا۔ عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی مشہور خاندانی علم دوستی سے کام لے کر اس ادبی تقریب کی سرپرستی قبول فرمائی اور اس میں اس قدر دلچسپی لی کہ اجلاس اوّل کی صدارت کرنے کے علاوہ اپنے مشہور و معروف خاندانی کتب خانہ سے اُردو کے نادر و بیش قیمت مخطوطات اور گراں بہا تصویریں مستعار عنایت فرما کر نمائش کو کامیاب بنایا۔

اُردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح کی کامیاب نمائش منعقد کی گئی جس کی تفصیلی روئداد ایک جداگانہ عنوان کے تحت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کے قلم سے جو اس کمیٹی کے صدر تھے آئندہ صفحات میں درج ہے۔

جشن ولی کے دوسرے اجلاس کی صدارت ملک کے مایۂ ناز سپوت اور مشہور علم دوست نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات و سیاسیات نے باوجود اپنی غیر معمولی مصروفیات کے قبول فرمائی۔

دونوں جلسوں کے صدر صاحبان نے اس موقع پر جن گراں بہا خیالات کا اظہار کیا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدیم شاعر کی دوصد سالہ یادگار منانے کی ملک کو کتنی ضرورت تھی یہ دونوں صدارتی خطبے آئندہ صفحات میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

"یوم ولی" کا پہلا اجلاس ۴ ر فبروری ۱۹۳۷ء بروز چہارشنبہ ۴½ بجے سے شروع ہوا

پہلے نواب سالار جنگ بہادر نے نمائش کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد مولوی سید محمد اعظم صاحب ام' اے (کینٹب) صدر کلیہ نے خطبۂ استقبالیہ اور ہندوستان کے مختلف علم دوست اصحاب کے پیامات پڑھ کر سنائے۔ پھر صدر عالی قدر کے خطبۂ صدارت کے بعد کلام ولی کی قرأت کے ساتھ جلسہ کا آغاز کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ولی کے وطن اورنگ آباد سے وہاں کے کالج نے بھی نمایندگی کی اور مولوی سید محی الدین صاحب بی' اے (آکسن) صدر اورنگ آباد کالج نے ایک دلچسپ پیام مولوی غلام طیب صاحب بی' اے' بی ٹی لکچرار اُردو کے ذریعہ روانہ کیا جس کو صاحب موصوف نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد اپنی ایک نظم بھی سنائی جو خاص اس تقریب کے لیے لکھی گئی تھی۔ مولوی عبد الحق صاحب بی' اے پروفیسر کی تقریر "ولی کی وفات" کے بعد نماز مغرب کے لیے وقفہ دیا گیا۔ اس وقفہ کے بعد حسبِ ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں۔

(۱) نظم ۔ مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی' اے' ایچ سی ایس پروبیشنر

(۲) عہد ولی میں دکن کی علمی و تمدنی حالت ۔ از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام' اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۳) نظم ۔ صاحبزادہ مولوی میر محمد علی خاں صاحب میکش (عثمانیہ)

(۴) ولی کی شاعری ۔ مولوی ابو ظفر عبد الواحد صاحب ام' اے لکچرار سٹی کالج

ان نظموں اور تحریروں کے درمیان ولی کا کلام تحت اللفظ اور لَے کے ساتھ پڑھا گیا جس کے سننے سے حاضرین پر ایک خاص کیف و اثر طاری ہوتا رہا۔ اس طویل عرصہ یعنی تقریباً چار گھنٹے تک نواب سالار جنگ بہادر نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی اور نہایت دلچسپی سے کارروائیوں میں حصہ لیا۔

"یوم ولی" کا دوسرا اجلاس دوسرے دن صبح میں ۸½ سے ۱۲ بجے تک منعقد ہوا' اس کی صدارت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمائی جنھوں نے پہلے نمائش کو معائنہ فرما کر خاص دلچسپی اور تاثر کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حسبِ ذیل نظمیں اور تقریریں پڑھی گئیں :-

(۱) نظم ۔ جناب مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام' اے

(۲) ولیؔ کا اسلوب شاعری و زبان ۔ جناب مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقیؔ ام، اے
(۳) نظم ۔ جناب مولوی بدر الدین صاحب شکیبؔ بی، اے، ال ال بی
(۴) ولیؔ کا وطن ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ام، اے، پی، ایچ ڈی
(۵) کلام امجدؔ ۔ حکیم الشعراء مولانا سید احمد حسین صاحب امجدؔ
(۶) ولی سے پہلے دکن کی اردو شاعری ۔ جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمیؔ مددگار دیوانی بلدہ
(۷) نظم ۔ جناب سید عباس حسین صاحب امیدؔ
(۸) نظم ۔ جناب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام، اے
(۹) تلامذۂ ولیؔ کا دور ۔ جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام، اے، ال ال بی لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

ان دونوں اجلاسوں میں حاضرین کئی ہزار کی تعداد میں تھے ۔ اور حیدرآباد کے اکثر عہدہ دار، جملہ ارباب ذوق اور طلبہ شریک رہے ۔

اس تقریب کے بعد کئی روز تک مقامی اخبارات اس کی روئدادیں اور اس کے متعلق مراسلے شایع کرتے رہے اور اپنے اداریوں میں اس کی کامیابی پر اظہار خیال کیا ۔ ان اداریوں اور مراسلوں میں سے ایک کا مختصر سا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے ۔ جس سے پبلک پر اس تقریب کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے ۔

(نقل مراسلہ پیام)

دکن کے عظیم الشان شاعر اور اردو شاعری کے باوا آدم کی وہ صد سالہ تقریب یادگار نے جوبلی کالج میں شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی، حیدرآباد کی علمی دلچسپیوں میں دو دن تک خاص چہل پہل پیدا کر دی تھی ۔ اس کے اجلاسوں میں سامعین کی کثرت ارباب ملک کے علمی ذوق اور احساس بیداری کا خوش گوار نظارہ پیش کر رہی تھی ۔ جس طرح یہ جشن اپنے باطن میں ایک شاندار مادی پہلو رکھتا ہے ۔ اسی طرح اس کو ظاہراً بھی شایان شان بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور حیدرآباد کے اس قدیم علمی ادارہ کو جس میں دکن کے جگت استاد شاعر کا یادگاری جشن منایا گیا، دلہن کی طرح سنوار کر ایک بہشت مختصر بنا دیا گیا تھا ۔

نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی، مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل سٹی کالج، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور مولوی سید محمد صاحب لکچرار سٹی کالج کی مخلصانہ مساعی سے یہ جشن ہر طرح کامیاب اور شاندار رہا۔

اس جشن کی تصویر کا نمایاں رُخ، جو سب سے پہلے دیدہ دل کے لیے باصرہ نواز اور بصیرت افروز ثابت ہوا، وہ دکن کے قدیم قلمی کتابوں اور تصاویر کی گراں مایہ نمائش تھی۔ اس کو دیکھ کر ہمارا یہ احساس قوی تر ہوگیا ہے کہ فرخندہ بنیاد میں قدیم علمی جواہر پاروں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس خصوص میں سب سے بڑھ کر نواب سالار جنگ بہادر کا علمی حصہ ہے جن کی عنایتوں اور مشوروں کے بغیر یہ نمائش کامیاب نہ ہوسکتی تھی۔ جامعہ عثمانیہ، پروفیسر مرزا حسین علی خاں نائب صدر جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج، ڈاکٹر محمد قاسم صاحب اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی اپنے کتب خانوں سے کئی قلمی نسخے مستعار دے کر، نہ صرف اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا بلکہ ارباب ملک کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہونے کا سنہری موقع بھی۔

اس نمائش میں تقریباً (۵۰۰) قلمی نسخے موجود تھے ان کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کے دوسرے کتب خانوں میں بھی کئی قلمی کتابیں جو خالص دکنی پیداوار ہیں محفوظ ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھاگ نگر کی پرانی بستی کا علمی ماحول شروع ہی سے تصنیف و تالیف کا گہوارہ رہا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان کارناموں کو جو شیشوں کی الماریوں میں بہ طور نمائش بند پڑے ہوئے ہیں، جیسا کہ نواب سالار جنگ بہادر نے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا ارباب ملک کے افادہ کی خاطر منظر عام پر لایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ نواب صاحب کی فیاضانہ اعانت اور مولوی سید محمد اعظم صاحب، ڈاکٹر زور اور مولوی سید محمد صاحب کی گرمجوشانہ مساعی سے مستقبل قریب میں اس خوش آئند کام کا آغاز ہو جائیگا۔

اس کے علاوہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات کی وہ قیمتی تحریک بھی عملی جامہ پہننے کے قابل ہے جو اُنھوں نے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی کہ اس قسم کی

نمائش کو ایک مستقل حیثیت دی جانی چاہیے اور وہ علم دوست حضرات جنہوں نے اس نمائش کو کامیاب بنانے میں عملی حصہ لیا، ایثار و فیاضی سے کام لیں تو یہ ایک ایسی چیز ہوگی جس پر حیدر آباد بجا طور پر ناز کر سکیگا۔

مسٹر سید محمد اعظم کا خطبۂ استقبالیہ، نواب سالار جنگ بہادر اور نواب مہدی یار جنگ کی صدارتی تقریریں اور مختلف موضوعات پر بلند پایہ مقالے، جو سنائے گئے، سب کے سب معلومات آفریں اور قیمتی تھے اور ان سے نہ صرف ولی کا کردار ایک عظیم الشان شاعر اور مکمل انسان کی حیثیت سے واضح ہو گیا بلکہ سامعین کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ بھی ہوا۔

نواب سالار جنگ بہادر کے آبائی اور ذاتی ذوق علم و ادب سے کون ناواقف ہے؟ نواب صاحب نے جو صدارتی تقریر فرمائی اس میں علم دوستی اور علم پروری کی روح، اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ جھلک رہی تھی اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کے عالمانہ ارشادات میں ایک متبحر فاضل کی نکتہ شناسیوں کا ایک سمندر لہراتا نظر آرہا تھا۔ جشن کے اجلاسوں کی صدارت کے لیے ان ممتاز فرزندانِ ملک سے بڑھ کر غالباً کوئی دوسری ہستی اتنی موزوں ثابت نہ ہوتی! اربابِ جشن کی نگاہِ انتخاب، لائق داد ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ "الموسی" کا وہ خاص نمبر جس میں تمام وہ مقالات جو پڑھے گئے شایع ہو رہے ہیں بہت گراں پایہ ہوگا اور جس کو ایک ایسے مرقع سے تعبیر کیا جا سکیگا، جس میں ولی کی سیرت اور کردار کی مختلف تصویریں نظر آئینگی۔

اس جشن کے شعری نظام العمل میں ہمیں ملک کے مہا استاد حضرت امجد کی شاعرانہ سحر آفرینی کے بعد مسٹر مخدوم محی الدین اور مسٹر سکندر علی وجد کی نظمیں بہت پسند آئیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوب تھیں۔ تخیل اور بحر کے لحاظ سے تو یہ دونوں ایک ہی معلوم ہوتی تھیں لیکن اسلوب بیان اور طرز اظہار نے دونوں میں فرق پیدا کر دیا۔

نظام العمل میں ولی کے کلام کو بھی جگہ دی گئی تھی۔ وقفوں سے اس استاذ الاساتذہ کی غزلیں ترنم کے ساتھ سنائی گئیں۔ وہی رنگینی، وہی کیف، وہی جوش اور وہی زندگی

تجھ شعر کا آوازہ سب جگ میں ہوا ہے ٭ تیرے ولی سخن کو گوہر نہ کہوں تو کیا کہوں

(ولی)

آخر میں ہم اپنی محبوب، مادرِ علمی کے ہونہار سپوتوں، فاضل اساتذہ اور محترم صدر کو دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی محنتیں چیز ہوئیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کی پر خلوص خدمات اور نواب سالار جنگ بہادر کی مہربانیاں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ "یوم ولی" نے دلوں پر ایسے نقوش مرتسم کیے ہیں جو خوش گوار یاد اور بیداری کی صورت میں ہمیشہ رہینگے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ولی کی طرح دکن کے قدیم شاعروں مثلاً قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی وغیرہ کے بھی یادگاری جشن منائے جائیں تاکہ ان کے متعلق بھی اربابِ ملک کو واقف ہونے کا موقع ملے۔ سٹی کالج کی اس خوش آئند ابتداء اور یوم ولی کی ہمت افزا کامیابی کے بعد یہ توقع بے جا نہیں فقط اسی نمبر میں مذکورۂ بالا مضامین کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ مضمون اور نظمیں شریک ہیں جن کے مطالعہ سے اہل ذوق پر واضح ہوگا کہ یہ تقریب کس قدر کامیاب رہی اس سلسلے میں اہل علم حضرات نے جس ذوق دلچسپی کا اظہار کیا اور اس تقریب کے بعد سے ملک میں علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا ہے نیز اس کے بعد اندھیری کالج میں جو یوم ولی منایا گیا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اپنے قومی ادب اور قومی شاعروں کے ساتھ ہماری دلچسپیاں کسی طرح کم نہیں ہوی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ ہم اپنے ادب کی پوشیدہ قوتوں سے بہ ہمہ وجوہ آگاہ ہو کر دنیا کی دوسری مہذب اقوام کی طرح اس پر بجا ناز کرینگے۔

خطبۂ استقبالیہ

جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے (کنٹب) بی ایس سی پرنسپل سٹی کالج

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر و معزز حضرات!

میں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگون مصروفیات کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا کر اس تقریب سعید میں شرکت کی غرض سے یہاں تک آنیکی زحمت گوارا فرمائی۔ اس شاندار علمی اجتماع کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں مسرت کی موجیں اٹھتی ہیں کہ آج کا یہ جلسہ رسمی اور محض ایک دل خوش کن اجتماع نہیں بلکہ ایک ایسا جلسہ ہے جس کی یاد دلوں میں تا دیر قایم رہیگی۔

حضرات! ولی کی عظمت اور اس کے ملہمات شعری کی اہمیت جتانا میرا کام نہیں۔ یہ کام ان حضرات کا ہے جو اس غرض کیلئے بلحاظ موزونیت مختص کردیے گئے ہیں اور جن کے مقالے آپ آج اور کل کے اجلاس میں سنینگے۔ البتہ مجھ جیسا ایک عامی اور اردو ادب کے مشاہیر سے محض سطحی واقفیت رکھنے والا آدمی بھی اس موقع پر کچھ کہنے اور اپنے تاثرات کو پیش کرنے کی جسارت ضرور کرسکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے قدیم وجدید شعراء کی خاصی طویل فہرست میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو ولی کی طرح صدفی صد شاعر اور صدفی صد ہندی کہلانے کا مستحق ہو۔ اردو شاعری میں میں ادباً عرض کرونگا۔ مجھے تو بدیہی عیب نظر آتا ہے اور وہ عیب ہے اس کا یکرخا پن۔

زندگی اور زندگی کی دلچسپیاں اتنی تنگ ومحدود نہیں جتنا کہ ہمارے شعراء نے اس کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے وسیع میدان میں ہماری تنگ حوصلگی کی ذمہ داری ہمارے شعراء پر عاید ہوتی ہے۔

وہ شگفتگی ، جوشِ عمل ، تنوّع اور جذبات انسانی کی جاندار تصویریں اور زندگی کی وہ رنگارنگ کیفیتیں، جن سے شعرائے عرب یا فرنگی شعراء کا کلام مالا مال نظر آتا ہے، یہ چیزیں ہمارے شعراء کے ہاں عنقا ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک زمانے تک اردو شاعری، فارسی شعراء اور شاعری کی مقلد اور دست نگر رہی ہے ۔ البتہ ولی اس معاملے میں صد فی صد ہندی اور اس کی شاعری زندگی کی عین مین تصویر ہے ۔ یہ مانا کہ خادمِ زبان کی حیثیت سے بھی اس کی عظمت اور برتری مسلّم ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ۔ وہ ایک کامل شاعر اور ایک کامل انسان تھا ۔ ایسے جوہر کامل اور باکمال انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کی دل سے قدر کرنا اور ان کی یاد کو تازہ کرنا صرف اقتضائے بشری اور شرط انصاف ہی نہیں بلکہ کسی ملک کی قومی روایات کی شیرازہ بندی کے لیے از حد ناگزیر ہے ۔ اس موقع پر ایک امر لایق اظہار ہے اور وہ یہ کہ استاد ولی کا سنہ وفات ایک حد تک معرض بحث میں ہے بعض کا خیال ہے کہ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی ۔ بعض نے ۱۱۵۵ھ قرار دیا ۔ اگر آخر الذکر سنہ صحیح ہے تو ہمارا یہ جشن ٹھیک دو سو سال کے اختتام پر منایا جا رہا ہے اگر اول الذکر سنہ درست ہے تو بھی دو سو سال گزر چکنے کے بعد ہم یہ جشن منا رہے ہیں ۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ جس ساز و سامان اور جس اہتمام کے ساتھ ہم دکن بلکہ جگت استاد کا یادگاری جشن منا رہے ہیں غالباً ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کو جو آئندہ استاد ولی کی برسی منانے کا عزم کرے (مثلاً اسمٰعیلیہ کالج صوبۂ بمبئی میں ولی کی دو صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے) یہ مواقع اور سہولتیں شاذ و نادر ہی حاصل ہو سکیں ۔ بلدہ حیدرآباد ایک زمانہ تک قطب شاہی سلاطین کی راجدھانی رہا ہے ۔ اس کی شاندار تاریخ اور روادارانہ آئین حکومت کے چرچے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ مہتم بالشان یادگار اس کی وہ ادبی خدمات ہیں جن کی بدولت اردو زبان میں ادبی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی ۔ چنانچہ اس کا روشن ثبوت وہ انمول قلمی نسخے ہیں جن کی نمایش کا افتتاح آج ان ہاتھوں سے ہوا جن کی رگوں میں میر عالم جیسے مدبر اور سالار جنگ اعظم جیسے محسنِ قوم و ملک کا خون موجزن ہے ۔

یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر بالقابہم نے اس موقع پر زحمتِ صدارت قبول فرما کر اپنی آبائی خصوصیات علمی اور خاندانی وجاہت اور معارف نوازی کا ثبوت دیا ہے ۔ نواب صاحب

نے اپنے مشہور و معروف کتب خانے سے نہ صرف متعدد نہایت قیمتی اور نادر الوجود قلمی تصاویر و نسخہ جات مستعار مرحمت فرمائے بلکہ اس سے بہت زیادہ اپنے اُن قیمتی مشوروں سے مستفیض فرمایا جو بڑی حد تک اس نمائش کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ان عنایات اور توجہ خاص کا میں اپنی اور اپنے رفقاء کار کی جانب سے پرخلوص ہدیۂ تشکر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں۔

ہماری مزید خوش قسمتی یہ ہے کہ اس یوم سعید کے دوسرے اجلاس کی صدارت ہماری ریاست اور ملت کے قابل، علم دوست، اور ہر دل عزیز وزیر تعلیم عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر فرمارہے ہیں جن کی ذاتی اور آبائی خصوصیات علمی اور بے لوث ملکی خدمات سے ملک کا ہر طبقہ بخوبی واقف ہے۔

حضرات جس کام کی ابتداء ایسے مبارک ہاتھوں اور خوشگوار حالات میں ہو اس کا انجام لازماً اچھا ہونا چاہیے۔ ع کارے کہ نکو است از بہارش پیداست!

آپ حضرات کا پھر ایک مرتبہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنی یہ کاغذی تقریر ختم کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ ولی کا کلام اور ولی کی ولایت کے عالمانہ ذکر و اذکار سے جو ولی کے فاضل پرستار آپ کے سامنے پیش کرینگے آپ مسرور ہونگے۔ آپ کی خوش وقتی ہی ہماری محنت کا صلہ ہے۔ میں اس نمائش کے سلسلہ میں حسب ذیل حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی اعانت کے بغیر اس کا قیام ہی ممکن نہ تھا۔

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر

مولوی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج

مولوی حسین علی خاں صاحب پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

اور دیگر حضرات

پیامات

(۱)

عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای (کے سی، آئی ای) پیشکار وصدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد پیشی عالیجناب مہاراجہ بہادر تحریر فرماتے ہیں:-

عالیجناب مہاراجہ بہادر بالقابہم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "کل یوم ولی میں بوجہ ناسازی مزاج شریک نہ ہوسکا، جس کا افسوس ہے۔ بانیان یوم ولی نے دکن اور ہندوستان کے مایۂ ناز اور قدیم شاعر ولیؔ اورنگ آبادی کا دن منانے میں جو اہتمام کیا ہے، وہ قومی بیداری کی علامت اور علمی زندگی کی دلیل ہے۔ اس لیے لائق قدر اور باعثِ مسرت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایسی قومی تقاریب کا سلسلہ جاری رہیگا اور اُن میں میری طرف سے قلمے، درمے شرکت سے مجھے خوشی ہوگی" مورخہ ۴ ہر اسفندار ۱۳۴۶ف

(۲)

عالیجناب رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر (بی، سی، کے، ٹی ال ال ڈی) صدر المہام فینانس سرکار عالی

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ ہنوز میری طبیعت نادرست ہے اور میں باہر نہیں نکل رہا ہوں۔

"As you Probably know I am still confined to my room and I do not

میں شاعر اعظم وؔلی کے دو صد سالہ جشن یادگار میں شرکت کا بہت خواہشمند تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ میرے معالج مجھے شام میں باہر نکلنے کی اجازت دینگے۔

مورخہ ۲ر فروری ۱۹۳۷ء

think the doctors will allow me to venture out in the evenings much as I should have liked to have been present at the celebration of the Bicentenary of the Great Poet Wali".

(۳)

عالیجناب نواب نظامت جنگ بہادر سابق صدر المہام سیاسیات سرکار عالی

"جشن یادگار وؔلی" کے موقعے پر آپ حضرات کو مبارک باد کہتے ہوئے اپنا یہ خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلاف کے نمایاں کاموں کی قدر جن دلوں میں ہوتی ہے وہ ہدایت کے راستے پر آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا یہ جلسہ دکھنیوں کے اور بھی کاموں کو جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوں روشنی میں لانے کا محرک ہوگا۔ مورخہ ۲۶ ر جنوری ۱۹۳۷ء

(۴)

علامہ ڈاکٹر سر اقبال

افسوس کہ میں ایک طویل علالت کی وجہ سے آپ کے جشن میں شرکت سے معذور ہوں۔ آپ نے یوم وؔلی منا کر شاعر اعظم وؔلی کی یاد کو جو تازہ کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ قومیت اور اسلاف پرستی کا صحیح جذبہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ جلسہ کامیاب ہو۔

مورخہ ۲۳ ر جنوری ۱۹۳۷ء

(۵)

جناب سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل (لندن)

"Heartiest good wishes for Successfull celebration of the Second Centenary of Wali, Great Deccan poet. Regret absence".

—

دکن کے شاعر اعظم ولی کے دو صد سالہ جشن یادگار کی کامیابی کے لیے میری مخلصانہ مبارک باد قبول فرمائیے ۔ اپنی غیر حاضری کا افسوس ہے ۔ مورخہ ۲۶ ؍ جنوری ۱۹۳۷؁ء

(بذریعہ تار)

(۶)

نواب صدر یار جنگ بہادر جنرل سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ

"جشن یادگار ولی کامیاب ہو یہ عین تمنا ہے ۔ دل یہ چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ولی کے کلام کی بابت کچھ لکھ کر پیش کرسکوں" مورخہ ۱۸ ؍ نومبر ۱۹۳۶؁ء

(۷)

نواب سر مسعود جنگ بہادر وزیر تعلیمات بھوپال

My Dear Azam

"Very many thanks for your extremely kind invitation to me to attend the Bicentenary of Wali. I wish I could have attended it, but unfortunately owing to heavy pressure of official engagements I am compelled

مائی ڈیر اعظم ! دو صد سالہ جشن یادگار ولی میں شرکت کے لیے آپکی عنایت آمیز دعوت کا بہت بہت شکریہ ۔ میں اس میں شرکت کا متمنی ہوں مگر بدقسمتی سے سرکاری مصروفیات کی کثرت مجھے اس پر لطف محفل کی

شرکت سے باز رکھتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ میرا کامل ایقان ہے کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کی عزت و احترام نہیں کرتے وہ خود بھی دوسروں کی نظروں میں عزت و احترام پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے مجھے یقین ہے کہ آپ کی فاضلانہ قیادت و رہنمائی میں یہ تقریب نہ صرف بہت ہی کامیاب رہیگی بلکہ سارے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے لیے ایک قابل عمل نمونہ ثابت ہوگی۔ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۶ء

to forego the pleasure. You know that it has ever been my firm conviction that those who do not honour their own great men can never succeed in being honoured by others. I am sure that under your able guidance the function will be not only a great success, but also a great example for other educational institutions throughout India to follow".

—

(۸)

علامہ عبداللہ یوسف علی سی۔بی۔ای۔ ام۔اے۔ ال ال ام پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

آپ نے مجھے اِس امر کی دعوت دی ہے کہ میں وؔلی اورنگ آبادی کے دوصد سالہ جشنِ یادگار میں جو حیدرآباد میں ۲۸ تا ۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو منعقد ہونے والا ہے شرکت کروں۔ اس دعوت کے لیے میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان ایام میں فارغ بھی ہونگا یا نہیں۔ اس لیے حاضری سے معافی چاہتا ہوں۔ میں دلی مسرت کے ساتھ اپنا پیغام بھیج رہا ہوں۔ خداوند کریم آپ کی کانفرنس کو کامیاب کرے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ولی اورنگ آبادی اردو کا قدیم ترین شاعر ہے، جس کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اُس کی یادگار میں مجالس قائم کی جائیں اور اُس کی دوصد سالہ برسی منائی جائے۔ یہ فرض اہل دکن پر خاص طور سے عائد ہوتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہندوستان والے خاموش رہیں بلکہ تمام اُردو دنیا کو یہ جشن منانا چاہیئے - مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۳۶ء

(۹)

مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ

وَلی ہماری زبان کا آدم ہے - اس لیے اِس زبان کے سارے بنی آدم کا فرض ہے کہ وہ اپنے اِس محسن اوّل کا شکریہ ادا کریں اور اُس کی برسی کے دن اُس کی مغفرت کی دعا مانگیں - آپ کی انجمن مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس نے اِس فرض کی اہمیت کو دو سو برس کے بعد محسوس کیا - ابھی تک وَلی کے شعر و ادب اور حسنِ خدمات و سوانح پر ہماری زبان میں محققانہ مواد فراہم نہیں ہوا ہے - امید ہے کہ آپ کی اِس تقریب کے موقعے پر یہ اہم کام تکمیل پا جائے - آپ کے کالج کے پرنسپل صاحب کی حسن توجہ کا تمام اہل ادب شکریہ ادا کریں گے -

مورخہ ۱۷ر رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ

(۱۰)

جناب علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی

خدائے کریم کو اُس کی قدرت اور فطرت کی گوناگونی سے پہچانا جاتا ہے صوفیائے کرام میں ذات و صفات کا مباحثہ ابھی تک ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے - اِس مسئلہ کا اطلاق اگر اُردو کے ارباب بالخصوص شاعری پر کیا جائے تو ہم کو وہ دیوان اور منظوم کلام کے مجموعے جو بہت قدیم زمانے میں مرتب ہوئے لیکن کسی وجہ سے معرض گم نامی میں پڑے رہے ، نہ وہ نقد و مقابلہ کے تحت آئے نہ اہالی اُردو اُن سے مستفیض ہو سکے ، نظر انداز کر دینے پڑتے ہیں - اُردو کا پہلا دیوان یا مجموعۂ کلام جس سے دنیا روشناس ہوئی اور جس کا تتبع اور جس سے استفادہ کیا گیا وہ وَلی مرحوم کا ہے - اِس لیے میں خلوص دل اور گرم جوشی سے اور فراخدلی سے

حیدرآباد کی سٹی کالج یونین کے کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یوم ولی منانے کا عزم کیا۔ میں اس موقعے پر خود حاضر ہوتا اور خالی ہاتھ نہ آتا، لیکن ایسے موانع پیش آئے جنہوں نے معذور کر دیا۔

جس طرح دکن کا خطہ اردو کی تنظیم اور ترویج و توسیع میں بڑا حصہ دار ہے۔ اُسی طرح عین مناسب تھا کہ یوم ولی کی تقریب کے انعقاد میں وہیں سے ابتدا کی جائے اور ایسا ہو۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ولی کی وقعت صرف ارباب دکن کے دل میں ہے۔ ولی کی وہ ہستی ہے کہ ہر اہلِ اُردو اُس کا نام نے کر قلم کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ جہاں تک (وطنیت سے قطع نظر) اُردو کا تعلق ہے۔ ہم سب اردو والے ایک ہیں خواہ دکن میں رہتے ہوں یا پنجاب میں۔ ہم اِس کلچر کے کلمہ خواں ہیں جو هندو مسلمان ارتباط سے پیدا ہوئی اور ولی مرحوم جس کا پہلا نمائندہ اور منادی تھا۔

دعا ہے کہ کریم کارساز آپ کی مساعی کو کامیاب اور بار آور کرے۔ مورخہ ۲۲ ، جنوری ۱۹۳۷ء

—— (۱۱) ——

جناب مولانا عبدالماجد دریابادی

ولی کے مرتبے کو تو کوئی ولی ہی پہچان سکتا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ تو ہم نا اہلوں کو بھی کلام دیکھ کر ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ معرفت بین تھی۔ آپ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اردو شاعری کے باوا آدم کے فاتحہ کا آپ کو خیال آیا۔ ضرور یادگار منائیے اور اس تحریک کو پھیلائیے۔

یہ شرف آپ کی سرزمین کے لیے ازل سے مخصوص ہو چکا تھا کہ اردو شعر و سخن بھی سب سے پہلے آپ ہی کے ہاں جنم لے اور اُردو علم و ادب بھی آپ کے شاہ ذیجاہ کے زیر سایہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ مورخہ ۲۳ ، جنوری ۱۹۳۷ء

——— ٭٭٭ ———

(۱۲)

جناب نجیب اشرف ندوی پروفیسر اردو اسمٰعیلیہ کالج اندھیری بمبئی

ولی نے دور جدید کا آغاز کیا تھا اور مجھے امید کامل ہے کہ یوم ولی کا جشن اردو ادب و شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کریگا۔ اور اگر زندگی میں وہ ولی تھا تو مرنے کے دو سو سال بعد بھی اپنی ولایت وکرامت سے ادبی زندگی میں قوت پیدا کرکے اپنے نام کی عملی صحت کا ثبوت دیگا۔

ولی کو گجرات سے جو وطنی و روحی تعلق ہے، اس کی بنا پر سارے صوبۂ بمبئی کی آنکھیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ہم لوگ نہایت دلچسپی و توجہ سے دیکھینگے اور ان سے مستفید ہونگے۔

آپ نے جس اہم کام کی طرف قدم اٹھایا ہے اس کی ادبی کامیابی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ خود ہمارے کالج کی ادبی مجلس مجمع الادب نے یوم ولی منانا طے کیا ہے۔ اللہ پاک اس شوق کو اور عام کرے۔ مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء

(۱۳)

جناب میاں بشیر احمد بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا مدیر ہمایوں لاہور

خوشی کا مقام ہے کہ آپ لوگ اردو کے ایک بڑے شاعر کی یادگار میں یہ جشن منارہے ہیں، خدا آپ کی مساعی کو کامیاب کرے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں شرکت کا فخر حاصل نہ کرسکونگا۔ ۲۵ نومبر ۳۶ء

(۱۴)

مولانا سید محمد احسن مارہروی پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باوجود بعد مسافت اور کثرت مصارف دل چاہتا تھا کہ حاضری کی کوشش کروں مگر عین وقت پر

معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی میں صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے ہز اکسلنسی گورنر صاحب بہادر تشریف لانے والے ہیں یہ جشن یادگار وؔلی کے اہتمام پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ ۲۶ر دسمبر ۳۶ء

(۱۵)

جناب قاضی احمد میاں اخترؔ جوناگڑھی

اردو شاعری کے اس چاسر کی یادگار میں آپ نے جشن منانے کا جو اہتمام کیا ہے وہ مستحق آفریں و لایق تحسین ہے۔ ایران میں فردوسی کا جشن ہزار سالہ عراق میں متنبی کا جشن ہزار سالہ اور ادھر ہندوستان میں حالی کا جشن صد سالہ قوم کی زندہ دلی کے آثار ہیں۔ اس پر آپ نے جشن یوم وؔلی اضافہ کر کے قوم کی ادبی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جس کے لیے آپ اور آپ کے رفقاء و شرکاء کار لایق تہنیت و مبارک باد ہیں۔

خدا کرے یہ جشن ادب سراسر کامیاب رہے اور ایسے ہی دیگر علمی و ادبی مشاغل کے لیے محرک ثابت ہو۔ ۲۵ر جنوری ۳۷ء

(۱۶)

جناب صغرا ہمایون مرزا صاحبہ مدیرہ رسالہ النساء

دکن میں ہی اردو نے جنم لیا تھا اردو کا پہلا شاعر وؔلی دکنی تھا۔ اس کا فخر دکن کو ہے کہ وؔلی دکنی سا شاعر دکن میں گزرا اور اردو یونیورسٹی بھی دکن میں قائم ہوئی۔ میں بانیانِ جلسہ کو مبارک باد دیتی ہوں کہ انہوں نے دو سو سال کے بعد وؔلی دکنی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بھی حصہ دکن کی قسمت میں تھا کہ ایک دکنی شاعر کی یاد قائم رکھنے جلسہ مقرر کیا۔ قدر دانی بڑی چیز ہے۔ زندگی میں تو خاطر و محبت سے لوگ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں مرنے کے بعد وہ بھی دو سو سال کے بعد جلسہ کرنا شاعر غریب کی روح کو خوش کرنا ہے۔ ؎

یوں تو منہ دیکھے کی رہتی ہے محبت سب کی ۔ جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے

(۱۷)

پیامِ عقیدت بتقریبِ جشنِ یومِ ولی

منجانب

اہالیانِ طلبائُ اساتذہ وکلیہ عثمانیہ اورنگ آباد

خدا کا شکر ہے کہ ارباب ملک کی توجہ متقدمین کے کارناموں کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ یہ بھی ہمارے آقائے ولی نعمت خسرو دکن کی مسیحائی کا ایک کرشمہ ہے کہ آئے دن قدیم باکمالوں کے شاہ کار روشنی میں آرہے ہیں۔ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہٗ العالی کی علم نوازی اور شاہانہ کلام کی بلاغت اور فصاحت نے ادب کا جو اعلیٰ ذوق حیدرآباد میں پیدا کردیا ہے وہ الناس علیٰ دین ملوکھم کا مصداق ہے۔ زبان اردو کے لیے یہ فال نیک ہے کہ اس کے محسنوں کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ اورنگ آباد کالج نے یوم حالی مناکر سعدی ہند کے ادبی علمی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا۔ اہل دہلی نے یوم غالب منایا آج ارباب سٹی کالج اورنگ آباد کے نغز گو باکمال شاعر۔ اردو شاعری کے بادا آدم اور زبان اردو کے سب سے پہلے محسن حضرت ولی کا دوصد سالہ جشن یادگار منارہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی علمی تحریکات میں یہ چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ اس نے اپنے علوم اور اپنے باکمالوں کی قدر کا ذوق اہل ملک میں پیدا کردیا۔

حضرت ولی کا شگفتہ تغزل اور پرکیف اسلوب — ان کی پاکیزہ سیرت۔ درویشانہ زندگی اور وسیع اخلاق نے اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ زبان اردو ان کے خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ہماری سوسائٹی کو آج سب سے زیادہ ضرورت ان بزرگوں کی صاف دلی۔ سادگی اور روحانیت کی ہے۔ یہ بزرگ انسانیت کے پیغام بر تھے۔

ان کی پریم الاپون نے ملک میں ایسی خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی جس میں ہماری زبان، ادب اور ہند لمانی تمدن کا نشوونما ہوا۔ خدا کرے ان کا زندہ کلام پھر وہی ماحول پیدا کر دے۔ جس میں اتحاد اور اتفاق۔ محبت اور انسانیت کی گرم بازاری تھی۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز تھی یہ اپنے فن میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی ذات میں عجیب و غریب کشش تھی۔ اپنے کمال سے یہ عوام وخواص کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملّت کے افراد ان کی طرف بے اختیار کھنچے چلے جاتے تھے۔ ان کی پاکیزہ سیرت نے شاعری کو چار چاند لگائے اور ان کے ولولہ انگیز ترانوں نے دلوں کو محبت سے بھر دیا۔

اورنگ آباد قدیم زمانے سے جدّت و ذہانت کا گہوارہ رہا ہے اس کی خاک میں بڑے بڑے مدبر، شعرا، فضلا اور صوفیائے کرام محو خواب ہیں۔ انہیں بزرگوں کا فیض ہے کہ آج بھی اورنگ آباد کے ویرانے اہل ذوق کی زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اُردو کے ہر دور میں اورنگ آبادی مصنّفوں اور شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اہالیان اورنگ آباد ارباب سٹی کالج کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ان کے ایک باکمال شاعر کی یاد دوسو برس کے بعد تازہ کی۔ میں ان کی اور کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد کی جانب سے اس ادبی جشن پر جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب، جناب مولوی سید محمد صاحب اور دیگر شرکائے کار کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ جشن ہر طرح کامیاب رہے اور ان کی مساعی مشکور ہوں۔

سید محی الدین صدر اورنگ آباد کالج

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ

حضرات!

ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر وؔلی اورنگ آبادی کے دوصد سالہ جشن یادگار کی صدارت اور افتتاح نمائش کیلئے آپ نے میرا انتخاب جو فرمایا اس کیلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جب مولوی سید محمد اعظم صاحب نے جن سے میرے تعلقات قدیمانہ ہیں، اس تقریب کی سرپرستی قبول کرنے کی مجھ سے استدعا کی تو میں کچھ عذر نہ کرسکا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وؔلی میرے بزرگوں کے وطن اورنگ آباد کا شاعر ہے۔ آپ حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ میرے خاندان کے افراد کو اورنگ آباد سے قدیمی تعلق رہا ہے۔ چنانچہ میرے [illegible] یہیں سے حیدرآباد آئے۔ اگرچہ اس کی موجودہ حالت کو دیکھکر کوئی شخص اس کی قدیم تاریخی عظمت اور رونق کا اندازہ نہیں کرسکتا لیکن یہ مقام شاہی دور ہی سے عالموں، شاعروں اور بڑے بڑے ارباب فکر و تدبّر کا مرکز و مرجع رہا ہے۔

یہ امر ہم سب کیلئے باعث مسرت ہے کہ شعر و سخن میں بھی ہمارے اورنگ آباد ہی کے ایک شاعر کی تمام ہندوستان میں قدر و منزلت کی گئی اور اسی کے وجود سے شمالی ہند خاص کر دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی لیے ہر قدیم تذکرہ نگار اس کو آدم ریختہ یعنے اردو شاعری کا باوا آدم کہتا ہے۔ اگرچہ ایسا کہنے میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وؔلی اورنگ آبادی اردو کا پہلا شاعر ہے کیونکہ آپ حضرات ابھی ابھی نمائش میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ وؔلی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر کے اردو شاعروں کی بھی کتابیں موجود ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شمالی ہندوستان میں فارسی شاعری کا اثر کم کرکے اردو کو رواج دینے والا وؔلی ہی تھا اور اس لحاظ سے وہ آدم ریختہ کہلائے جانے کے یقیناً مستحق ہے۔

عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر

" بلاک ساختہ عظیم ہاف ٹون ورکس "

ایسی ہستیاں قابل فخر ہیں جو اپنے وطن کا نام روشن کرتی ہیں ۔ ولی نے اپنے شعر وسخن کے کمال سے دکن کو تمام ہندوستان میں مشہور کردیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سرمایہ چھوڑا جس پر اہل ملک بجا طور پہ ناز کر سکتے ہیں ۔ ہم سب پر بھی فرض ہے کہ اسی طرح اپنے وطن کی خدمت میں اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیں اور ہم سے پہلے جن افراد نے اس کی خدمتگزاری میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں اُن کی قدر کریں ۔

میں اس جلسہ کے بانیوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اُنھوں نے ایک اچھے کام کا آغاز کیا ہے ۔ اس طرح کی تقریبوں سے علمی وعملی دلچسپیوں، ترقی اور کام کرنے کے وسایل میں اضافہ ہوتا ہے جس کی فی زمانہ ضرورت بھی ہے ۔

لیکن اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہوجانا چاہیے ۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ اس دو صد سالہ جشن ولی کی یادگار میں کوئی مستقل کام آغاز کیا جائے ۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی اچھا کام نہیں ہوسکتا کہ ولی کے معاصرین اور اُن سے پہلے کے شاعروں اور صاحبانِ تصانیف کی اُردو کتابیں مرتب وشایع کی جائیں ۔ ولی سے پہلے بھی ہمارے ملک میں بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوچکے ہیں ۔ خود طبقہ فرمان روایان میں محمد قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ بلند پایہ شاعر تھے ۔ پھر اُن کے دربار کے ملک الشعراء وجہی، غواصی، نصرتی، رستمی، وغیرہ ولی سے کم نہ تھے اور چونکہ ولی سے بہت پہلے گزرے ہیں اس لیے ان کے کلام اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہیں ۔ بہرحال اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک جماعت منتخب کرلینی چاہیے ۔

مسرت کا مقام ہے کہ خود ہمارے ملک میں اب ایسے اصحاب موجود ہیں کہ ان قدیم کتابوں کے کلام اور زبان کو سمجھ کر اُن کو جدید ترین طریقوں پر مرتب کر کے شایع کر سکتے ہیں ۔ میں بھی اس مبارک اور اہم کام میں اس جماعت کا ہاتھ بٹانے تیار ہوں ۔

مجھے اس جلسے کے بانی مولوی سید محمد اعظم صاحب کی مستعدی اور توجہ سے یقین ہے کہ اپنی صدارت میں جلد اس کام کو شروع کرادینگے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے زمانۂ گزشتہ کے سلاطین دکن مثلاً محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ وغیرہ شعرا کے کلام کی اشاعت سے اس کام کا آغاز کرنا چاہیے ۔ ان کی ترتیب واشاعت کے بعد دوسری اہم اُردو کتابیں مثلاً ابراہیم نامہ، علی نامہ، قطب مشتری، پھول بن، خاور نامہ اور گلشنِ عشق وغیرہ بھی چھپوائی جاسکتی ہیں ۔ ان سب کتابوں کی اشاعت سے اُردو زبان کے ذخیرہ میں بڑا اضافہ ہوگا اور اُردو بولنے والوں کی معلومات وسیع ہوجائینگی ۔

لیکن ہم کو محض قدیم ادبی سرمایہ کی اشاعت ہی تک اپنے کام کو محدود نہ رکھنا چاہیے ۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو جدید طرز کی ضرورتوں اور ملک کے نئے نئے رجحانات و ضروریات کے مطابق بھی تصنیف و تالیف میں حصّہ لینا چاہیے ۔ کیونکہ زمانہ ہمیشہ ایک طرح پر نہیں رہتا ۔ دنیا بہت کچھ بدل چکی ہے ۔ اِن تغیرات کے ساتھ ساتھ ہم کو بھی جدید حالات ، رجحانات اور ماحول سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اب اچھے ادیب اور علمی کام کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور وہ جدید حالات و خیالات کے مطابق تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں ۔ یہ نہایت خوش آیند امر ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اِس ملک میں محمد قلی ، وجہی ، نصرتی وغیرہ نے علم و ادب کی جو شمع روشن کی تھی اور جس کی روشنی ولی اورنگ آبادی نے دُور دُور تک پھیلا دی تھی وہ اب بھی روشن ہے اور مجھے توقع ہے کہ ملک کے ہونہار نوجوان اِس کی روشنی میں اضافہ کرنے اور اپنے بزرگوں کے سرمایہ سے مستفید ہونے میں ہر طرح پیش پیش اور کامیاب رہینگے ۔

خطبۂ صدارت

از

نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (آکسن) صدرالمہام تعلیمات و معین امور عامہ

حضرات!

آج ہم اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا دو صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ ہزار یہ کہا جائے کہ وؔلی گجراتی تھے لیکن اس کا جواب یہی ہے، جیسا کہ بعض لوگ اپنی کتابوں پر لکھا کرتے ہیں "اگر کسے دعویٰ کند باطل است" وہ پیدائشی ملکی تھے! ایسے ملکی جن کو کوئی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہ ہو۔ یہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں۔ جو بڑا شاعر ہوتا ہے وہ تمام ملک کی مشترکہ ملک ہوتا ہے اور بڑے شاعر کی خوبیاں سارے عالم میں پھیل جاتی ہیں۔ کسی کے اعلیٰ شاعر ہونے کا معیار یہی ہے کہ اس کا کلام زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ وؔلی کے کلام کا زبان زد عام و خاص ہونا یورپ میں انکے کلام کے متعدد نسخوں کی موجودگی سے صاف ظاہر ہے۔ یورپ میں کلام وؔلی کے بہت سے نسخے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وؔلی دوسری قوموں میں بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

حضرات! حیدرآباد نے زبان اُردو کی جو حقیقی خدمت کی اس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی اور خطہ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بعض اور صوبوں نے بھی اس کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا اور اب بھی اس کی مزید ترقی میں کوشاں ہیں لیکن یہ کوشش پوری زبان پر حاوی نہیں۔ مثلاً صوبہ پنجاب اُردو صحافت کی جو خدمت کر رہا ہے اس کا ہم کو بجا طور اعتراف ہے لیکن حیدرآباد اُردو کی جو خدمت ہمیشہ سے کرتا آرہا ہے وہ ہر جہتی ہے۔ اُردو زبان سلطنت حیدرآباد کی تعلیمی، عدالتی اور سرکاری زبان ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے ساتھ ہی دارالترجمہ کی موجودگی سے جو کام اُردو کی ترقی کے لیے ہو رہا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ آج سے پچیس تیس سال قبل اُردو زبان میں اعلیٰ علمی کتابیں بہت ہی کم دستیاب ہوتی تھیں لیکن اب دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی علمی خدمات کی بدولت ایسی کتابیں روز بہ روز

عام ہو رہی ہیں ۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ حیدر آباد اُردو کی خدمت کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی تاریخ کو دہرا رہا ہے آج سے دو تین سو سال پہلے ہی سے حیدر آباد نے اُردو کی خدمت شروع کی تھی اور آج تک بھی وہ اپنے اس قدیم فریضہ کو ادا کر رہا ہے ۔ اُردو کی نشو و نما زیادہ تر دکن ہی میں ہوئی ۔ دکن ہی میں اُردو نظم اور نثر نے جنم لیا ۔ دکن ہی وہ سرزمین ہے جس میں سلطنت گولکنڈہ کی شاہانہ سرپرستیوں کے وجہ سے غواصی جیسے ناظم اور وجہی جیسے نثار پیدا ہوئے جس زمانہ میں شمالی ہند میں عموماً فارسی بولی جاتی تھی اس سے پیشتر یہاں اُردو بولی جانے لگی ۔ اُردو شاعری کا ابھی شمالی ہند میں کوئی ذکر بھی نہ تھا کہ یہاں نظم میں اعلیٰ اعلیٰ کتابیں لکھی گئیں ۔ اُردو نثر کے عام رواج کو تو تھوڑا عرصہ ہوا لیکن دکن میں عرصہ دراز پیشتر ہی سے نثر میں بلند پایہ تصانیف عام ہو گئی تھیں ۔

اُردو کا رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ کیونکہ ابتداً میں مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور ان کی مقدس کتابیں بھی اسی میں ہیں لیکن محض رسم الخط کی عربی رسم الخط سے مشابہت پر اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا صحیح نہیں ۔ اُردو ہندوستانی زبان ہے ۔ اس میں اکثر و بیشتر الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں ۔ اس کا صحیح نام "ہندوستانی" ہے اور ہونا چاہیے ۔ "ہندوستانی" تمام ہندوستان کی بولی ہے ۔ اس میں فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی کا اس قدر گہرا میل ہے کہ اب ان کو الگ الگ کرنا محال ہے ۔ اس کی مثال گنگا اور جمنا کی سی ہے ۔ بلا شبہ ان کا پانی سنگم کے قریب تک الگ الگ نظر آتا ہے لیکن آگے جا کر وہ ایک ہی دکھائی دیگا ۔ زبان الفاظ کے ادخال و اخراج سے نہیں بنتی بلکہ استعمال سے بنتی ہے ۔

حضرات! جس طرح تلسی داس ہندوستان کا بڑا شاعر تھا اسی طرح ولی بھی پورے ہندوستان کا شاعر ہے اس کا کلام سارے ہندوستان کی میراث ہے ۔ ولی کا مرتبہ اُردو میں وہی ہے جو انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے تحقیقی و تاریخی نقطۂ نظر سے ولی کا کلام نہایت دلچسپ ہے ۔ اس نے ایسے زمانے میں شعر کہے جب کہ زبان خود ایک انقلابی دور سے گزر رہی تھی ۔ نئی نئی ترکیبیں، نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہو رہے تھے، قدیم الفاظ ترک کئے جا رہے تھے اور فارسی شاعری کے رنگ سے ہٹ کر اُردو شاعری کا ایک نیا رنگ جم رہا تھا ۔ ولی کی شاعری جذبات سے بھری ہوئی ہے، وہ فطرت کا ترجمان تھا ۔ یقیناً اس کا درجہ اُردو شاعری میں نہایت بلند ہے ۔

اساتذہ کی یادگار منانے کی رسم بہت اچھی ہے ۔ شاعری ایک خداداد ملکہ ہے اس لیے ہر شخص شاعر نہیں ہو سکتا ۔ شعر جذبات انسانی کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ ان تقریبوں سے ملک میں اس کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے ۔ جو لوگ قدرتی شاعر نہیں بلکہ مشاقی سے شاعر بن بیٹھتے ہیں ان سے ادبیات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ گل و بلبل کے

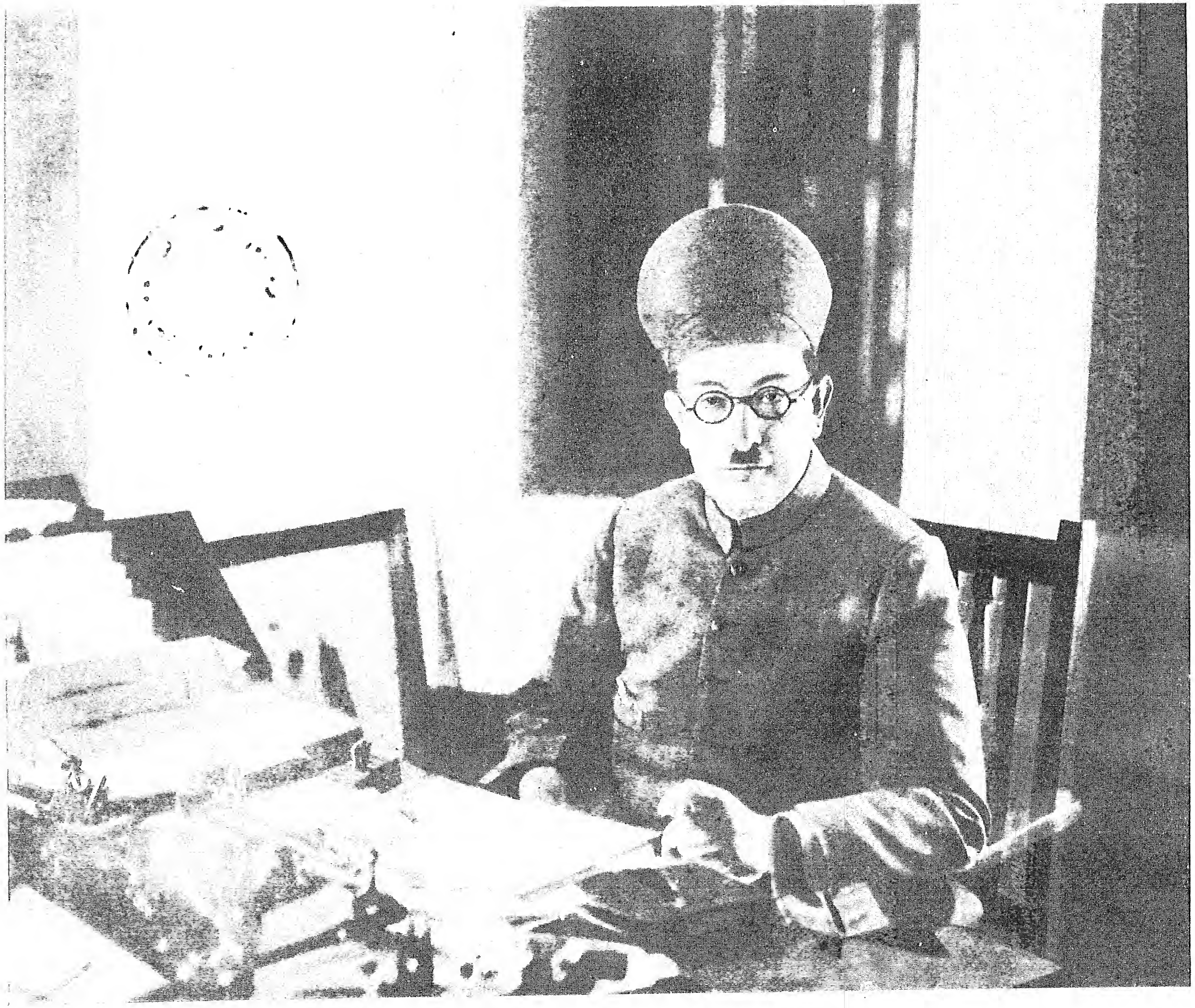

نواب مہدی یار جنگ بہادر ام۔ اے (آکسن)
صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ

افسانے اور معشوق کی کمرکی چھان بین سے زبان اردو کو کوئی فائدہ نہیں۔ اچھے لٹریچر کی یہی پہچان ہے کہ اس کو لوگ ذوق وشوق سے پڑھیں۔ جیسے عمرخیام کی رباعیات، حافظ کی غزلیں اور فردوسی کا کلام کہ یورپ اور امریکہ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوکر پڑھا جاتا ہے۔

حضرات! ضرورت ہے کہ ہمارے مشاعروں میں اصلاح کی جائے۔ قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئے راستے بنائے جائیں۔ پرانے راستوں سے ہٹ کر نئے نئے میدانوں میں قدم رکھنا اور ذوق سلیم پیدا کرنا ضروری ہے۔

ہم آج ولی کا یادگاری جشن منا کر تاریخ ادب میں ایک اہم باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ امید کہ اس کی یادگار میں ہم اپنے ذوق کی ایسی اصلاح کریں جس سے زبان مالا مال ہو اور اخلاق کو فائدہ پہنچے۔ اس جشن کے سلسلے میں قدیم کتابوں کی جو نمائش کی گئی ہے مجھے اس کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ ولی کی یادگار میں اس قسم کی ایک مستقل نمائش قائم کی جائیگی جس سے زبان کو ترقی دینے کی ترغیب وتحریص پیدا ہوتی رہیگی۔

اُستاد الاساتذہ حضرت ولیؔ

از

حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین صاحب امجدؔ

عزت نہ ملی کبھی مصاحب ہو کر
بے قدر ہوا ہے قلب قالب ہو کر
معبود ہیں اور عبد بن کے سب آتے ہیں
جیتے ہیں سبھی آپ ہی سے غالب ہو کر

اک پودا جب باغ تو شگفتہ ہوگا
پھر بیج جب اُگا تو ہرا ہوگا
جب شاہ سلطان بھی ولی اللہ تھا
بیٹا جو ولی ہو تو وہ کیا کیا ہوگا

تذکرۂ ولیؔ

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکرِ رسا حدِّ بشر سے

یہ عجیب بات ہے کہ جو ہستیاں آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکتی ہیں، ان کے حالات و واقعاتِ زندگی کے متعلق مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں سخت اختلاف رائے نظر آتا ہے اور بعض وقت ان اختلافات کی کثرت کی وجہ سے اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے ابو الآبا حضرت ولی اورنگ آبادی کا بھی یہی حال ہے ان کی غیر معمولی شہرت اور ان کے کلام کی عالمگیر مقبولیت کے ساتھ ان کے حالات کے متعلق ہمارے تذکرہ نویس بہت ہی مختلف الرائے ہیں ان کے نام، وطن، تعلیم و تربیت، سیر و سیاحت غرض ہر چیز کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔

ان اختلاف بیانیوں کے کئی سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ اُردو کے تمام تذکرے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کی تالیفیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ان تذکرہ نگار حضرات کے نزدیک حالاتِ زندگی کی تحقیق و صحت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بہت

سے تذکرے تو اصل میں بیاضیں معلوم ہوتے ہیں، جن میں مختلف شعرا کے پسندیدہ اشعار نقل کر لیے گئے اور ان اشعار سے پہلے شاعر کا نام اور چند سنی سنائی باتیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ خصوصاً ایسے شاعروں کے متعلق جن کا زمانہ مولف کے زمانے سے بہت پہلے کا ہے، دریافت اور تحقیق سے بہت ہی کم کام لیا گیا۔ اکثر اگلے مصنفوں سے خوشہ چینی کر کے صرف لفظی ہیر پھیر کے ساتھ وہی باتیں بیان کر دیں یا ان سے انحراف کر کے کوئی زبانی روایت نقل کر دی اور اسی کو اپنی تحقیق قرار دیا۔ ولی اورنگ آبادی کے حالات کی نسبت اختلاف بیانیوں کا راز انہی وجوہ میں پوشیدہ ہے۔ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں انہیں اورنگ آبادی بتایا، گردیزی نے اسی کو بہ تغیر الفاظ یوں تعبیر کیا کہ "در دکن چہرۂ ہستی بر افروختہ"۔ قایم چاند پوری نے اپنے مخزن نکات میں ان دونوں کے بیان کے برخلاف فراق گجرات والے قطعہ اور حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی کی مدح اور شہر سورت کی تعریف میں مثنوی دیکھ کر اُن کو گجراتی قرار دیا۔ بعد کے تمام تذکرہ نگاروں کے یہی تین ماخذ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مولف گلزار ابراہیم، مرزا علی لطف مولف گلشن ہند، فایق مولف مخزن شعرا اور میر حسن نے قایم چاند پوری کے اتباع میں انہیں گجراتی قرار دیا۔ لچھمی نارائن شفیق مولف چمنستان شعرا، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مولف مجموعہ نغز، عبدالجبار خاں ملکاپوری شدّ و مد سے ان کے اورنگ آبادی اور دکنی ہونے کے موئید ہیں۔

اسی طرح ولی کے نام کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں سخت اختلاف رائے ہے۔ فتح علی گردیزی، لچھمی نارائن شفیق، قدرت اللہ خاں قاسم نے ان کا نام محمد ولی بتایا ہے۔ خواجہ خاں مولف گلشن گفتار نے ولی محمد لکھا ہے۔ قایم چاند پوری، میر حسن، علی ابراہیم خاں خلیل اور اُن کے اتباع میں مرزا علی لطف اور نسّاخ نے شاہ ولی اللہ تحریر کیا ہے۔ آب حیات میں شمس ولی اللہ بتایا گیا ہے۔ ان ناموں میں سے اوّل الذکر ہی صحیح ہے۔ کیونکہ اس کے راوی نسبتاً قدیم ہیں اور صاحب تذکرہ سے قربتِ زمانی بھی رکھتے ہیں۔ چونکہ ولی کو حضرت شاہ نورالدین صاحب صدیقی سہروردی سے بیعت تھی۔ وہ صوفی منش

اور فقیر دوست بھی تھے نیز اُن کے کلام سے جو متصوفانہ رنگ ظاہر ہوتا ہے ۔ اُس کی بناء پر متوسط عہد کے تذکرہ نگاروں نے اُن کا نام شاہ ولی اللہ سمجھ لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن کا لقب ہو شمس ولی اللہ کی توثیق کسی اور تذکرہ سے نہیں ہوتی اور یہ غالباً محمد حسین آزاد کی قیاس ارائی ہے ۔

ولی کی ولادت تقریباً ۱۰۷۹ھ میں ہوئی ۔ اُن کے خاندان، تعلیم و تربیت کا حال بالکل پردہ تاریکی میں ہے ۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ بیس برس کی عمر حصولِ علم کے شوق میں گجرات کا سفر کیا اور احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی ۔ وہیں حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردی سے بیعت ہوئے ۔ احمد آباد کے ایک بزرگ زادے سید ابوالمعالی سے ان کی دوستی ہوگئی جو غیر معمولی محبت و شیفتگی کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی ۔ ابوالمعالی کے ساتھ ہی ولی نے جلوس عالمگیر کے چوالیسویں سال یعنی ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا سفر کیا یہاں حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے جو دہلی کے بہت بڑے بزرگ اور شاعر بھی تھے ملے میر صاحب اور قایم چاندپوری کا بیان ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ریختہ گوئی کی ترغیب دلائی ۔ میر حسن، علی ابراہیم اور قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے کہ اُن سے استفادہ کیا ۔ فائق نے بھی رسالہ نورالمعرفت کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے شاگرد تھے ۔

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ "روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ درسن دوئیم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعار بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ" بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کا یہ مطلب لیا کہ ولی نے دوبارہ محمد شاہ کے عہد میں بھی دلّی کا سفر کیا تھا ۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین　　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن جیسا کہ گلشن گفتار اور چمنستان شعرا سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ مضمون کا ہی

لہ مخزن نکات ۔

شاعر کا ہے۔

گلشنِ گفتار سے ولی کا برہان پور جانا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ گجرات کے بہت سے شہروں میں ولی کا ضرور قیام رہا ہوگا۔ خصوصاً سورت میں اُن کا قیام، تذکرہ چمنستان شعرا اور اس مثنوی سے بھی ظاہر ہے جو اس شہر کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ شفیق یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ولی حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

ولی کا سن وفات عام طور پر ۱۱۵۵ھ مشہور ہے۔ مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے مثنوی روضۃ الشہدا کے زمانۂ تالیف وغیرہ کا لحاظ کر کے قیاساً یہ سن اپنے تذکرۂ محبوب الزمن میں درج کیا ہے۔ لیکن کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے ایک قلمی نسخہ میں جو ۱۱۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے یہ قطعۂ تاریخ مندرج ہے :-

مطلع دیوانِ عشق سید اربابِ ل ، والیِ ملکِ سخن، صاحب عرفاں ولی
سالِ وفاتش خود از سرِ الہام گفت بادِ پناہِ ولی ساقیِ کوثر علی

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے اس قطعہ کی بناء پر ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ قرار دیا ہے۔ ولی نے احمد آباد میں انتقال کیا اور وہیں نیلی گنبد کے قریب مزار موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ کے درمیان مدفون ہیں۔

یوں تو ولی کے بہت سے شاگرد ہونگے۔ اُن کے کلام میں بھی بعض لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ صرف گلشنِ گفتار میں ان کے دو شاگردوں اشرف اور رضی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں گجرات کے باشندے تھے اور نواحِ گجرات میں ان کی شاعری کی بہت شہرت تھی۔ اس تذکرہ سے اشرف کا صاحب دیوان ہونا بھی ظاہر ہے۔ نموتاً اِن دونوں کے جو اشعار دیے گئے ہیں وہ نہ صرف ایک ہی زمین ہیں بلکہ ایک دوسرے کے جواب میں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باہم حریف سخن بھی تھے۔

ولی کی تصانیف میں کلیات کے علاوہ جس میں ہر صنف سخن کا کلام موجود ہے۔ تصوف اور معرفت کا ایک رسالہ موسوم بہ نور المعرفت بھی مشہور ہے۔ اور بعض تذکرہ نویسوں

نے اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ اس وقت تک ناپید ہے۔ مثنوی روضۃ الشہدا کو جو ولی دیلوری کی تصنیف ہے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے اُن کے متعلق بہت سی تاریخی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں مگر اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ مثنوی روضۃ الشہدا اُن کی تصنیف نہیں۔

ولی کے کلام کی عالمگیر مقبولیت اور فن ریختہ گوئی میں اُن کی استادی کا اعتراف قدما میں سے بہت سے اساتذہ نے کیا ہے۔ حاتم کہتے ہیں

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
ولی ولی ہی ہے جہانِ سخن کے بیچ

آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن کرامت ہے

میر صاحب نے بھی ایک موقع پر اشارتاً ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔

ذیل میں چند مستند نقادِ سخن تذکرہ نویسوں کی رائے نقل کی جاتی ہے:۔

۱۔ "کمان پر زورِ سخن را بہ نیروے فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہ ہدف معنی رسیدہ۔ اشعار آبدارش زیب صفحۂ لیل و نہار است و گوشوارہ سخن سرایانِ روزگار"
(تذکرہ فتح علی گردیزی)

۲۔ "سخن این بابا چنان حسن قبول یافت کہ ہر بیتِ دیوانش روشن تر از مطلعِ آفتاب گردیدہ و ریختہ را چناں بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آن وقت زراہ ہوش شعر ریختہ موزوں می نمودند" (مخزن نکات)

۳۔ "اگرچہ در زمانۂ ماضیہ موزونان این جا شعر را بزبان ریختہ گفتہ اند امّا صاحب دیوانے باین متانت و فصاحت از کتم عدم سر نہ کشید و شعرائے سلف چند طوطی شکر

مقال بوستان سخن دانی اند۔ لیکن چنین بلبل ہزار داستان بہ گوش نہ رسید۔ آرے والی ولایتِ نازک خیالی وشہنشاہ قلمروے خوش مقالی است" (چمنستان شعرا)

۴۔ "ازمشاہیر ریختہ گویاں او اوّل کسے است کہ دیوانش در دکھن مشہور و مدون گشتہ" (گلزار ابراہیم)

۵۔ "تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنا ریختہ را چنان مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزود" (تذکرہ میرحسن)

۶۔ "کلام حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت است وسخن بر سخنش ابلیس منشی وشیطنت۔ میرخان کمترین کہ خدائش بیامرزد بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ:۔

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

قطع نظر از زبان دکھنی شعر شس بمرتبہ اعلی شاعری وسخنش بدرجۂ علیائے سخنوری است"

(مجموعہ نغز قدرت اللہ خاں قاسم)

۷۔ "اول کسے کہ آئینہ سخن ہندی را بہ صیقل گری نظم جلا بخشید و ریختہ را بہ گرمی بلاغت نشانید، ہمین است۔ درین باب سرگروہ و مقدمۃ الجیش جمیع شاعران ہندو گجرات است" (مخزن شعرا فائق)

۸۔ غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے۔ جو غزل گوئی کے تقاضے تھے اُن سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی۔ چنانچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو

پیش نظر رکھتے ہیں ۔ اس لیے اُن کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے ۔ ولی کے کلام میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ مصحفیؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، آتشؔ سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولیؔ کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے ۔ جو ہر نوع کے کلام پر قدرتِ تامہ رکھتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں"

(کاشف الحقائق امداد امام اثر)

۹۔ "شاعر بلند مقام تھا ۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو سرزمین دکن میں رواج اس نے دیا ہے ۔ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز ہے اور اپنے معاصروں میں سر بلند و سرفراز"

(گلشن ہند مرزا علی لطف)

۱۰۔ " اگرچہ بہ زبانے کہ او دارد و در زبانے کہ دریں زمان رائج فرق خورشید و ماہ و شب و روز است گویا می توان گفت کہ این ہر دو یک زبان نیست اما بہ ہمہ حال حق اُستادی وے بر جمیع اہلِ نظم ریختہ ثابت باشد و عدول بعید ۔ (گلشن بے خار شیفتہ)

۱۱۔ "ان کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں ۔ عبارت آسان اور سہل ہے ۔ شعرائے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور ان کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی ۔ سادگی، سلاست اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں ۔ اشعار میں روانی ہے تکلفی اور

آمد ہے اور ضایع بدایع بکثرت نہیں ہیں ۔ بعض شعر تو ایسے
صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں"
(تاریخ ادب اردو سکسینہ)

ولی اورنگ آبادی

از

مولوی سید سکندر علی صاحب وجد بی اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس پروبیشنر

اُلٹ دی گردشِ ایام نے بزمِ قطب شاہی
بجھا دی قصرِ عادل شاہ کی شمعِ سحرگاہی

محبت سوگ میں تھی، حسنِ فطرت بے سہارا تھا
نظر گھائل ہوئی جاتی تھی وہ قاتل نظارہ تھا

گریباں چاک تھے گل، گرد آتشناک اُڑتی تھی
صبا مجروح تھی، سارے چمن میں خاک اُڑتی تھی

صدائے بربطِ دل کون سنتا زارنالی میں
کمالِ فن نگوں سر تھا عروجِ بے کمالی میں

فنا کی گود میں سستا رہا تھا نغمۂ وجہی
ڈبو دی چرخ نے بحرِ عدم میں فکرِ غواصی

صدائے نُصرتی کی گونج بھی گم ہو گئی آخر
جگایا نیند کے ماتوں کو اور خود سو گئی آخر

گلوں سے حالِ بُلبل پوچھنے والا نہ تھا کوئی
محبت کی پہیلی بوجھنے والا نہ تھا کوئی

نہ تھا کوئی صبا سے حالِ دلبر پوچھنے والا
ہوا میں زلفِ مشکیں کا تعطر ڈھونڈنے والا

کوئی موتی لٹاتا تھا نہ اپنی چشمِ پرنم سے
کوئی لیتا نہ تھا افتادگی کا درس شبنم سے

ترے دم سے ولی باغِ سخن میں بہار آئی
خزاں منظر چمن میں گل کھلے بانگِ ہزار آئی

تری آواز پر ہر اہلِ محفل سر کو دھنتا تھا
دکن کا ذکر کیا، ہندوستاں خاموش سنتا تھا

ترے شعروں میں گو نکہت بسی ہے موجۂ گل کی
کسک ہے ان میں پوشیدہ دلِ صد چاکِ بلبل کی

سنایا اپنی لے میں جب وفا کا تو نے افسانہ
بھگوئی شمع نے اشکوں سے شب بھر خاکِ پروانہ

ترے نغمے نے پھر سے بزمِ اہلِ شوق گرما دی
تری میٹھی زباں نے عشق کی تقدیر چمکا دی

گرایا جس نے نظروں سے جمالِ ترکِ[1] "شیرازی"
"دکن کی سانولی[2]" سے سب نے دل کی ہار دی بازی

---

[1] فارسی۔ [2] اردو۔

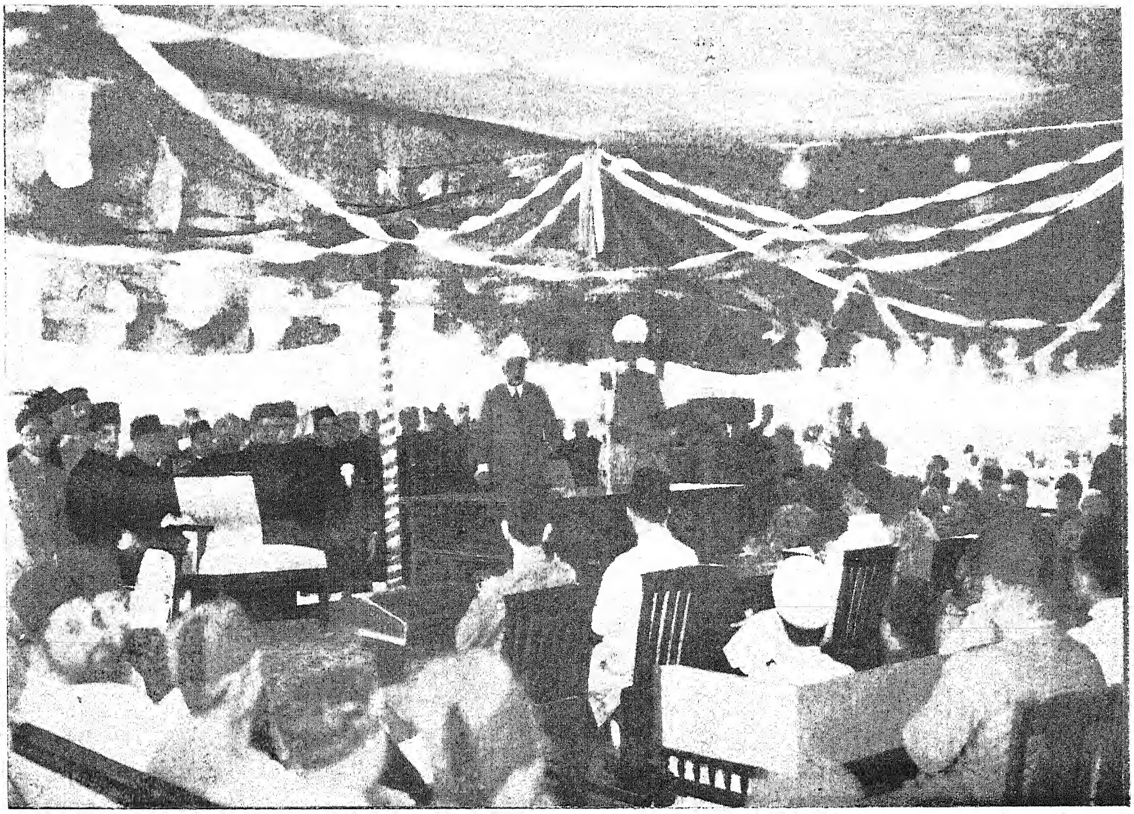

جلسه اول یوم ولی

"بلاکس ساختہ تظیم هاف تون و رکس"

ولی کا وطن

(از)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم۔اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی لندن پروفیسر جامعہ عثمانیہ

خود ولیؔ نے کیا خوب لکھا ہے ؎

ہرگز ولیؔ کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو　　　جو نیہ کے کوچہ میں ہے اسکوں وطن سوں کیا غرض

ممکن ہے ولی کو اپنے وطن سے کوئی غرض باقی نہ رہی ہو مگر آج ہم ان کی طبیعت کے خلاف ان کے وطن کی باتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر خود ولیؔ اپنے وطن سے اتنی بے اعتنائی اور بے غرضی ظاہر نہ کرتے تو آج ہم کو ان کے وطن پر گفتگو کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑتی اور نہ اُردو کے اکثر تذکرہ نگاروں اور مورخوں کو ایک دُوسرے کے خلاف بیانات اور متضاد رائیں پیش کرنے کا موقع ملتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اکثر عظیم الشان اور مشہور و معروف ہستیوں کی نسبت آنے والی نسلوں کو بہت کم علم حاصل ہوتا ہے اور جو معلومات ہوتی ہیں وہ بھی ایسی گومگو کہ ان کے متعلق مورخین و محققین میں رفتہ رفتہ اختلاف آرا پیدا ہو جاتا ہے۔ استاذ الاساتذہ ولیؔ اورنگ آبادی کی ہستی اتنی مشہور و معروف اور اہم ہے کہ اُردو ادب کا کوئی تذکرہ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ تمام اُردو دنیا ان کو اُردو شاعری کا باوا آدم مانتی ہے اور ان کی یہاں تک تعظیم کی جاتی ہے کہ تقریباً سو سال قبل ہی شمالی ہند کے ایک شاعر بیرخاں کمترینؔ نے لکھدیا تھا کہ ع ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں۔

لیکن یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان کے نام ’وطن‘ اور تاریخ پیدائش و وفات کے متعلق ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے گذشتہ آٹھ دس سال کی ادبی تحقیقات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کا نام ولی محمدؐ تھا، اورنگ آباد میں پیدا

ہوئے تھے، عنفوان شباب میں تکمیل تعلیم کے لیے احمد آباد گئے تھے، ۱۱۱۲ھ میں شاہجہاں آباد کا سفر کیا اور ۱۱۱۹ھ میں احمد آباد گجرات میں انتقال کیا۔ لیکن حال ہی میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے (۱۹۳۲ء میں) گجرات کے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ مخزن شعرا شایع ہوا ہے جو اگرچہ ولی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کے مصنف نے جرات رندانہ سے کام لیکر ولی کو گجراتی قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت میں محض یہ لکھا ہے کہ :۔

محققان این فن را در حالِ او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است ویا از دکھن۔ اما براقم اثم از زبانِ ثقات بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چنان پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ، وسالہا بدکھن ہم گذرانید وخطا کرد میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود اورا از اورنگ آباد نوشت۔ (مخزن شعرا صفحہ ۱۱)

اس کتاب کو انجمن ترقی اردو کے مستعد معتمد اور اردو زبان کے بڑے خدمتگذار مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کرکے شایع کیا ہے اور اپنی طرف سے اس پر ایک دلچسپ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ لیکن اس مقدمہ میں اس بحث کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں ظاہر کی گئی اور یہ لکھکر اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑ دیا ہے :۔

”یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے“

(مخزن شعرا صفحہ ۵)

ان دونوں بیانات کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ولی کے وطن کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رائج ہوجائے، اس لیے آج کی صحبت میں اس مسئلہ کی یکسوئی کی خاطر مختلف براہین وشواہد کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جائیگا تاکہ ولی اصل میں اورنگ آباد کے رہنے والے تھے، آخر عمر میں احمد آباد میں قیام پذیر تھے اور وہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔

اس مضمون میں سب سے پہلے ولی کی طبیعت کے رجحان اور حالات زندگی کو پیش نظر رکھ کر یہ بتایا جائیگا کہ وہ کیوں اور کس طرح اورنگ آباد کو چھوڑ کر گجرات کے دلدادہ ہوگئے تھے۔ اور بعد میں عہد ولی کے شعرائے گجرات ودکن کے کلام نیز دیگر ذرایع سے ایسے قطعی شواہد پیش کیے جائیں گے جن سے واضح ہوگا کہ ولی دکنی شاعر تھے نہ کہ گجراتی، یہ اور بات ہے کہ وہ عرصہ تک گجرات میں رہے اور ان کا یہ قیام وہاں کی بجھتی ہوئی شمع شعروسخن کو پھر سے کچھ عرصہ کے لیے روشن کردینے کا باعث ہوا۔ اس کو ولی کی کرامت سمجھنی چاہیے کہ جہاں انہوں نے شمالی ہند کا سفر کرکے شاہجہاں آباد میں اردو شعروسخن کی بنا ڈالی گجرات میں بھی انہی کی وجہ سے اس گئے گذرے زمانہ میں اردو شاعری ایک آخری بار چمک اٹھی۔

(۲)

ولی کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ وسیع المشرب اور

آزادہ رو پیدا ہوئے تھے۔ وہ کسی طرح کی قید یا جکڑ بندی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سفید و سیاہ اور پست و بلند ان کی نظروں میں ایک تھے وہ خوش باش سے تھے۔ خوش باشی، آشنا پرستی، شوق سیر و سیاحت اور نیاز مندی و محبت ان کی فطرت ثانی بن گئی تھی۔ اسی افتادِ طبع نے ان کو عنفوان شباب ہی میں اورنگ آباد سے باہر نکلنے پر مجبور کیا اور جب وہ ایک دفعہ مرہٹوں کے اس ستمدیدہ شہر یعنے شہنشاہ اورنگ زیب کے تباہ حال پایہ تخت سے باہر نکلے تو گجرات کے حسن دلفریب، اور خاص کر احمد آباد اور سورت کی رنگا رنگیوں نے ایسا فریفتہ کیا کہ اورنگ آباد کے فوجی دیار سے برداشتہ خاطر ہو گئے۔ اور ختم تعلیم کے بعد جب وطن واپس ہوئے تو ایک عرصہ تک اس شہر کی ہولناک جنگجویانہ فضا میں سیماب پا رہنے کے بعد پھر باہر نکلے اور اس طرح نکلے کہ سیر و سیاحت میں تمام عمر گذار دی۔ لیکن محض اس آزادہ روی اور سیر و سیاحت کی بنا پر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ دکنی الاصل یا اورنگ آبادی نہیں تھے۔ ایک قدیم کہاوت ہے :۔

ہاتھی پھرے گاویں گاؤں　　　جس کا ہاتھی اس کا ناؤں

سرہند ہو کہ گجرات، شاہجہاں آباد ہو کہ سورت ہر جگہ اور ہر وقت وہ ولیؔ اورنگ آبادی ہی رہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ چونکہ وہ گجرات سے شمالی ہند کے سفر کے لیے نکلے تھے اور ایک گجراتی خوش طلعت دوست سید ابو المعالی اُن کے ساتھ تھے اس لیے بعض موقعوں پر اُن کے وطن کے متعلق لوگوں کو شبہہ ہوا ہو اور کہیں کہیں ان کی بود و باش کے نسبت پوچھا بھی گیا ہو جس کے جواب میں انھوں نے صاف صاف کہدیا :۔

جو نیہ کے کوچہ میں ہے اسکوں وطن سے کیا غرض

نیاز مندی و الفت کی راہ میں تمام جکڑ بندیاں اور جملہ علایق ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ امتیازِ ما و تو بھی باقی نہیں رہتا۔

یہی وجہ تھی کہ ولیؔ کسی ایک مقام اور ایک شخص سے دلبستگی نہیں پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اُن کو ہر سمت حقیقت و حسن کی تجلیاں نظر آتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں :۔

چاروں طرف کھلا ہے گلزار رنگ و رس کا　　　اس سیر جانفزا سوں سینہ کھلا ہوس کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا　　　بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

انہوں نے اپنے کلیات میں اپنے متعدد ہندو و مسلمان دوستوں اور محبوبوں کا ذکر کیا ہے اور اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ :۔

ہر ذرّہ عالم میں ہے خورشید حقیقی　　　یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان دوستوں کی خوش روئی اور خوش ادائی کی تعریف اور ان کے ساتھ تعلق خاطر اور محبت کا اظہار کرنے کی وجہ سے ولیؔ پر طعن و تعریض بھی کی گئی تھی لیکن اس کے جواب میں انہوں نے اپنی ایک غزل پیش کی ہے کہ :۔

یکایک مجھ دِلبا اک شہ؛ جوان اسوار تازی کا — کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطابِ عاشق نوازی کا
نزک میرے کرم کر کر فصاحت اور بلاغت سوں — کہیا وہ سرو قد مجھ کوں، سخن یوں سرفرازی کا
محبت یار بے پروا کی سینہ میں ہے رات اور دن — یہی مطلب ہے رات اور دن نمازی اور نیازی کا
مجھے بولیا کہ "گر عشقِ حقیقی سیں تو واقف نیں — تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

سنیا ہے جب سوں یہ نکتہ ولی تیرے بچن سیتے
لگا ہے تب سوں شیوہ جیو کوں میرے عشق بازی کا

ولی کا ایقان تھا کہ بغیر تذکرۂ محبت کے شعر وسخن اینٹ اور پتھر کے برابر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اشعار میں جو کچھ خوبی پیدا ہوتی ہے وہ محض ایک کی نیازمندیوں اور دوسرے کی شان استغنا خوش طلعتی و ناز و ادا کی آئینہ داری کا نتیجہ ہے۔ ان کے شعر ہیں :-

ہرگز نہیں ہے خشت سوں فرق اسکوں اے ولی — خوش طلعتاں کی بات نہیں جس کتاب میں
قوس قزح کا مصرعِ ثانی ہوا ولی — تعریف اس بھنواں کی لکھی جس سطر منیں
کرتا ہے ولی سحر سدا شعر کے فن میں — تجھ نین سوں سیکھا ہے مگر جادوگری کوں
اُس انکھیاں پر زلف کا دیکھا ہے ازبس جو طلسم — شعر تیرا اے ولی یوں سحر بنگالہ اہے
اُس لب کی حلاوت ہے ولی طبع میں میری — تو شعر مرا جگ منے میٹھا ہے شکر سوں

رنگیلے شعر کا کہنا کیا تھا ترک مدت سے
ترا یوں قد ہوا ہے مجھکوں باعث فکر عالی کا

ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کردیتے ہیں کہ میرے شعر محض کسی کے خط و خال یا حسن ظاہری کی تعریف میں نہیں بلکہ میرے نیازمند اور درد آشنا دل کے حقیقی ترجمان ہیں :-

ولی شعر میرا سراپا ہے درد — خط و خال کی بات ہے خال خال

اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہدیتے ہیں کہ میری محبت پاک اور حقیقی ہے نہ کہ مصنوعی اور ہوس پرستانہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرے کلام میں ایک خاص درد و حلاوت اور لوچ نمایاں رہتا ہے :-

پاکبازوں میں ہے مشہور ولی
اس سے چہرہ کوں نہ چھپایا کرو

گدا ہیں جو محبت کی گلی کے　　جو دایم ہم سفر ہیں بجلی کے
نہیں عاشق وہ ہر گل کی گلی کے　　غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

اپنی اس پاکبازی اور بے لوث محبت کا اظہار ولی نے کئی طرح سے کیا ہے۔ بعض جگہ اپنے "جواں قد" محبوبوں کو بزرگوں کی طرح دعائیں بھی دی ہیں۔ ایک مخمس کے بند میں لکھتے ہیں:۔

یار میرا ہے سب سوں شیریں تر　　سارے خوش طلعتوں میں ہے گانر
نام رکھا ہوں جس کا میں اخرو ر　　مدد اوست مرتضیٰ حیدر
دلربایوں میں دلربا ہے گا

ایک اور شعر ہے:۔

اُس سیس پہ قایم اچھو سایہ محی الدین کا　　معشوق میرے کون مدد محبوب سبحانی ہوا

ولی کی پاک نظری اور صحیح نقطۂ نظر نے جن کو اپنا محبوب بنایا تھا ان میں سے اکثر سخن فہم اور سخنداں بھی تھے اور ان کی اس خصوصیت ہی نے ولی کو اچھے سے اچھے شعر کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے　　مجھے فکر سخن کرنا بجا ہے
سخنداں آشنا فضل خدا ہے　　نہ تنہا حسن خوباں دلربا ہے
ادا فہمی سخندانی بلا ہے

اورنگ آباد کے ایک مشہور اہل اللہ اور صاحب دل شاعر حضرت شاہ سراج بھی جو ولی کی جانشینی کا اس طرح دعویٰ کرتے ہیں ؎

تجھ مثل اے سراج بعد ولی　　کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے پسندیدہ شاعر اور منظور نظر رہ چکے تھے۔ اگرچہ اس بارے میں شبہ کی قطعی گنجایش ہے کہ آیا سراج کی عمر ولی کی زندگی میں اس قابل تھی کہ ان کی شادی میں ولی شریک ہو سکتے۔ بہر حال ولی کے شعر ہیں:۔

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں　　فانوسِ دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ سیں آ کے ملیا اس سبب ولی　　شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

ولی کے کلام میں ان کے اور کئی دوستوں اور محبوبوں کا تذکرہ ملتا ہے جو مختلف مذاہب سے متعلق تھے مگر ان سب میں

سید ابوالمعالی ہی کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ گجرات کے مشائخ زادے تھے اور بڑے سخن فہم و سخن سنج۔ انہی کے ساتھ ولی نے شاہجہاں آباد اور سرہند وغیرہ کا سفر کیا تھا اور انہی کی وجہ سے وہ آخر کار احمد آباد ہی میں رہ پڑے۔ ان سے ولی کو جس درجہ تعلق خاطر تھا ان کی ان متعدد غزلوں سے ظاہر ہو گا جو اس نیک نہاد نوجوان کی فرشتہ خوئی، اور اوصاف حمیدہ کی تعریف میں لکھی گئی ہیں۔

غرض گجرات میں قیام پذیر ہونے کے اسباب خود ولی نے اپنے اشعار میں بیان کر دیے ہیں۔ احمد آباد کی چہل پہل، وہاں کی دلچسپ صحبتیں، حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ اور مدرسہ کی پُرسکون و حیات پرور فضا، ان کے وطن اورنگ آباد کی مرہٹوں کے ہاتوں ویرانی اور وہاں کا خشک و ہولناک فوجی ماحول، گجرات کا حسن ملیح اور سب سے بڑھ کر سید ابوالمعالی کی رفاقت یہ سب چیزیں تھیں جنہوں نے ولی کو آخر کار وہیں رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے محبوب کی گلی کے مقابلہ میں کشمیر اور کابل کے حسن زاروں اور شمالی ہند کے بارونق شہروں کو ہیچ سمجھتے ہیں محبوب کا خیال انہیں دو جگ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ان کے شعر ہیں:—

ولی یوں دیکھ بولا تجھ گلی کوں — یہی ہے ہند اور کشمیر و کابل

دلدار کی گلی سوں کیوں جا سکوں ولی میں — لپٹا لپٹ ہے دل کوں جیب چیرہ زری سوں

اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

باغ ارم سے بہتر موہن تری گلی ہے — ساکن تری گلی کا ہر آن میں ولی ہے

دو جگ ہوئے ہیں دل سوں فراموش اے ولی — رکھتے ہیں جب سوں یاد سریجن کی من میں ہم

عالم کی دوستی سے ہے نفرت ولی کو نت — ہر آشنا کے دم سے گریزاں ہے جیوں چراغ

دوسرے ملکوں کی دلچسپیاں تو خیر کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ولی کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اپنے دوست کی قیام گاہ کے مقابلہ میں اہل دل اپنے پیارے وطن کو بھی بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ بغیر گل و گلشن کے بلبل کی زندگی ممکن نہیں اور جو راہ عاشقی کا سالک ہے اس کو وطن سے کیا کام! اس کی منزل وہی ہے جہاں محبوب ہوئے۔ ان اعتقادات کے تحت میں اگر ولی، اورنگ آباد کو چھوڑ کر احمد آباد ہی میں رہ پڑے تو کیا تعجب؟ وہ کہتے ہیں:—

کیا دل نے تیری گلی کا مقام — کہ بلبل کوں دائم ہے گلشن وطن

میں دل کوں دیا بند کہ اس سحر بچن کوں — عشاق جسے دیکھ بسارے ہیں وطن کوں

عشق کی راہ میں مسافر کوں — ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ساتھ ہی وہ یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میں گجرات میں کسی منصب اور جاگیر یا وظیفہ اور خلعت و تشریف کے لالچ سے قیام پذیر نہیں ہوں یہاں اگر مجھے کوئی وظیفہ ہے تو وہ صرف اپنے محبوب کا نام ہے ؎

نہیں منصب و جاگیر نہیں کوئی وظیفہ — ہر روز ترا ناؤں وظیفہ ہے ولی کوں
کیا ہوں بر میں ایس کے لباسِ عریانی — ولی برہنے دیا یو قبا مجھے تشریف

نیاز مندی اور آزادہ روی کی وجہ سے وہ ہر قسم کے تعلقات اور لالچ سے بے نیاز ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

اے ولی غیر عشق حرف دگر — پختہ مغزاں کے نزد ہے خالی
ولی کوں نہیں مال کی آرزو — خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف
نہ ہووے حل اس کا عقدۂ مشکل ولی ہرگز — تماشوں سوں کہ جن نے دل میں اپنے گرہ پکڑی
اے ولی ترک علایق دل کوں لذت بخش ہے — جیوں ہے دنیادار کوں فکر سر و سامان عزیز
چمن میں دہر کے ہرگز نہ مجھ ہوا معلوم — کہ کب ہے فصل ربیع اور کدھاں ہے فصل خریف
فنا کر کر جو کوئی سمجھا یہاں کی زندگانی کوں — اسے گزران کرنے کوں جنگل ہور گھر برابر ہے

یہی وہ افتادِ طبع تھی جو ولی کو اورنگ آباد میں گجرات کی یاد میں تڑپا رہی تھی۔ جب وہ عنفوانِ شباب میں تکمیلِ تعلیم کے لیے اورنگ آباد سے نکل کر احمد آباد پہنچے ہوں گے تو انہیں کیا خبر تھی کہ گجرات کا حسن رنگیں انہیں ہمیشہ کے لیے بے تاب اور مضطرب الحال کر دیگا۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ اور خانقاہ کی صحبتوں نے انکے درد آشنا دل میں ایک ایسی تڑپ پیدا کر دی تھی کہ جب وہ ختم تعلیم پر اورنگ آباد واپس ہوئے تو فراق گجرات میں ان کا دل "خار خار" ہو گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحوں کی اس یاد میں بعض ایسے ایسے شعر لکھے ہیں جو ان کو زندہ جاوید بنانے کا باعث ہوئے۔ اسی ہجر کی بے چینی اور دوستوں کی یاد نے انکے کلام میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا جو اشعار کو نشتر بنا دیا کرتا ہے جتنے دن بھی وہ اپنے وطن میں رہے سیماب پا رہے۔ روز بروز ان کے خیالات میں انتشار پیدا ہوتا گیا ؎

ولی میرا جنوں جو کوئی کہ دیکھے — اسے کوہ و بیاباں یاد آئے
یوں دوستاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پر ولی — صحرا کے دامن کے اپر جیوں نقشِ پائے رہرواں

اے ولی اس کی گلی دل یاد کرتا ہے مدام
کیوں کرے نیں یاد، ہے ایماں من حب الوطن

گویا انہوں نے تصفیہ کرلیا تھا کہ اب میرا وطن اورنگ آباد نہیں ہے۔ عاشق کا وطن اصل میں محبوب ہی کی گلی ہے اور اس گلی کی یاد عاشق کا ایمان۔

یہ ممکن ہے کہ آخر زمانہ میں ولی کے سامنے انکے وطن کا ذکر کیا جاتا ہو، یا اثنائے سفر میں لوگ ان کے وطن کے متعلق دریافت کرتے رہتے ہوں لیکن ان سب موقعوں پر اُن کے یہاں ایک ہی جواب تھا کہ :-

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو — جو نینہ کے کوچہ میں ہے اسکوں وطن سے کیا غرض

ان کے نزدیک عشق ومحبت سے بڑھکر کوئی چیز اہم نہیں، اور وہ مال اور دولت، عزت اور وطن، اعزہ اور اقارب غرض ہر چیز کو کھودینے تیار ہیں مگر عشق کو کھونا نہیں چاہتے۔ رازِ عشق سے آگاہی اُن کے یہاں سب سے بڑا علم ہے اور سب سے بڑی اور اصلی دوربینی ان کے خیال میں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ محبوب کے پاؤں کی خاک کو سرمۂ چشم نہ بنالیا جائے۔ وہ کہتے ہیں :-

ولی دل میں ہمارے حاسداں کا خوف نہیں ہرگز — بجز دزدی کسی رہزن کوں رہزن کر نہیں کہتے

گر نہیں سرِّ عشق سوں آگاہ — فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا

جو ہوا رازِ عشق سیں آگاہ — وہ زمانہ کا فخرِ رازی ہے

چاہو کہ ہو ولی کے نمط جگ میں دور بیں — انکھیاں میں سرمہ پیو کی خاکِ چرن کرو

اس انتہائی الفت پیشگی، آفاق دوستی، اور ترک علایق کے باوجود ولی اپنے کلام میں اپنے وطن کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے اور ممکن ہے کہ یہ بھی غیر ارادی طور پر ہو۔ اُن کے چند شعر جن میں انہوں اپنے کو دکنی کہا ہے یہ ہیں :-

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور — اگرچہ شاعرِ ملکِ دکھن ہے

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس — ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکھن بھیتر

دکھنی زبان میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی — لیکن نہیں بولیا ہے کوئی اک شعر خوشتر زیں نمط

دکن کے اس تذکرہ کے علاوہ ولی نے دکن کے بعض شاعروں کا بھی اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ اگر وہ گجراتی ہوتے تو یقیناً دکن کے شاعروں کے ساتھ ساتھ گجرات کے بھی قدیم اُردو شعرا مثلاً بہاؤالدین باجن، خوب محمدؒ، شاہ علی گاؤں دھنی، اور امین وغیرہ میں سے کسی کا ضرور ذکر کرتے حالانکہ انہوں نے اپنی غزلوں میں (اور خاص کر سید ابوالمعالی کی مدحیہ غزل میں) فارسی کے بھی اکثر شاعروں کے نام لیے ہیں۔ دکن کے شعرا میں ولی نے ملا خیالی حسن شوقی، فراقی، آزاد، رنگین اور اشرف وغیرہ کا ذکر کیا ہے :-

حسن شوقی دکن کا مشہور شاعر۔ تالیکوٹ کی لڑائی میں وہ نظام شاہ کی فوج میں تھا اور جب رام راج کو شکست ہوئی تو اس نے ظفر نامہ نظام شاہ اردو میں ایک مثنوی لکھی نظام شاہ کے بعد وہ محمد عادل شاہ والی بیجاپور کے یہاں چلا آیا اور اس بادشاہ کی تقریب عقد میں ایک طویل مثنوی میزبانی نامہ عادل شاہ مرتب کی۔ یہ دونوں تاریخی مثنویاں موجود ہیں۔ بعد میں شوقی حیدر آباد آیا تھا اور غالباً یہیں اس کا انتقال ہوا ولی کہتے ہیں۔

حسن شوقی:۔ برجا ہے اگر جگ میں ولی چھر کے دوجے بار | رکھ شوق مرے شعر سوں شوقی حسن آئے

حسن شوقی کا تذکرہ اس غزل میں بھی کیا ہے جس میں سید ابو المعانی کو متعدد شاعروں سے تشبیہ دی ہیں وہ کہتے ہیں [۱]

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل | تو ہر اک بیت عالی ہے و ہر مصرع خیالی ہے

فراقی:۔ ترے اشعار ایسے ہیں فراقی | کہ جن پر رشک آوے گا ولی کوں

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم | کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آئے

رنگیں:۔ ولی یوں مصرع رنگین ہوا ہے ورد جان و دل | فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

کہتا ہے ولی دل ستی یہ مصرع رنگین | ہے یاد تیری مجھکوں سبب راحت جاں کا

آزاد:۔ آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب | جس سے کہ یار ملتا ہے ایسا ہنر نہ آیا

اشرف:۔ اشرف کا یو مصرعہ ولی مجھکو ہے عجیب | الفت ہے دل و جاں سے مجھے سیم تگر سوں

ولی کو دکنی ثابت کرنے کے لیے صرف اتنی ہی بحث کافی ہے۔ مگر تذکرۂ شعرائے گجرات کے مصنف نے ولی کو گجراتی قرار دینے کے سلسلہ میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ عہد ولی میں گجرات اور دکن کو جدا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ یہ دونوں خطے شمالی ہندوستان کے جانب جنوب واقع ہیں اس لیے ممکن ہے اہل شمال دکن اور گجرات میں تمیز نہ کرتے ہوں اور سب کو دکنی ہی کہتے ہوں۔

یہ استدلال تاریخی اور جغرافی نظر سے صحیح نہیں۔ اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ اہل شمال گجراتیوں اور دکنیوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ سمجھتے ہوں مگر ان دونوں مقامات کے رہنے والے تو ہمیشہ خود کو ایک دوسرے سے جدا سمجھتے رہے۔ کوئی گجراتی شاعر اپنے کو دکنی شاعر نہیں کہتا تھا۔ اس وقت تک عہد ولی کے متعدد گجراتی شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہو چکا ہے

---

[۱] اس غزل کا مطلع ہے ؎

ثنا گو مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے | نین جامی، جبیں فردوسی، و ابرو ہلالی ہے

اور باوجود کوشش کے کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس میں کسی گجراتی شاعر نے اپنے کو دکھنی لکھا ہو۔ اس کے برخلاف جملہ گجراتی شعرا دکن اور دکھنی شاعروں سے خود کو علیحدہ سمجھکر خاص طور پر اُن کے وطن کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

ولی کا ایک گجراتی معاصر ہاشم علی بلند پایہ مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس نے مراثی کا ایک ضخیم کلیات " دیوان حسینی " مرتب کیا تھا جو اس وقت موجود ہے۔ اس دیوان میں ہاشم علی نے اپنے دکنی دوستوں اور معاصرین مثلاً روحی، مرزا اور قادر وغیرہ کا اس طرح ذکر کیا ہے :۔

ہزار حیف نہیں شاعرانِ دکن — سو روحی و مرزا و قادر نہیں
ہاشم علی عجب نہیں یوں مرثیہ کو سنکر — تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں

روحی اور مرزا کے کلام کی طرح خلیفہ قادر کا کلام بھی اس وقت موجود ہے۔ اور ان سب کے کلام کے نمونے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ ہاشم علی نے دکنی شاعروں کا ذکر عام طور پر بھی کیا ہے وہ ایک مرثیہ کے ختم پر کہتے ہیں :۔

ہاشم علی لکھا توں بیکس دلہن کی باتاں — اس غم سے ہے جگر خوں اور چشم اشک ریزاں
گجرات میں پڑے جب یو مرثیہ کو یاراں — سنکر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے

ایک اور شعر ہے ؎

ہاشم علی لے آئے محبّان نے یوں خبر — دکھن سے ہو کے تیرے سخن کربلا چلے

ہاشم علی کے علاوہ گجرات کے ایک اور بلند پایہ شاعر رضا کے کلام میں بھی دکھنی شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بھی بڑے مرثیہ گو تھے اور اُن کے متعدد مرثیے اس وقت محفوظ ہیں۔ یہ اپنے ایک مرثیہ کے آخر میں فخر کرتے ہیں :۔

اے رضا قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں مدام — تجھ کوں محشر میں شفیع ہو کر چھڑاویں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں خاص و عام — لے گئے دکھنی دکھن کوں، آج ہے قاسم کا بیاہ

جب عہد ولی میں دکن اور گجرات کے شاعر ایک دوسرے کو جدا جدا ملکوں کے رہنے والے سمجھتے تھے تو اُن کے ڈیڑھ سو سال بعد کے ایک تذکرہ نگار کا یہ خیال کہ اُس زمانہ میں کوئی امتیاز نہ ہو گا کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے ؟

(جہاں یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ولی خود کو دکھنی شاعر کہتے ہیں آخر میں ولی ہی کی زبان سے اس امر کی بھی شہادت پیش کر دی جاتی ہے کہ وہ گجرات کے رہنے والے نہ تھے بلکہ وہاں بطور سیر و سیاحت گئے تھے۔ وہ اپنے عہد شباب کے سفر گجرات کے بعد جب اورنگ آباد واپس ہوئے تھے تو یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ گجرات کی یاد رہ رہ کر ان کو تڑپا رہی تھی۔ اس عالم اضطراب میں انہوں نے ایک مثنوی " در فراق گجرات " لکھی تھی جو ان کے کلیات میں چھپ بھی

ہو چکی ہے ۔ اس میں گجرات کی تعریف کے سلسلہ میں ولی نے لکھا ہے کہ :۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل　　بے تاب ہے سینہ منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے زخم کا اس کے جہاں تئیں　　شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا　　آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سینے میں آ کے چمن دیکھ عشق کا　　ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی　　دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں　　ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل
حاصل ہوا ہے مجھ کوں ثمر مجھ شکست سوں　　پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں　　اس میکدہ سوں اٹھ کے چلا سدہ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم میں سیر کے لفظ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ولی گجرات کو بطریق سیر و سیاحت گئے تھے ۔ ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا　　آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

وہاں کا متوطن کبھی اس طرح نہیں لکھ سکتا ۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی کہدیا کہ اگرچہ ایک دفعہ دیکھ آیا ہوں لیکن

ع　پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس نظم کے علاوہ انہوں نے اپنے اس سفر کی یاد میں ایک دلچسپ مثنوی بھی لکھی تھی جس میں سورت کی سیر و سیاحت کا ذکر کیا ہے یہ بہت طویل ہے یہاں صرف چند شعر پیش کیے جاتے ہیں :۔

عجب شہراں میں ہے پر نور اک شہر　　بلاشک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اُس کا ناؤں سورت　　کہ جاوے اُس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور　　اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جوں منتخب دیواں ہے سب　　ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سرج سن آب اس کی جگ میں کانپیا　　سمندر موج زن رگ رگ میں کانپیا
کنارے اس کے اک دریائے تپتی　　کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے ٹپتی

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل — ہر اک گل کے نزک وہاں پر ہے سنبل
جو کوئی دیکھا ہے اُن کا باغ رخسار — ہوا اک دید میں وہ محو دیدار
کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز — محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز
صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ — کروں اس درد مے کوں مرہم داغ
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت — ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت
ہر اک کے لب ہیں جیوں یاقوت انمول — کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول
وہ باتاں نہیں سراپا ہے مٹھا قند — کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند
پڑا شیریں بچن سن کے اُن بس جو — پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُسکوں نکلنا کام دشوار
رہا تا آخری دم لگ گرفتار

گویا اس آخری شعر میں ولی نے شیریں زبان میٹھاں گجرات کے عشق میں گرفتار رہنے کی پیش گوئی کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب دوبارہ وہ اپنے وطن سے نکلے تو آخری دم تک گجرات ہی میں گرفتار رہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل ہم ولی کے سب سے چہیتے گجراتی دوست سید ابوالمعالی ہی کے فرزند سے اس امر کی تصدیق کرا دیتے ہیں کہ ولی گجراتی نہیں تھے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ سید محمد تقی ولد سید ابوالمعالی نے خود اپنے قلم سے ولی کے وطن کے متعلق ایک تحریر بطور سند چھوڑی ہے جو اس وقت تک محفوظ ہے۔ اس کو دیکھنے اور معلوم کرنے کے بعد گجرات کا کوئی قدردان ولی خواہ وہ تذکرۂ شعرائے گجرات کا مصنف ہو یا کوئی اور محب گجرات ولی کو گجراتی کہنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ سید ابوالمعالی کے فرزند سید محمد تقی نے ۱۱۵۶ھ میں اپنے والد کے مشفق دوست کے دیوان کو خود اپنے قلم سے نقل کیا تھا اور اس کے آغاز و اختتام پر انہوں نے کتاب کا نام اور سن کتابت بھی درج کر دیا ہے۔

سید محمد تقی نے پہلے صفحہ پر کلام شروع کرنے سے قبل لکھا ہے:۔

"تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکھن"

اور آخری صفحہ پر مرقوم ہے:۔

"تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد متوطن دکھن بتاریخ دویم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ یازدہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری بروز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت۔ مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی است

کسے دعویٰ کند باطل است ؛

دیوان وؔلی کا یہ عجیب وغریب و تاریخی نادر قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانۂ لندن میں اس وقت محفوظ ہے جس کا نمبر ۱۵۰۵ ہے اور جس کے متعلق مزید تفصیلی معلومات رسالۂ معارف نمبر ۲ جلد ۲۵ سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔

جگت پریم یا پیام شاعر

از

مولوی غلام طیب صاحب بی۔ اے بی ٹی لکچرار اُردو اورنگ آباد کالج

(۱) جلوہ گل چمن چمن۔ خنجر بے نیام ہے
ناز ہے مائل کرم دعوت قتل عام ہے
غنچے میں ایک راز ہے پھول میں اک پیام ہے
نبض کی جنبشوں میں دل طائرِ زیر دام ہے

(۲) پردہ شب میں جلوہ گر حسن کی اک برادری
چاک سحر سے رونما۔ جام نشاط زندگی
زمزمۂ طیور میں داغ جگر کی روشنی
پھول بھری ہیں ڈالیاں یا کہ بیاض شاعری

(۳) ذوق سرور چاہیے۔ مے کی یہاں کمی نہیں
درد ذرا بھی ہو اگر۔ تلخ یہ زندگی نہیں
بزم نیاز و ناز میں دھوم کہاں مچی نہیں
ایسے میں جو رکا رہے سنگ ہے آدمی نہیں

(۴) اہل نظر کو کائنات۔ حسن کا ایک جال ہے
عکس جمال یار سے روئے بہار لال ہے
دیکھ اسیر آرزو۔ کفر یہاں ملال ہے۔
گردشِ جام شوق سے سارا جہاں نہال ہے

(۵) کس کا ہوا وہ بے وفا۔ تیرا اگر ہوا نہیں
جو ہے خدائے ہر زمیں۔ کیا وہ تیرا خدا نہیں
لذّت غم تو ہے تیری۔ وصل اگر ترا نہیں
عشق کی انتہا نہ ہو کیوں۔ حسن کی انتہا نہیں

(۶) مہر کی ضوفشانیاں۔ سوز و وفا میں جلکے دیکھ
ماہ کی خوش خرامیاں کوچۂ دل میں چلکے دیکھ
صبح و مسا کی کروٹیں موج فنا میں پلکے دیکھ
ہے یہ طلسم دیدنی۔ دیکھ ذرا سنبھل کے دیکھ

(۷) نفس کی سازباز نے علم کو سم بنا دیا
عقل کو آب تاب دے برق ستم بنا دیا
ظلم کو توڑ موڑ کر رحم و کرم بنا دیا
بندۂ سوز و ساز کو تیغ دودم بنا دیا

(۸) شمع ہوس سے دور رکھ شیشۂ نو بہار کو — دشمن آرزو بنا قلب جنوں شعار کو
رنگ خودی مٹا کے دیکھ صنعت کردگار کو — حسن کے آب و رنگ کو شوق کے کاروبار کو

(۹) بادِ صبا سے سیکھ لے طرز مدام رہروی — تار نفس سے مانگ لے خدمت شعلہ گستری
آئینہ بن کے چھین لے حسن کی شان دلبری — تاج صدف سے توڑ لے دُرِّ یتیم پروری

(۱۰) تیرے چمن کے پھول ہیں سارے جہاں کے پھول بن — روپ جدا جدا سہی سب پہ ہے یار کی پھبن
سارا جہاں ہے گلزمیں عشق بتائے کیوں وطن — دیر و حرم کو چھوڑ دے شمع کی ہے اگر لگن

(۱۱) ذرہ دل کو پھینک دے ابر شرارہ دار بن — قطرہ کو دیکھتا ہے کیا موجہ آبشار بن
پھولوں کو توڑتا ہے کیوں باغ سدا بہار بن — سبزہ کا ساتھ کیا بھلا رفعت کوہسار بن

(۱۲) نفس کی آندھیوں میں کیوں عقل تری پتنگ ہے — بادۂ نارسا نہ پی فتنے کی گر امنگ ہے
تیری جبین ناز پر خون وفا کا رنگ ہے — کوئی نہیں عدو ترا تیری تجھی سے جنگ ہے

(۱۳) بیر کو دل میں جا نہ دے بیر سے کس کو کیا ملا — چاہیے ہر بشر کو یاں سب سے رہے ملا ملا
مجھ کو جگت کے پریم میں روح کا آسرا ملا — پریم ہے نور زندگی پریم ملا خدا ملا

ولی کا سن وفات

از

جناب مولوی عبدالحق صاحب بی، اے پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ولی کا سن وفات اب تک غیر متحقق ہے۔ اردو شعرا کے جس قدر تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں وہ سب اس بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ مولوی عبدالجبار خاں مرحوم مولف تذکرہ شعرائے دکن نے اس کا سن وفات (۱۱۵۵ھ) لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت پیش نہیں کیا۔ بعض حال کے مصنفین نے اس کو صحیح سمجھکر نقل کر دیا ہے بعض صاحبوں نے اس شعر سے

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ استنباط کیا ہے کہ ولی محمد شاہ کے زمانے میں تھا۔ محمد شاہ کا سن جلوس (۱۱۳۱ھ) ہے لیکن یہ قطعی طور سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں۔ میرے پاس ولی کے بارہ قلمی دیوان موجود ہیں۔ ان میں کہیں یہ شعر نہیں اور نہ کسی اور دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں یہ شعر یا اس شعر کی غزل پائی گئی۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض مرتب دیوان جو اس شعر کو سند میں پیش کرتے ہیں۔ خود ان کے مرتب کردہ دیوانوں میں یہ شعر نہیں پایا جاتا۔ اصل میں یہ شعر مضمون کا ہے اور تذکرہ گلشن گفتار[1] (۱۱۶۵ھ) اور چمنستان شعرا نے مضمون کے ذکر میں اس طرح نقل کیا ہے

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس قسم کی ایک دوسری غلط فہمی بھی ہوئی، جس سے ولی کا محمد شاہ کے عہد میں ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ "روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ[2]" بعض اصحاب نے اس بیان کو دیکھ کر غلطی سے یہ

[1] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ام۔ اے۔　[2] تذکرہ ہندی صفحہ۔

سمجھ لیا کہ ولیؔ محمد شاہ کے عہد میں دلی گیا تھا۔ حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ ولیؔ کے جانے کا۔

یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ولیؔ دلی گیا تھا۔ سوائے قائمؔ کے کسی نے صحیح سن اس کے دلی جانے کا نہیں بتایا۔ قائمؔ لکھتا ہے کہ وہ عالمگیر کے ۴۴ سن جلوس[1] (۱۱۱۲ھ) میں دلی گیا۔ اس کا دوبارہ دلی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے۔ ثابت نہیں ہوتا۔ غالباً اس شعر سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے یہ غلطی پیدا ہوئی۔

ایک مدت کی جستجو کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ ولیؔ کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ اس کی شہادت ہمیں ذیل کے قطعہ تاریخ سے ملتی ہے جو کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ دیوان ولیؔ (نشان ۴۲۷۹) کے خاتمے پر درج ہے۔

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل — والی ملک سخن صاحب عرفان ولیؔ
سال وفاتش خود از سر الہام گفت — بادپناہ ولی ساقی کوثر علی

اس دیوان کی کتابت ۲۱ سن جلوس محمد شاہی میں ہوئی اور کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے۔

اس کے بعد اس امر کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے ہوئی اور اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن مفتی ہیں۔ (اردو)

---

[1] تذکرۂ مخزن نکات صفحہ ۱۰

ولیؔ

از

مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ)

جہانِ رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شبِ ہجران کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی

زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
پریشاں گیت تھے گیتوں کے چہرے پر اُداسی تھی

ترانے حسن و دِل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
حسیں فطرت کا جی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی

اِک ایسی ترجمانی چاہتے تھے راز فطرت کے
کسی داؤد کے محتاج تھے سب ساز فطرت کے

ابھی نا آشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا
اسیر خامشی تھی، بار تھی، آزار تھی دنیا

یکایک دہر تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوی اتراتی چلتی ہے

اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوّارے
پگھل کر بہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے

وہ پیغام سحر آ ہی گیا زنجیر شب ٹوٹی
وہ ابھرا مہر لو وہ زندگانی کی کرن پھوٹی!

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چٹکی سے سرکایا
تو گہوارے میں اِک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال لیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں رنگینیوں کی ناؤ کھیتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولیؔ آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے ولیؔ آیا

ولیؔ وہ ہمدمِ فطرت، وہ پیکِ نور وجدانی
وہ جبریل سخن، وہ اولیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اُس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا!

دیے روشن کیے مندر میں کعبے کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دِل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پہ زندگی کا جام آتا ہے

ولی کی شاعری

از

جناب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اے لکچرر سٹی کالج

(۱)

اُردو ادب کے سخت کوش مورخین کی محققانہ کاوشوں نے ولی کے متعلق یوں تو بہت کچھ مسالا کھود نکالا ہے جس کی بدولت آج ہمیں اُس کی زبان اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ دلچسپ معلومات حاصل ہیں۔ لیکن اُس کی شاعری کے محرکات نیز وہ چیزیں جو در اصل اس کی شاعری کی جان ہیں ان کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کی ولادت، وطن، سیر و سیاحت اور عام شاعرانہ خصوصیات پر خاصی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن محض انھیں چیزوں کا اعادہ کرنا میرے نزدیک کوئی جدت نہیں رکھتا۔

یوں تو ولی نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور ہر صنف میں اپنے کمال کا زور دکھایا ہے۔ قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع بند مستزاد، وغیرہ وغیرہ جن کے نمونے انجمن ترقی اُردو کے شایع کردہ کلیات ولی کی بدولت ہماری نظر سے گزرے، ان سے ہمیں اُس کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن وہ صنفِ خاص جو ولی کے کلام کی جان ہے اور جس کی طرف اُس کے پیشروؤں نے بہت کم توجہ کی ہے، وہ فن غزل گوئی ہے جس میں اُس نے اپنی حسن کاری اور اعلیٰ فن دانی کا بدرجہ اتم ثبوت دیا ہے۔ ولی غزل گوئی کے میدان کا مرد ہے جس کے نقش قدم پر چل کر بعد کے تمام شعرا اور بالخصوص میر نے نام کمایا اور سرتاج شعرا کہلائے۔ اس مختصر سے مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم میر اور ولی کا موازنہ کریں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ گو میر کی استادی میں کلام نہیں۔ لیکن ولی کے کلام کی سیر کرنے کے بعد میر کی میری کی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اُردو ادب کی تاریخ میں ولی اور میر کی خدمات گراں قدر ہیں۔ البتہ یہ بدقسمتی ہے کہ ولی کی حقیقی عظمت سے حال حال تک بہت کم لوگ باخبر تھے۔ یہ سراسر ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم نے اُسے پردہ گمنامی میں رکھا۔

میر کے متعلق ناسخ کا یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ جو میر کا قائل نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے۔ لیکن اس مقولے سے لاذوی ولایت

کے منکر کو شیطان کہتے ہیں، بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ قاضی نور الدین حسین گجراتی کے مرتب کردہ شعرائے گجرات کے تذکرے سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ولی کی اُستادی ایک زمانہ تک مُسلّم تھی ہیں یہاں پر صاحب تذکرہ کے الفاظ من وعن نقل کرتا ہوں "نقل است کہ روزے در محفل سخن طرازان...... ایاغ رحیق محمد ولی در گردش بود......... شخصے از کیفیت ایں بادہ ناآشنا، زبان طعن بر مجادرہ ولی دراز کرد..... یکے از آں مجمع بدیہتہً ایں مصرع خواند۔

ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں

طاعن منفعل وحضرات خوش دل شدند۔"

اس شاعر ولی کی والہانہ ولایت کے جوہر خاص طور پر اُس کی غزلوں سے کھلتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے ردیف الف کی وہ غزل تقریباً تمام وکمال یہاں پیش کریں گے جس میں صاف وصریح طور پر ولی اپنے ایک محبوب کا خاص انداز و اہتمام کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد جستہ جستہ اُن اشعار کا بھی ذکر ہوگا جن میں در پردہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی چشم تخیل میں کسی خاص الخاص حبیب کا نقشہ ہے۔

پڑیا (پڑا) ہے لعل میں پرتو سجن تجھ مکھ کی لالی کا	بیاں ہے مہ سوں (سے) روشن ترا تری صفا کمالی کا
ترا قد، مصرع برجستہ دیوان خوبی ہے	تری یو (یہ) بیت ابرو، شعر دستا ہی ہلالی کا
ترے لب کی حلاوت نے کیا مجھ طبع کو شیریں	ہوا ہے نُقل مجلس، ذکر مجھ شیریں مقالی کا
نزاکت تجھ کمر کی دل نشیں ہے اس سبب ساجن	ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا
رنگیلے شعر کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں	ترا یو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا

ولی تجھ شعر کوں سُن کر ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

آیئے اس غزل کے چند اشارات سے ایک سراپا تیار کرلیں۔ تاکہ آیندہ اشعار میں اس قبیل کے جہاں کہیں الفاظ یا اشارات برتے گئے ہیں۔ اُس سے اس "دل نشین ساجن" کی خصوصیات حسن کو ہم نظر انداز نہ کرسکیں۔ سُنئے:۔ دراز قد، چھریرا بدن، نستعلیق چال، ایک خاص لچک کی حامل جس کو ولی "لٹک" سے تعبیر کرتا ہے۔ بڑی بڑی غلافی اور رسیلی آنکھیں، جُٹی ہوئی محرابی ابرو، ابروؤں کے اوپر یا نیچے ایک خال اور ان سب کے منجملہ وہ شاداب اور قیامت بھری جوانی جس نے شاعر کی حسن کار آنکھوں کے سامنے ایک مجسم طلسمی منظر پیش کر رکھا تھا۔

ان کیفیات کو جس والہانہ انداز سے شاعر پیش کرتا ہے۔ اُس سے نہ صرف شاعر کا سارا وجود مرتعش نظر آتا ہے بلکہ اُس کے مسحور کن اثر سے سُننے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ البتہ ان اُستادانہ مُوکشیوں میں کہیں بھی وہ بوالہوسانہ رنگ نظر نہیں آتا جس

کی بنا پر انگشت اعتراض اُٹھ سکے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو و فارسی شعرا کی سنت قدیم کے مطابق ولی اپنے محبوب کے خط و خال کی محض فرضی رعنائی پر رطب اللسان ہے۔ ہر موقع پر ایک خاص انداز اور تفصیل کے ساتھ بار بار چند امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط و خال کی وہ رسمی تعریف نہیں جو بے جان طریقے سے ہمارے شعرا بیان کیا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اثر آگین والہانہ انداز، اور وہ رنگین اور پُر از تفصیل اشارات۔ کسی حسنِ خاص کی غمازی کرتے ہیں۔ اُس حسن کی جس کی خاطر ولی نے دہلی کا سفر کیا، اور جس کی و نیز دیگر نسوانی حسن کی جاذبیت کی خاطر ولی نے عالمگیری عہد کے اورنگ آباد کو ترک کر کے گجرات کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔

لاگی ہے لگن تم سے چھڑا کون سکے گا — اب مجھ کو وطن اپنے لے جا کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر — دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا
رہتے ہیں ہیا چاک تمہاری ہی گلی میں — اب مجھ کوں جنازے میں اُٹھا کون سکے گا

ذرا یہ تصویر بھی دیکھئے:۔ وہی کمان دار بھویں (بھنی چال)، بالائے کمان وہی خال، اور وہی "لٹک" دار چال!

کتاب حسن کا یو دیباچہ، مکھ صفا تیرا صفا دستا — ترے ابرو کے دو مصرعے سوں اُس کا ابتدا دستا
ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی — اُپر ابرو کے کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا
ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی — یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا
یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن — مطوّل کے معانی کا تمامی مدعا دستا

اے رشک ماہتاب تو دل کے صحن میں آ — فرصت نہیں ہے دن کوں کو اگر تو رین میں آ
تا گل کے رو سے رنگ اُڑے اوس کے نمط — اے آفتاب حسن "لٹک" سوں چمن میں آ

تجھ عشق سوں کیا ہے ولی دل کو بیت حزن
سرعت ستی (سے) اے معنی بیگانہ من میں آ

اپنی استادی سے "اے معنی بیگانہ"، پر کیسا لطیف پردہ ڈال دیا ہے!

بہ نظر اختصار، میں صرف ردیف "ی" کی ایک غزل کا سراپا اور پیش کروں گا متجسس نگاہوں کے لئے شاعر کے دیوان میں جابجا ضیافت نظر کا سامان موجود ہے۔ بہر حال اس عشق کی یہ آخری تصویر کم از کم دیکھ لیجئے جو کسی قدر اختصار و تصرف کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

ترے یاقوت لب کی دیکھ لالی — ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی
ترے پانواں کی خوبی پر نظر کر — ہوئے ہیں گل ز خاں جیوں نقش قالی

شفق دہو میں ڈوبا سر سوں پگ لگ (قدم) — تو باندھا سر سوں جب چیرا گلالی
ہوا تیرے خیالاں سوں سراپا — مرا دل مثل فانوس خیالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیہ مست — پیا گویا شراب پرتگالی
تری انکھیاں میں ڈورے دیکھ کر خُرخ — بنائی خلق نے ریشم کی جالی
ترے لب اور تیرے ابرو کے دیکھے — پڑھوں شعر زلالی و ہلالی

ولی تب سوں ہوا ہمکار فرہاد
سُنا جب سوں تری شیریں مقالی

بہرحال اس قبیل کے تمام اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولی بے لاگ حسن پرست اور حسن کار تھا۔ کیٹس (Keats) کی طرح اس کے نزدیک بھی حُسن صداقت اور صداقت حُسن ہے۔ حُسن حُسن کی خاطر، اور فن فن کی خاطر۔ یہ ہے ولی کا مشرب حسن پرستی۔

(۴)

ولی کے مشرب حسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم اس کا خالص ہندی تخیل ہے جس نے اس کے ملہات شعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کردی ہو۔ یہ خالص ہندی رنگ ولی کے بعد کے شعرا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ ان کی شاعری ایرانی آب و رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے قطعی آمادہ نہیں ہوں کہ اردو کے وہ شعرا جنہوں نے ولی کے بعد اردو زبان میں نغمہ سرائی کی محض فارسی شعرا کے نقال تھے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کی شاعری فارسی کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اور ان کی رنگ آمیزیوں میں ہندی ماحول اور ہندی خصوصیات حسن کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس باب میں قدیم دکھنی شعرا بالعموم اور ولی خاص طور پر ہندیت کے علمبردار ہیں۔

آیئے اس نقطۂ نظر سے ہندی نسائیت کے چند دلکش مرقعوں کی بھی سیر کیجئے۔ یہاں بھی شاعرانہ کیف و مستی اور حسن کارانہ سحر آفرینیوں کا وہی عالم ہے۔

گجرات کا حسن اور سورت کی مورت زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اس کی گہرائیوں میں ولی کے ترک وطن کا راز بھی پوشیدہ ہے بھلا ولی جیسے آزاد مشرب اور حسن پرست انسان کے لئے اورنگ آباد اور بالخصوص عالمگیری عہد کے اورنگ آباد میں دلچسپی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اس کا دل تو حسن کی ہنگامہ زا فضا کے لئے بیتاب رہتا ہے وہ تو عبادت کے ساتھ کچھ نظارہ بازی بھی چاہتا ہے۔ اس کی آنکھیں تو شعریت حسن کی متلاشی رہتی ہیں۔ چنانچہ عالمگیری عہد کا یہ کنہیا شعریت کی تلاش میں گجرات کے مندروں، پنگھٹوں، اور زردشتی معبدوں کی بھی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ دیکھئے نسوانی اور برہمنی حسن کی صداقت شعارانہ مرقع کشی ولی سے پہلے یا بعد اس تفصیل کے ساتھ اور بھی کہیں ملتی ہے جیسا کہ اس گجراتی بنجارن کے سراپا میں پیش کی گئی ہے:-

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں دل نہیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری اس بت کوں پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر جوگی کی لیا صورت
یک بار اس موہن کوں چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

یہ دیکھیے ٹھیٹ دار گجراتی ساڑھی، وہ گھیر دار گھونگھٹ، اور وہ دلکش سورتی ادائیں۔ اس کے ساتھ والہانہ اندازِ بیان اور کلام کی روانی بھی ملاحظہ ہو۔ چستی اور برجستگی کا یہ عالم کہ بقول شخصے ع قافیے پاؤں پہ گرتے ہیں کہ باندھو ہم کو

مجھ گھٹ میں اے نگھر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھیں ہوں لٹ گیا دل، تیری زلف کا لٹ کا

(دل) (بیرجانی)
کرتا ہے مجھ کپٹ کوں پڑتے ہیں اشک ٹپ ٹپ
کہہ بات جو بتاتا ہوں شکوہ تری کپٹ کا

تجھ نین دیکھنے کوں دل ٹھاٹھ کر چکا تھا
غمزے کے دیکھ ٹھٹھ کوں ناچار ہو کے ٹھٹکا

ہرگز ولی کسی کن رکھنے۔ پاس، شاکی ترا نہ ہوتا
گر تجھ میں اے ہٹیلے ہوتا نہ طور ہٹ کا

ایک ہی ردیف و قوافی کی دو غزلوں کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں یہاں بھی کچھ وہی ٹھاٹھ ہے۔ الفاظ کا اہتمام بھی ایسا کیا گیا ہے کہ شاعر، مولانا احسن مارہروی کا صوفی نہیں بلکہ گجرات کا پریم پجاری معلوم ہوتا ہے۔

براگی جو کہاتے ہیں انھیں گھر بار کرنا کیا
ہوئی جوگن جو گئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

جو پیوے پرت کا پانی اسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دکھ کا کرتے ہیں انھیں آدھار کرنا کیا

سکھی تمنا کوں ارزانی یو کسوت اغذ ر نیہ سب
ڈھلے جیو سوں جو ہو بیزار اسے سنسار کرنا کیا

مندے گھر واسوں باہر کر آپس کے آپ منصف ہو
بکارا ہیو جھ بک کر آیا بیزار کرنا کیا
(بکالا) دو ہی

لگے جب سوں نہ آنے کی تھی خسا من ہیں تمنا کے
تو مجھ سوں دکھ بھرے سوں پھر جھٹا اقرار کرنا کیا

ترے آنے کی بات اوپر بچھایا ہوں انکھاں اپنی   تو بیگی آ کر تجھ بن مجھ کوں یو گھر بار کرنا کیا
سہیلیاں جب تلک مجھ سوں نہ بولیں گی ولی آکر
مجھے تب لگ کسو سوں بات اور گفتار کرنا کیا

ایک اور مثال:- ہندی نسائیت اور حیا کی کیا پیاری تصویر ہے!

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ   کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر   ستاروں میں چلے مہتاب جیوں آہستہ آہستہ
سلونے سانورے پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے   کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

نزاکت و حیا کی تصویر تو آپ نے ابھی دیکھی۔ ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو۔

چھپنے منیں اے چنچل، ہاتھی کوں لجاوے توں   بیتاب کرے جگ کوں، جب ناز سوں آوے توں
یک بارگی ہو ظاہر بےتابیٔ مشتاقاں   جس وقت کے غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے توں
گویا کہ شفق تیچ چھپے خورشید ہوا ظاہر   جب اوٹ میں پردے کے چہرے کوں دکھاوے توں
ولیٔ فلک مکھ میں انگشت تحیر لے   جب پازیں نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں
اک تان سنانے میں جیو تان لیا سب کا   اب دل سوں گور جاویں، گر بھاؤ بتاوے توں
توبائے ریائی سوں شاید کرے توبہ
اس وقت ولی کوں گر یک جام پلاوے توں

ایک آخری مثال:- یہ دیکھئے نسوانی حسن کی عام اور خاطر نشین ادائیں جو گجراتی اور ہندی خصوصیات سے گزر کر عام نسائیت کی آئینہ دار ہیں۔ غزل تمام و کمال پیش کی جاتی ہے تاکہ یہ نہ خیال ہو کہ شاید انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا   سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا
گر ہی مطلوب تجھ کوں نقش مراد   دیکھ اس کی بھواں کی چیں کی ادا
ہوش میرا نہیں رہا مجھ میں   جب سوں دیکھی ہے نازنیں کی ادا
اے ولی دل کوں آب کرتی ہے   نگہ چشم سرمگیں کی ادا

بہرحال ولی کی حسن پرستی، آزاد مشربی، وسعت نظر اور رواداری کے باب میں اس قبیل کے سیکڑوں شعر آپ کو اُس کے دیوان میں ملیں گے۔ جس کے باعث اُس کا کلام تمام و کمال شعریت، رنگینی، کیف، اور نغمے میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیز اُس غزل گوئی کی جان، اور ولی کی استادی اور قادر الکلامی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنے ذوق بل من مزید کے مد نظر، چند اشعار ولی کی اُس مثنوی سے بھی پیش کرتا ہوں جو سورت سے متعلق ہے۔ ناظرین کو ان اشعار میں ولی کی رنگین مزاجی کے علاوہ اُس کے وطن ترک کرنے کا سبب بھی معلوم ہوگا۔ جس کی طرف میں نے ابھی کچھ پہلے رواداری میں اشارہ کیا ہے۔

سورت کی تعریف میں

عجب شہراں میں ہے پُر نور اک شہر — بلا شک ہے وہ جگ میں مقصدِ دہر

اہے (ہے) مشہور اُس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سوں کدورت

شہر جیوں منتخب دیواں ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کاں ہے سب

کنارے اُس کے اک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کوں اُس کے ٹپتی

شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ — ز دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ

کہ آبِ خضر کی ہے اُس میں تاثیر — ہوا دیتی ہے اس کی یادِ کشمیر

وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم — صبح ہور شام، جپ کرتا ہے عالم

نزک قلعے کے باڑا گھاٹ ہے واں — کہ دایم گُرجاں کی باٹ ہے واں

اے بلبل! پاک بینی سوں نظر کر — کثافت کی نظر سوں بس حذر کر

"کثافت کی نظر سوں بس حذر کر"، یہ ہے ولی کا مشربِ حسن پرستی، جو ہوسناکیوں اور آلائشوں سے پاک نظر آتا ہے۔

کچھ اور اشعار اس مثنوی کے پیش کروں گا۔ جن سے ولی کی آزادہ روی کا ثبوت ملتا ہے کہ سورت کے دروازے کو باب مکہ کہہ دیا۔ اور پھر رواداری کا یہ عالم کہ پارسی اور فرنگی لوگوں کا بھی اس انداز سے ذکر کرتا ہے کہ کہیں فرقہ پرستی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ آجکل کے فرقہ پرست ولی سے سبق سیکھیں! غالباً اس شہر میں اتنے مختلف فرقوں کا میل جول کے ساتھ زندگی بسر کرنا، ولی جیسے آزاد مشرب انسان کو بے حد بھلا معلوم ہوتا تھا۔ یہ رنگا رنگی اُس زمانے کے کسی شہر اور خصوصاً عالمگیری عہد کے اورنگ آباد میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ منجملہ اور اسباب کے جن کا اوپر ذکر ہوا، ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ ولی نے جیتے جی گجرات کو اپنا وطن بنا لیا اور حسن اتفاق دیکھئے کہ مختلف مقامات کا چکر کاٹنے، اور کعبے کا سفر کرنے کے باوجود بھی وہ اُسی سرزمین میں دفن ہوا جس سے اُس کو اتنی محبت تھی۔ بہرحال سنئے۔

اہے سورت حقیقت کی نشانی ۔ کہ ہیں معمور واں اہل معانی
شرافت میں یہ ہی جیوں باب گھر ۔ تو ہی سب ملک پر اُس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز ۔ نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
اِتی (اتنی) آتش پرستاں کی ہے بستی ۔ سکھے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اُس میں لیّے ہیں کُلہ پوش ۔ عدد وہاں جن کی گنتی میں ہے بیہوش
وہاں ساکن لتے ہیں اہل مذہب ۔ کہ گنتی میں نہ آویں اُنکے مشرب
اگرچہ وہ ہیں سب ابنائے عالم ۔ دلے بینش میں رنگا رنگ عالم
بھری ہے سیرت صورت سے سورت ۔ ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت
ختم ہے امرداں پر رد صفائی ۔ دلے ہے بیشتر حسن نسائی
کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل ۔ ہیں سب گوپیاں وہ نقل یہ اصل
نہ کئی وقت سوں کھینچے شوخ چنچل ۔ وہ کہکے باغ کن دیوار آنچل
نظر بھر کر دیکھو ہر گل بدن کوں ۔ کہ ہے پتے سوں بے پڑا امن کوں
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن ۔ ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج ۔ تجلّی کے سمندر کی اُٹھے موج

نین کی بیٹھ کشتی پر توں اے پاک
یہ سطے کر سچ میں موج خطرناک

آخر میں ولی کی صوفیانہ شاعری کے متعلق جس کا بعضوں نے اتنا بستار باندھا ہے، چند کلمات کہنے نامُنا بے محل نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو اُتنا دل پھینک واقع ہوا ہو، بھلا اُس کی زد سے اللہ میاں بچ سکتے ہیں؟ لیکن اللہ میاں پر بھی کبھار نگاہ غلط انداز پڑ جایا کرتی ہے۔ ولی کی شاعری کا خاص رنگ یہ نہیں ہے۔ اس باب میں بعض قدیم تذکرہ نویسوں کی طرح "کلیات ولی" کے فاضل مرتب کو بھی دھوکا ہوا ہے کہ اُنھوں نے ولی ویلوری کی "دہ مجلس" (روضۃ الشہدا) کو ولی اورنگ آبادی سے منسوب کر کے اس غریب کو اچھا خاصا مذہبی اور صوفی شاعر بنا دیا ہے۔ ولی اپنے رنگ میں بے شک ولی تھا۔ لیکن تصوف کی ولایت سے اُسے یوں سرفراز کرنا سراسر زیادتی ہے۔

---

(۳)

فنی تفصیل شاعرانہ ابہام کی کنیز ہے۔ محاسنِ کلام اور طرزِ ادا کی نزاکتیں جذبات کی موزونی کے ساتھ خود ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خیال کہ ولی کی زبان اور خیال میں بعض اوقات ہم آہنگی نہیں ہوتی محض ایک غلط اور گمراہ کن خیال ہے۔ ہم چند مثالوں سے ثابت کر دیں گے کہ ولی کا کلام جذبات کے ساتھ فنی باریکیوں سے بھی مالا مال ہے۔ اچھوتے استعارے اور تشبیہیں، جاذبِ نظر ترکیبیں، الفاظ کی موسیقی، صنائع و بدائع کی مینا کاری محاکاتِ شاعری، غرضکہ وہ کون سا سامان ہے جو ولی کی دوکانِ شاعری میں موجود نہیں۔ زبان بدل جائے، الفاظ متروک ہو جائیں لیکن ولی کی شاعری کا کمال لازوال ہے۔

آئیے لفظی مرقع کشی، محاکاتِ شاعری اور دلآویز استعاروں اور تشبیہوں کی چند مثالیں پہلے پیش کر کے، دوسرے محاسن کا مختصراً جائزہ لیں مفصل تشریح کی گنجائش کہاں جن الفاظ میں خاص لطف یا کوئی نزاکت ہے انھیں قوسین میں رکھ دیا جاتا ہے۔

تو جاں رہا (جہاں) دہاں سوں تجھے دیکھتا ہے دل تجھ مکھ کے دیکھنے کوں یو (دل) (دوربیں) ہوا

(معنی) طرف چلیا ہی (چلا) (صورت آشنا) مرا دل (سورت) ستی چلیا ہے (کعبے) جہاز گویا

(آہ) سوں عاشق کی (عارف) بوجھتے ہیں حالِ دل جیونکہ سمجھے صوت سے (صراف) (تقریرِ طلا)

تیرے (نسکرِ لب) کوں اب مثلِ (عسل) بولنا بلکہ (عسل) ہے (نقل) اس کوں (اصل) بولنا

دسے (کاجل) کی تجھ (انکھیاں) میں اس وضع کہ (برچھی) کوں پکڑ نکلیا (نکلا) ہے (رجپوت)

یو (زلف و خالِ سیہ) نے دیا ہی جگ کوں فریب دغا کے دینے میں ہمرنگ ہیں یہ (پیر و مرید)

تجھ (زلف ہور (اور) دہن) میں ہو (مختصر مطوّل) تو صاحبِ دَرس ہے بوجھا ہوں رو زِ اوّل

صنم کے لعل پر وقتِ تکلّم (رگِ یاقوت) ہو (موجِ تبسم)

یوں (دوستاں کے ہجر میں داغاں) ہیں سینے پر وؔلی — (صحرا کے دامن کے اُپر) جیوں (نقش پائے آہواں)

کیونکہ (اسیری) ہو (حسن) سوں تیرے — (دھوپ کھانے) سوں (پیٹ بھرتا) ہے؟

اے وؔلی (شہرِ حسن) کے اطراف — (خط) سوں اُس کے (حصار) ڈالے ہیں

مجھ سوں (وحشی) (متوحش) ہیں (گُلرخاں) گویا — (فوجِ آہو) ہیں (سبزہ) آیا ہے

کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ اس قبیل کے صدہا اشعار وؔلی کے دیوان میں موجود ہیں جو دیکھنے والے کے دامنِ توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں میں اب دوسری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

چند نمونے سہلِ ممتنع عبارت، اور اس حلاوتِ خاص کے بھی پیش کروں گا جسے عام طور پر غزلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے تو ولی کے یہ اشعار کیف و مستی میں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔ غزل میں سب کچھ ہو لیکن یہ نہ ہو تو کچھ نہیں۔

آشنائی نہیں تو جاتا ہوں — کیا کروں جی اداس ہوتا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں ترے غم میں — عاشقی میں لباس ہوتا ہے؟
تجھ جدائی میں نہیں اکیلا میں — درد و غم آس پاس ہوتا ہے

یک نگہ میں غلام کرتے ہیں — خوب رو خوب کام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں، کہ ملنے میں — دل سوں سب "رام رام" کرتے ہیں

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی — آپ بس نہیں پر بسی ہے پر بسی
رات دن جگ میں رفیق بیکساں — بیکسی ہے بیکسی ہے بیکسی

سُست ہوا عشق میں تیرے صنم — ناکسی ہے ناکسی ہے ناکسی
باعث رسوائی عالم ولی — مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

کمر اُس دل ربا کی دلربا ہے — نگہ اُس خوش ادا کی خوش ادا ہے
یو خط ہے جوہر آئینہ راز — اسے مشک ختن کہنا بجا ہے
نہ پوچھو آہ و زاری کی حقیقت — عزیزاں عاشقی کا اقتضا ہے
غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے — نگاہ پاک بازاں کیمیا ہے

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے — کہ فن عاشقی عجب فن ہے
دشمن دیں کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ دشمن ہے
بار مت دے رقیب کوں اے یار — دوستاں کا رقیب دشمن ہے
اے ولی تیغ غم سوں خوف نہیں — خاکساری بدن پہ جوشن ہے

ایک آخری مثال :۔ دقت قوافی کے باوجود، دیکھیے تو کتنی سلیس اور دل نشین غزل کہی ہے۔ تمام عبارت سہل ممتنع اور سارے اشعار غزلیت میں شرابور ہیں۔

نہ بوجھو خود بخود موہن میں اڑ ہے — رقیب روسیہ فتنے کی جڑ ہے
ہر اک زلفاں کے دیکھے نہیں اٹکتا — اٹکتا ہوں جہاں دل کی پکڑ ہے
برستا ہے سجن کے مکھ اپر نور — نگاہوں کی ہر اک جانب سوں جھڑ ہے
ولی توں بحر معنی کا ہے غواص — ہر یک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

ولی کی بعض غزلوں میں کیف آمیز تسلسل ہے جو بسا اوقات دور جدید کے بعض شعرا کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ چند غزلیں اس نمونے کی بھی پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد سامعین خود اندازہ لگالیں کہ آیا یہ غزلیں بہ لحاظ خیال مجموعہ بے ربطی کہی جا سکتی ہیں؟ ہر غزل ایک مستقل مُنزحی کی حامل نظر آتی ہے۔

---

(۱)

معشوق عربدہ جو

شوخ نکلا جب قدم کوں تیز کر — حسن کے شبدیز کوں مہمیز کر
یک بیک آیا ادا سوں مجھ طرف — ہر پلک کوں دشنۂ خونریز کر
میں کیا یوں عرض از رہِ نیاز — مہربانی اُس کی دستاویز کر
کہہ آپس کے نرگسِ بیمار کوں — عاشقاں کے خون سوں پرہیز کر
اے ولیؔ آتا ہے وہ مقصودِ دل — خانۂ دل خون سوں لبریز کر

(۲)

سوال و جواب

جب ساں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب — دل میں مرے خیال ہے تب سوں عجب عجب
بے تاب ہو کے مثلِ گدایاں نزیک جا — بے باک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دو نین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال — سن یو سوال دل میں رہا بستہ لب عجب
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں (ق) — جس دیکھنے کوں دل میں ترے ہے طلب عجب
اس دولتِ عظیم کوں یوں مفت مانگنا — لگتی ہے مجھ کو بات تری بے ادب عجب"
کیتا میں اس سوال میں دو جا بھی اک سوال — کر بہرہ مند لب سوں کہ تیرے ہیں لب عجب
یکبار اُس سوال میں سن یو دوجا سوال — دل میں رہا آپس کے وہ شیریں لقب عجب
اوّل تو شوخ آ کے غضب میں غصہ کیا — سر تا قدم جو ناز اُٹھا وہ غضب عجب
آخر آپس کے ہمتِ عالی پہ کر نظر — شیریں لباں سوں اپنے چکھایا رطب عجب

(۳)

معشوق سے

چھوڑ اے شوخ طرزِ خودکامی — مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی

تجھ لب و زلف کے تماشے کوں — چل کے آئے ہیں مصری و شامی

زلف تری ہوئی ہے چرب زباں — حفظ کر کر قصیدۂ لامی

باغ میں تجھ انکھاں سوں پایا ہوں — گل نرگس تخلص جامی

اے نگیں لب! کیا ہے حق نے تجھے — نونہالانِ حسن میں نامی

چشم رکھتا ہوں اے سجن کہ پڑھوں — تجھ نگہ سوں قصیدۂ جامی

اے ولی غیر عشق حرف دگر — پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

(۴)

زندگی

اُسکوں حاصل جگ میں ہو کیونکر فراغِ زندگی — گردشِ افلاک ہے جس کوں ایاغِ زندگی

بے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغِ الم — جنت احباب ہے معنی میں باغِ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے — گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم و چراغِ زندگی

جب سوں دیکھا نہیں نظر بھر کاکلِ مشکیں یار — تب سوں جیوں سنبل پریشاں ہے دماغِ زندگی

کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شبِ قدرِ حیات — ہے نگاہِ گرم گلرویاں، چراغِ زندگی

(۵)

عاشقی

(وہی قوافی رکھے ہیں جو گذشتہ غزل میں آئے ہیں۔ کیوں نہ ہو ولی جیسے عاشق مزاج انسان کے لئے زندگی عبارت ہے "عاشقی" سے عاشقی نغمۂ نشاط اور غزل حیات ہے)

کیوں نہ آوے نشہ غم سوں دماغِ عاشقی — بادۂ حیرت سوں ہے لبریز، ایاغِ عاشقی

آب سوں دریا کے ہرگز کام نہیں عشاق کوں — گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغِ عاشقی

گر طلب ہے تجھ کوں رازِ خانۂ دل ہو عیاں — آہ کی آتش سوں روشن کر چراغِ عاشقی

در منداں باغ میں ہرگز نہ جاویں اے ولی — گر نہ دیوے نالۂ بلبل سراغِ عاشقی

(۶)

سراپا شعر

(اس شق کی آخری مثال ۔ دیے ہوئے اشارات سے آپ ہی بتایئے کہ آیا یہ وہ نہیں جو مدت العمر ولی کے قلب و دماغ میں بسا ہوا تھا؟ ایک ایک ادا کو شاعرانہ نام یا تخلص سے منسوب کیا ہے)

ترا اکھ مشرقی، حسن آذری، جلوہ جمالی ہے
نین جامی، جبین فردوسی و ابرو ہلالی ہے

ریاض فہم گلشن، طبع و دانا دل، علی فطرت
زباں تیری فصیحی، و سخن تیرا زلالی ہے

نگہ میں فیضی و قدسی، سرشت طالب و شیدا
کمال بدر دل اہلی و انکھیاں سو غزالی ہے

تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت
ترے ابرو یو مجھ بیدل کوں طغرا و صالی ہے

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل
تو ہر اک بیت عالی اور ہر مصرع خیالی ہے

ولی کی اس والہانہ سحر کاری کے آگے سعدی کا ع ــ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری،، پھیکا پڑ گیا۔

میں اس سلسلہ انتخاب کو اب ختم کرتا ہوں۔ حق یہ ہے کہ ولی کا سارا کلام کیف مستی اور جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں وہ نشتر گری نہیں جو میر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ سارا کلام ہموار اور گلے کی حمائل بنانے کے قابل ہے۔

"پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند،، کا فتویٰ ولی پر صادق نہیں آتا۔ وہ ہر رنگ میں میر ہے اور میر صرف ایک رنگ میں۔ وہ تنوع جو ولی کے ہاں پایا جاتا ہے میر کے ہاں نہیں۔ ولی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتا ہے اور میر صرف ایک پہلو کی۔ میر سراپا قنوطیت ہے اور ولی سراپا زندگی اگر اب تک وقت نہیں آیا تھا، تو کم از کم اب وقت ہے کہ ؎

ولی ایران و توران میں ہو مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

مطربِ اوّلیں

(از)

مولوی محمد عبد القیوم خاں صاحب باقیؔ ام۔اے (عثمانیہ)

یاد ایام کہ اس خاکِ وطن پر کوئی
لذتِ دردِ محبت سے خبردار نہ تھا

صحنِ گلشن میں نہ تھی بلبلِ شیدا کی پکار
پھول کھلتے تھے مگر کوئی طلبگار نہ تھا

پتّیاں غنچۂ نازک کی مچل جاتی تھیں
غم مگر سینۂ گل چیں میں بیدار نہ تھا

روز چلتی تھی مہکتی ہوئی گلشن میں نسیم
بوئے گل کا کوئی معصوم خریدار نہ تھا

آہ و فریاد سے مدہوش نہ رہتی تھی فضا
قفسِ تنگ میں اک مرغِ گرفتار نہ تھا

گوشے گوشے سے چلی آتی تھی لیلیٰ کی صدا
گوشِ دیوانہ مجنوں پسِ دیوار نہ تھا

وائے ناکامیٔ تقدیر کہ ہر عاشق کے
درد تھا دل میں مگر قابلِ اظہار نہ تھا

خشک سینوں میں نہ تھی خارِ تمنا کی خلش
آنکھ پُر درد نہ تھی، نالہ شرر بار نہ تھا

ذوقِ نغمہ سے بہت دور تھے اہلِ محفل
کوئی اس جوہرِ قابل کے سزاوار نہ تھا

اے خوشا بخت کہ بیدار ہوئی محفلِ عشق — دردِ سینے میں اٹھا شوق کا آغاز ہوا!

گوشِ انساں نے سنی، لے ہیں کہانی دل کی — نغمہ زن انجمنِ درد کا ہر ساز ہوا

نالۂ عشق جو سینہ میں چھپا رہتا تھا — آسمانوں کی طرف مائلِ پرواز ہوا

آنکھ میں حسن کے دیدار کی لذت ہی نہ تھی — اس کا ہر گوشہ اب اک انجمن ناز ہوا

غنچۂ باغِ نظر کھلنے لگا وقتِ سحر — بلبلِ گلشنِ دل زمزمہ پرداز ہوا

اشک آنکھوں میں جب آئے تو طبیعت مچلی — شورِ ہنگامۂ ہستی اثر انداز ہوا

جب اٹھا نالۂ دل دردِ محبت بن کر — ہر ستارہ شبِ غم گوش بر آواز ہوا

ہوگئیں سیکڑوں خاموشیاں صدقے اس پر — نالۂ شوق جو منت کشِ آواز ہوا

اے وکلی سب تیری آواز سے بیدار ہوئے — فاش جب سارے زمانہ پہ ترا راز ہوا

آ تجھے نذر دوں اک نالۂ مضطر اپنا — کیونکہ نالے کا ترے عہد سے آغاز ہوا

نغمۂ عشق زمانے کو سکھایا تو نے
ہائے کس شوق سے تو پہلے نوا ساز ہوا

چاہتا ہوں کہ تری طرح جگاؤں دل کو — نغمہ اب تک نہ سنا تھا وہ سناؤں دل کو

کیا تری بزم سے فریاد ملیگی کہ نہیں — آرزو کی مری کچھ داد ملیگی کہ نہیں

وَلی کا اسلوبِ شعر
اور
جدید شاعری

(از)

مولوی محمد عبد القیوم خان صاحب باقی ایم اے (عثمانیہ)

یہہ امر کتنا مسرت بخش ہے کہ وَلی کے جشن کے چرچے اندرون و بیرون ملک جگہ جگہ ہو رہے ہیں۔ ہمیں بڑی خوشی اس امر کی ہے کہ صرف اس جشن کے انعقاد ہی پر ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آرہی ہیں، اگر اسکی ادبی کاوشوں اور علمی روئداد کا بھی صحیح اندازہ کیا گیا تو یہہ حقیقی معنوں میں قابل مبارکباد ہو جائیگا۔

اسی جشن کے متعلق ایک دن گفتگو ہو رہی تھی میرے ایک فاضل دوست کرسی پر دراز ہو کر کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے، کسی شائق علم نے اُن سے پوچھا "جناب والا" آپ فرمائیے وَلی کا حقیقی وطن کونسا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال موصوف سے اس لئے کیا گیا کہ اُن سے شمالی ہند کی پاک سرزمین کی ہمیشہ تعریف سنتے سنتے جی اکتا گیا تھا، اب آرزو تھی کہ دکن کے متعلق اُن کی کوئی رائے حاصل کیجائے۔ موصوف شاعر تھے، سخن فہم تھے، اردو دانی کا انھیں ادعا بھی تھا، مشہور بھی تھے، ان کا عجیب و غریب جواب ہے جو میرے اس مضمون کا اولین محرک ہے، اس لیے عرض کرتا ہوں۔ آپ نے کچھ سوچ کر فرمایا "بھئی بات یہہ ہے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں (پھر جملہ معترضہ۔ میر نے اردو شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے!) صاف لکھا ہے کہ وَلی جب وَلی آئے تو میر نے ان سے کہا" آپ کی زبان درست نہیں ہے، اردوئے معلیٰ کی زبان لکھیئے" یہہ مشورہ ان کے پسند آگیا، چنانچہ انھوں نے اسی دن سے دکن کی زبان ترک کردی، اسی کا اثر ہے کہ وَلی کی شاعری کا یہہ معیار اور یہہ رنگ ہے! یہہ جواب جسقدر دلچسپ ہے اس کا آپ خود اندازہ فرمائیں۔ ادھر انکی

زبان سے یہہ جملہ ادا ہوا، ادہر میں نے چپ سی سادھی، اور غور کرنے لگا، آہ دکن، تیری بدنصیبی! اُردو کا سب سے پہلا شاعر، تیری مبارک زمین سے اٹھا، دوسو برس کے بعد دنیا، اُسے بھی تجھسے اس طرح چھین لینا چاہتی ہے! پھر خیال آیا، یہہ اتنا آسان نہیں، جو دیوان، یعنی وہ پہلا مرقع جس میں ایک شاعر کے نقوش خیال، حُسن ادا اور حُسن تصور بنکر، دنیا کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، دکن کے خیال اور زبان کا وہ مستقل خزانہ ہے جسے کوئی دوسرا ملک تاریخی حیثیت سے اپنا نہیں بنا سکتا اور نہ اس کا دعویٰ کرسکتا ہے، دیوان ولی، ہمارے وطن کی پیداوار ہے اور جبتک ذوق ادب قائم ہے یہہ ہمیشہ اس کا ثبوت دیتا رہیگا۔

شاعر کی آفرینش

حضرات! غور فرمایئے، کسی سرزمین پر، کسی قوم میں، ایک شاعر کا پیدا ہونا کوئی معمولی سی بات نہیں ہے جسے واہ واہ کرکے ٹالدیا جائے۔ شاعری کی دیوی کے سچے پرستار **شیلے** نے کہا تھا "انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے"! اس جملے کے مفہوم سے زیادہ اس رنگین تصور، اس وجدانی خیال، اس ذوق نغمہ، اور اس بیتابی دل کی داد دیجیئے، جسکی بدولت یہہ آٹھ لفظوں والا جملہ پیغمبرانہ پیام بنکر اسکی زبان سے نکلا، جب ہر انسان کی آواز اور تکلم بھی شعر ہے تو پھر شاعر کی آواز اور اسکے تکلم کا کیا عالم ہوگا!

(ایک بے چین سرزمین، ایک ٹوٹتے ہوئے تمدن، ایک سیاسی طوفان میں گھرے ہوئے ملک اور ایک مظلوم قوم کی حالت زار کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ایسے وقت جبکہ سرزمین دکن کا ذرہ ذرہ، ایک آہ، ایک آنسو ہے، وہاں ذوق، نغمہ، حُسن اور ترنم کو کیا دخل ہوسکتا ہے، مگر قدرت بھی عجب سادہ اور پرکار واقع ہوئی ہے کہ بعض وقت بقول اقبال۔

تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب ۔۔۔ رہرو دشت ہو سیل زدۂ موج سراب

وہ انسان کے آگے اپنے نت نئے کرشمے پیش کرتی رہتی ہے اور انسان انھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے۔

یہی دکن میں ہوا، دیکھتے دیکھتے ساری زمین رنگین ہوگئی، ہواؤں میں مہک، پھولوں میں دلفریبی اور بلبل کی آواز میں درد پیدا ہوگیا، انسان کے آگے خیال کی موج، نغمے کے رنگ اور تصور کے جلوے، الفاظ اور رنگین الفاظ کے قالب میں بیتاب ہونے لگے۔ ماہتاب کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوا گویا محبوب مُسکرا رہا ہے، درخت پر نظر ڈالو تو شادابی بہار، اور صبح کی ٹھنڈی ہوائیں اس پر جھولا جھول رہی ہیں، ستارے گا رہے ہیں شفق آسمان کے چہرے پر غازہ مل رہی ہے، خاک کے فرش پر قدرت کی سب سے زیادہ پیاری صنعت یعنی ہمارے شاعر کے الفاظ میں "سجن" اس طرح قدم اٹھا کر چل رہا ہے جیسے تاروں کے جھرمٹ میں مہتاب (یہی وہ

تشبیہ ہے جو ہمارے شاعر نے اپنے ایک شعر میں لکھی ہے اور کل یہ شعر آپ کے سامنے پڑھا گیا تھا) اچھا تو گویا شاعر کیا پیدا ہوا، دل کی آنکھیں کھل گئیں، رنگینیوں نے دربار سجایا۔ غور فرمائیے، کیا یہ قدرت کی کوئی معمولی نعمت ہے؟

شعر اور تدوین

اس سے ایک قدم آگے بڑھیئے تو شاعر نہ صرف ہمیں شعر کی دولت بخشتا ہے بلکہ اس دولت کو ایک جگہ اکٹھا کرکے قوم کے سپرد کرتا ہے تاکہ وہ اُسے سنبھال کر رکھے، اور اُسے اپنی ادبی تونگری اور حسن کارانہ سرمایہ کا جیتا جاگتا ثبوت بنا کر پیش کرتی رہے۔ یہ گویا ایک لازوال خزانہ ہے جس کا خرچ کرنا اسکی آمدنی بڑھاتا ہے!

نغمۂ عشق

ایک قدم اور آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی انسان نے دیکھنا تو کجا، بولنا بھی نہ سیکھا تھا۔ کونسی بولی؟ قدرت کی صنعتوں پر دیوانہ وار گرنے، اُن کی خوبیوں کے پیامبر ہونے کی بولی، دل کی بولی، آنکھ کی بولی، نغمے کی زبان اور ترنم کا پیرایۂ بیان۔ ایک انسان نے زمانے کو نغمۂ عشق سکھایا، دل کی رنگینیوں کو زبان سے ادا کرنے، اور ذوق نظر کی لطافتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے پاکیزہ شعروں کی صورت میں خوبصورت سانچے بنا دیئے۔ اگر ادب کے اس فیض اولین، اور کسی ادبی رہبر کے نقش اول کی تاثیروں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو بعد آنے والے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی حقیقت بہت کچھ بے نقاب ہو جاتی ہے اور انکی عظمت وشان کے حقیقی راز دنیا پر کھل جاتے ہیں۔ ادب درحقیقت ایک چراغ ہے، اور اسی دیا سے دوسرے دیئے جلتے رہے ہیں، بڑا محترم، بڑا بلند پایہ ہے وہ شخص جو پہلے ادب کا چراغ جلاتا اور ایک اندھیرے گھر میں اُجالا کرتا ہے!

تاریخ پر روشنی ڈالنے والے فاضل مقررین نے کل آپ کے سامنے کہا کہ وَلی سے بہت پہلے کئی شعرا اور صاحبان تصنیف کے دور گذر چکے ہیں مگر وَلی خود اپنی زبان سے کہتا ہے اور اہل تحقیق اُسے تسلیم بھی کر چکے ہیں کہ ریختہ کا پہلا بلند پایہ شاعر اور مکمل کلیات کا مرتب وہی ہے اور یہی دکن میں اس کا بڑا کارنامہ ہے!

کل کے مضمون میں ایک فاضل مصنف نے فرمایا کہ وَلی بڑا حُسن پرست تھا۔ اسمیں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہر سچا شاعر حُسن پرست ہی ہوتا ہے۔ اس تاریک عہد میں جبکہ اہل زمین کو حُسن کی نہ پرستش کرنی آتی تھی اور نہ اُن کے ذوق نظر کی ترجمانی کے لئے زبان تھی، ایک حُسن پرست نے "ریختہ گوئی" سکھائی، گویا اہل دل کو حُسن مجاز کے تصورات اور اظہار خیال کے لئے مستقل سانچے بنا کر عشق کے آسمانی رستے لگا دیا۔ اب ان سالکوں کا کام ہے

کہ وہ اس راستے پر حسن کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے اپنے حوصلوں کے مطابق آگے بڑھتے جائیں۔ یہہ ایک بدیہی امر ہے کہ ابتدائی سانچے خام اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے شاعر کے وہ سانچے بنائے جو بالکل نئے پختہ، مستقل اور خوبصورت تھے اور اب تک بھی محبت بھری نظروں سے دیکھے جانے کے قابل ہیں! آئیے، ان سانچوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور انکی خوبصورتی کا اندازہ کریں)

شعر کے سانچے پہلی بات تو یہہ ہے کہ ہمارے شاعر کے ہاں مختلف بحروں اور زمینوں کی اتنی کثرت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر پہلے ہی اسکے ذوق ونظر کی وسعت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ دیوان (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) شاہد ہے کہ اسمیں طویل اور مختصر بحروں کی کتنی رنگا رنگی موجود ہے۔ یہہ گویا جذبات کے سانچے ہیں اور ان کا تنوع بتاتا ہے کہ اس مطرب اولین کے دل میں جذبہ اور تصور کتنی صورتیں اور قالب لیکر اُبھرتے تھے۔ جذبات کا سانچہ بنانا حسن کاری کا ایک اہم مقدمہ ہے، اسمیں سجاوٹ، اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے ایک اہل نظر اور صاحب دل کی ضرورت ہے۔

زبانِ نغمہ شعر جس طرح خیال کا عکس اور تصور کا آئینہ ہے اسی طرح الفاظ کی زنجیر بھی ہے۔ ان الفاظ کی رگوں میں ضروری ہے کہ نغمے کا خون دوڑتا رہے۔ خیالات میں سمندر کی لہروں اور اسکی تہ کی طرح چمک اور چھاؤں پائی جائے۔

ولی کے جذباتی سانچے سمندر کی موج کی طرح چمکدار ہیں اور ان میں الفاظ کی شیرینی ایسی ہے جیسے بہتے پانی میں ہلکا ہلکا ترنم۔ اپنے ایک شعر میں اپنے محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

(۱) آج گلگشتِ چمن کا وقت ہے اے نوبہار
باد٭ گلرنگ (سوں) ہر جام گل لبریز ہے

اسی طرح نزاکت خیال اور لطافت ادا دیکھیئے، حسن کا شیریں نغمہ محبوب کی تعریف میں گاتا ہے۔

(۲) آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

مت دور ہو اک آن ولی پاس سے ہرگز
اے باعثِ جمعیتِ ایام جوانی

ایسے دور میں جبکہ آواز انسانی سینوں کے اندر دفن اور گوش ذوق نغمہ سے خالی تھے ہمارے شاعر نے ایک مکمل نغمہ سنایا۔ ایک "زندگی کا راگ" سناتا ہوں اور یہہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ہمارے کان جدید طرز شعر گوئی سے واقف ہیں میں آپ کو اس قدیم نغمے کی صفائی اور ترنم کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اسکو حاصل جگ میں ہو کیونکر فراغ زندگی
گردشِ افلاک ہے جسکو ایاغ زندگی

بے عزیزاں سبز گلشن ہے گل داغ الم
جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے
گر نہ دیکھوں تجھکو اے چشم و چراغ زندگی

کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شب قدر حیات — ہے نگاہ گرم گل رویاں چراغ زندگی

غالب اور ولی مرزا غالب[1] دہلی کے وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے قدیم طرز غزل گوئی کے قالب کو بدل ہی دیا۔ ہاں جس کمال سے بدلا وہ ہم میں سے ہر ایک صاحب ذوق جانتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ فی زمانہ سیکڑوں شاعر پیدا ہو رہے ہیں اور اُن میں سے اکثر اسی معمار سخن کی معنی آفرینی اور طرز ادا کی پیروی کرنی چاہتے ہیں۔ مگر انھیں قدم قدم پر ناکامی ہوتی ہے۔ ہمارے شعر یا تو مہمل الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں یا خشکی اور بے کیفی کی تصویر۔ یہہ حال اُردو کے ایک ترقی پذیر دور کا ہے۔ ولی۔ غالب کی طرح اُردو کا اولین معمار ہے۔ ہم اس نقطۂ نظر سے جب اسکے کلام کو دیکھتے ہیں تو نہ صرف اسمیں بے عیبی کا جوہر پاتے ہیں بلکہ دور غالب کی پختگی اور ارتقا کے بھی عمدہ نمونے دیکھتے ہیں۔ زبان، تشبیہات، استعارے، تراکیب لفظی اور معنوی نہایت شُستہ رُفتہ، پُرلطف اور دلکش ہیں جنھیں دیکھکر ایک قسم کا استعجاب پیدا ہوتا ہے۔

قدرت سخن قادر الکلامی ولی کی خاص صفت ہے۔ کہیں بندش میں کوئی اُلجھن یا ادائے خیالات میں کوئی ژولیدگی نہیں پائی جاتی، الفاظ نہ سقیم ہیں اور نہ زائد۔ مشکل سے مشکل بحروں میں بھی اپنا مضمون اتنی خوبی اور پاکیزگی سے ادا کر جاتا ہے جس طرح بلبل شاخ گل پر بغیر کسی تکلف کے نغمہ سرا ہوتا ہے۔ زبان پر قدرت مسلّم اُستادی کی دلیل ہے، اسی قدرت کی جولانیوں نے ولی کے سامنے اصناف سخن کے بہت سے میدان کھولدیئے۔ قصیدہ، رباعی، مثنوی، قطعہ، مستزاد، مخمس، اور چند دیگر اصناف اور صنعتوں میں اس نے حیرت انگیز طریقہ سے شعر اور مکمل شعر کہے ہیں۔

کمال شعر شعر کی صفت یہہ ہے کہ وہ جس طرح اچھے خیال کا حامل ہو اسی طرح اچھے الفاظ کا قالب بھی اختیار کرے، ولی کے اولین نغموں میں متاخرین کا کمال اور پختگی پائی جاتی ہے۔ دیوان ان خوبیوں سے بھرا پڑا ہے، چند مختصر زمزمے آپ بھی سماعت فرمائیے۔

(۱) مسجود آفتاب شرف سے ہوا ہے آج — وہ نقش پا کہ زینت روئے زمین ہوا

(۲) ہزار بلبل مسکیں کا صید ہے باقی — مقیم ہے چمن حسن میں بہار ہنوز

ہوا نہیں وہ صنم صاحب اختیار ہنوز — بجائے خود ہے رقیباں کا اعتبار ہنوز

---

[1] (۱) دیوان ولی (مطبوعۂ انجمن ترقی اردو) صفحہ ۲۷۳

(۲) ایضاً صفحہ ۲۳۳

(۳) ایضاً صفحہ ۲۲۵

افسانہ

Riaz Nashath

ولی جہاں کے گلستاں میں ہر طرف ہے خزاں ولے بحال ہے وہ سرو گلعذار ہنوز ؁

(۳) بے شک کریگا خاطر عشاق باغ باغ آیا ہے التفات پہ وہ نوبہار آج
اطراف آسماں کے ہجوم شفق نہیں تجھ رنگ نے ہوا کو کیا لالہ زار آج

روانی شعر کی دوسری خوبی اسکی روانی اور سلاست ہے۔ ایسے دور میں جبکہ "گیسوئے اردو" ابھی منت پذیر شانہ" تھا، رواں شعر لکھنا گویا ایک معجزہ دکھانا ہے۔

(۴) پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا ؁ شاید کہ "مرا حال" اسے یاد نہ آیا ؁

(۵) معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے بجھتا نہیں ہے باد صبا (سوں) چراغ گل

زبان کی مشاطگی ہر بڑے شاعر کی طرح ولی[1] ایک معمار زبان وسخن بھی ہے۔ شعر کہنا خود ایک بڑی تعمیر ہے، اور کمال شعر کہنا مستقبل کی پیغمبری ہے۔ ولی کے کلام میں بعض ایسی خوبصورت ترکیبیں ملتی ہیں جنکی جدید شاعری کو سخت ضرورت ہے مگر ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مثلاً

پردہ شناسان مدعا، سامان طغرائے نیاز، آتش سوار، ابر دریا بار، رعشہ سیماب، نور کا فانوس، گوہر کان حیا، آئینہ معنی نما، پریشانی فروش، نقش مراد آئینہ۔ آخری ترکیب کا مصرع ہے ؏ نقش مراد آئینہ تیرا خیال ہے

ترکیبوں کا حسنِ استعمال ترکیبوں کی خوبصورتی اسوقت اور بھی نمایاں ہوتی ہے جبکہ یہہ شعر میں اس طرح بٹھائی جائیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ولی کے اشعار اسی طرح قیمتی نگینوں کی انگوٹھیاں معلوم ہوتے ہیں جنکی قیمت آج کے بازار میں بھی انمول ہے۔

ولی کا شعر جدید لباس میں اسی طرح زبان کی روانی کا یہہ حال ہے کہ دیوان کے سرسری مطالعہ ہی سے ولی کے ذوق شعر کا اثر دل پر جادو کی طرح ہونے لگتا ہے۔ سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں سے اگر سوں، منے، بولیا،

لہ (۱) ایضاً صفحہ ۴۶
(۲) " صفحہ ۱۰۶
(۳) " " ۷۸
(۴) ایضاً صفحہ ۸۴ غزل کی غزل ایسی ہی صاف اور رواں ہے
(۵) " " ۱۳۶

جیوں، دستائے، کوں، وغیرہ جیسے قدیم دکنی الفاظ نکال دئے جائیں یا انکی جگہ ایک آدہ جدید لفظ مثلاً کون کی بجائے کو، سوں کی بجائے سے لکھدیا جائے تو یہہ اشعار ایسے معلوم ہونگے گویا اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ دیوان کھولتے ہی غزل سامنے آتی ہے۔

اس سرو خوش ادا کوں ہمارا اسلام ہے　　　اس یار بے وفا کوں ہمارا اسلام ہے

لیتا نہیں سلام ہمارا حجاب سوں　　　اس صاحب حیا کوں ہمارا اسلام ہے

ناز و ادا سوں دل کو مرے مبتلا کیا　　　اس نازنیں پیا کوں ہمارا اسلام ہے

آرام جان و دل ہے ولی جس کا دیکھنا　　　اس جان دلربا کوں ہمارا اسلام ہے

اگر ان میں سے صرف سوں اور کوں کو سے اور کو سے بدل دیا جائے تو کون کہے گا کہ یہہ اشعار دو سو سال پُرانے ہیں۔

صنعتیں ولی کی صنعتیں بعض اوقات وجد آفریں نزاکت حاصل کرلیتی ہیں۔ وہ اس خوبی سے تشبیہ دے جاتا ہے گویا حُسن اور خیال کی تصویر لے رہا ہے۔

ولی اُس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی　　　مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آئے!

آفتاب آتا ہے محرم ہو کے تجھ کوچے طرف　　　صبح صادق اسکے بَر میں جامۂ احرام ہے!

شاعر کی اندرونی دنیا حضرات! اب میں شاعر کی ان خصوصیتوں کی طرف آتا ہوں جن کا تعلق شاعر کے باطن سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شاعری ایک قسم کی ساحری ہے۔ کہیں جادو مانگ لینا پڑتا ہے کہیں جادو جگانا پڑتا ہے۔ اس کمال کے لئے دل کی آنکھ ہمیشہ کھُلی رہنی چاہیئے۔ شاعر کی نظر میں کائنات ایک آئینہ ہے جس میں وہ ذرے ذرے کو حیرانِ حُسن اور گوشے گوشے کو جلوؤں سے منور دیکھتا ہے۔

قوت مشاہدہ قوت مشاہدہ شاعر کی اولین جادوگری ہے۔ یہہ دیوانہ، سادہ سی سادہ چیزوں میں ایسی خوبیاں دیکھ لیتا ہے جنکا دوسرے کو گمان تک نہیں ہوسکتا۔ قواعد کی رُو سے آپ تشبیہ اور استعارے کی کچھ بھی تعریف فرمائیں۔ میں اس قسم کی صنعتوں کو مشاہدے کی آذری کہونگا۔ جس طرح ایک خوبصورت قلمی نقش کیلئے رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح خیال کے نقش کے لئے صنعتوں کی رنگ آمیزی ضروری ہے۔ مصورِ رنگ

دیوان ولی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) صفحہ ۲۷۹
ایضاً صفحہ ۲۸۲
" " ۲۳۶

بھرنا قدرت سے سیکھتا ہے اور مشاہدے سے کام لیتا ہے، یہہ حال شاعر کا نہیں ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ کائنات کی لوح پر نقوش خیال میں رنگ بھرے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اسے اپنی جدت طبع استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس طرح شاعر نہ صرف مصور ہے، بلکہ موجد اور مخترع بھی ہے۔

سادگی کا زیور

صنعت گری شاعری کے لئے ہر وقت ضروری نہیں ہوتی، بعض وقت خود سادگی کو اس کا زیور بنانا پڑتا ہے۔ ولی کے ہاں کہیں سادگی خیال کے کرشمے ہیں کہیں سادگی زبان شوق کو جھولے جھلا رہی ہے نعت گوئی جیسے مشکل میدان میں شاعر کا یہہ "گیت" ملاحظہ ہو۔

(۱)
لامکاں پر بنا احمد جو بنا بُھلایا ۔ تب ملائک نے وہیں صل علیکم گایا
حور و غلماں نے ترانے سے وہ نغمے گائے ۔ قاب قوسین کا نغمہ ہے سبھی کو بھایا
نفخ براقی وہاں آدم سے لگا تا عیسیٰؑ ۔ اور جبریل امیں گوندھ کے سہرا لایا
حق نے "لولاک لما" حق میں محمدؐ کے کہا ۔ اُن سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ لایا
مغفرت تیری ولی سہل بلاریب ہے کیوں ۔ نام احمد کا جو لب پر ترے ہر دم آیا

شعر کے جدید رجحانات۔

شعر کے جدید رجحانات کے اعتبار سے قوت مشاہدہ اور قوت بیان شاعر کے لئے لازمی ہے قوت مشاہدہ ایک قسم کا الہام ہے، یہہ آنکھ کا نغمہ اور دل کی آواز ہے، شاعر کا باطن اور اسکی وسعت اسی آئینہ میں جھلکتی ہے۔ قوت بیان کے ذریعے پیام دل سینے سے لبوں پر آتا ہے۔ اور بعض وقت الہامی نغمہ بنکر انسان کے لئے فردوس گوش بنجاتا ہے۔ آیئے ایک قصیدے کی تشبیب میں ولی کی ندرت تخیل اور مشاہدہ، اسکے ساتھ معجز بیانی کا کمال بھی دیکھیں۔ اور اگر نظم قابل داد ہو تو اسکی داد دیں۔

(۲)
ہوا ہے خلق اُپر، پھر کہ فضل رحمانی ۔ کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی
تمام پات "یسبح بحمدہ" کے بہ حکم ۔ زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سُبحانی
ہر اک طرف جو ہوئی بسکہ ریزش باراں ۔ کیا ہے آج تفرج نے جوش طوفانی
اس آب رُوح فزا کے کمال لطف کو دیکھ ۔ چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے غیرت گوہر ۔ ہر ایک پات پہ برسا ہے ابر نیسانی
زہے بہار حلاوت، زہے بہار طرب ۔ کہ بلبلاں نے لیا، شیوۂ غزلخوانی

شہر سورت کی تعریف میں ولی کی ایک مشہور مثنوی ہے جس کا حوالہ کم و بیش جشن ہذا کے ہر مقرر نے

دیا ہے۔ آب و ہوا کی تعریف میں شاعر کے دو شعر مجھ سے بھی سماعت فرمائیے۔

(۳) شمیم حسن آب اسکی جگت میں کانپا ‌‌‌‌‌‌ ‌ سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا

کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر ‌‌ ‌ ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر

شیلے نے اپنی نازک ساعتوں میں کہا تھا۔

That Light whose smile kindles the universe.

آہ، شاعر کا یہہ خیال کائنات کو تبسم ہی کا ایک نور بنا دیتا ہے۔ حسن کے ذریعے ولی نے بھی یہہ رفعت ایک رباعی میں حاصل کی ہے۔ کہتا ہے۔

※ تجھ مکھ کا ہے یہہ پھول، چمن کی زینت ‌ ‌ تجھ شمع کا شعلہ ہے چمن کی زینت

فردوس میں نرگس نے اشارے سے کہا: ‌ ‌ یہہ نور ہے عالم کے نین کی زینت

تین مثالیں | شاعر کی نگاہ ایک شعلہ ہوتی ہے، شاعر کا دل کائنات کا سمندر ہوتا ہے، شاعر کی زبان زندگی کا پیام ہے۔ یہ شاعر، اپنی زلف، اپنی زندگی کی حد تک اپنے شعلے، اپنا سمندر اور اپنا پیام بنالیتا ہے تین مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

شعلہ نگاہ۔ (۱) آفتاب آتا ہے محرم ہو کے تجھ کوچے طرف ‌ ‌ صبح صادق اس کے بر میں جامۂ احرام ہے

(۲) اس کے مشتاق ہیں سب اہل زمیں اہل سما ‌ ‌ شوق کا جس کے لیا چرخ پہ خورشید علم

دل کا سمندر (۳) ہو کے غواص میں دریا میں بدن کے دیکھا ‌ ‌ صدف دل ہے حقیقت سے گہر کی محرم

دل کے دریا کو ترقی کے اُپرنت ہے نظر ‌ ‌ اسکی نسبت ہے سمندر سے ہر اک آن میں کم

زندگی کا پیام (۴) بد خصلتی کے گل میں نہیں بوئے عافیت ‌ ‌ گر عافیت کے ملک کی خواہش ہے سلطنت

خوش قسمتی کے ملک میں اے خوش خصال چل

کر مختصر جہان میں، دنیا کی جستجو ‌ ‌ اے بیخبر اگر ہے بزرگی کی آرزو

دنیا کی رہگزر میں بزرگوں کی چال چل

※ دیوان ولی ایضاً صفحہ ۳۷۳ ‌ (۱) دیوان ولی صفحہ ۲۸۱ ‌ (۳) دیوان ولی صفحہ ۳۶۷

ایضاً " ۱۹۱ ‌ (۲) " " ۲۹۹ ‌ (۴) " " ۳۲۵

کہتے ہیں کھول پردہ شناسان مدعا جو اوج میں ہوا کے اُڑے شاہباز ہے

زبان کی مشاطہ گری وؔلی نے کی۔ اور اس کمال سے کی کہ جو جو سامان آرائش اس نے استعمال کئے، وہی غازہ وہی رنگ، دیگر سخن آرایان ہند نئے انداز سے کام میں لاتے۔ وؔلی کے مختصر گیتوں میں میؔر کی سخن آرائی کے لئے اس قسم کا سوز، چستی، گداز، اور اختصار پایا جاتا ہے۔ کہیں ذوؔق کے لئے قصیدہ گوئی کے نمونے ہیں، کہیں **غالب** کیلئے اسکی خاص بندشں اور معنی آفرینی کے نقوش، اور کہیں خود جدید نظم نگاروں کے لئے نظم لکھنے کے خوبصورت مرقعے!

میؔر کے لئے

مجھکو تجھ بن کسی سے کام نہیں — فکر ناموس و ننگ و نام نہیں
زندگی جام عشق ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اس کا ہے ناتمام جسے — پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

غالب کیلئے

(۱) درد مندوں کو سدا ہے قول مطرب دلنواز — گرمی افسردہ طبعاں شعلہ آواز ہے
بزم کو رونق دیا ہے جب سے وہ عالی مقام — رشتہ آہ دل بے تاب، تار ساز ہے
(۲) غیر حیرت ہے خبر اس آئینہ رو کی کسے — راز کے پردے میں جس کی خامشی آواز ہے
دیکھنا آئینہ رو کا امر مشکل نئیں وؔلی — سد راہ سینہ صافاں، طالع ناساز ہے

خاتمہ | حضرات! مضمون طویل ہوتا جارہا ہے۔ بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ سنانا ہے، کلام وؔلی ایسا نہیں کہ ایک مختصر مضمون میں اسکی ساری خوبیاں اُجاگر ہو جائیں۔ اسکے لئے مکمل ریسرچ اور ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے، کاش کسی کو توفیق ہو۔ آخر میں **اتنا** عرض کرونگا کہ وؔلی کی پختہ کاری ہمارے لئے بار بار نہ صرف حیرت کا باعث ہوتی ہے بلکہ اس کی اُستادی کا ڈنکا بجاتی ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ نقش اول اور اتنا کامل! پہلا نغمہ اور اتنا بے نظیر! خصوصاً جبکہ وؔلی کی زبان ایسے دور سے متعلق ہو جس میں اُردو ہنوز عہد طفولیت میں تھی اور کسی کو شان گمان تک نہ تھا کہ یہ شوخ ایام جوانی میں شمالی ہندوستان جاکر زیور حسن و خوبی سے آراستہ ہو گی۔ مگر اپنے قدیم عہد **عافیت** کو بھلا دیگی۔ مبارک ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے پہلے پہل اس دُلہن کو سجایا، اُسے پری پیکر بنایا اور ہندوستان کی سیر کے لئے سراپا شوق بنا کر دوسری طرف

(۱) ایضاً صفحہ ۲۷۰ (۲) ایضاً صفحہ ۲۶۹

بھیجدیا۔ ولی نے اپنے ایک قصیدے میں غلط نہیں کہا تھا۔

یقیں ہے مجھکو کہ گر یہہ قصیدۂ رنگیں ” سُنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی“

میں قصیدے کی تخصیص نکال کر کسی قدر تبدیل کے ساتھ یہ عرض کرونگا۔

یقین ہے مجھکو کہ یہہ خوش ادا کلام ولی سُنیں تو وجد کریں، انوری و خاقانی!

ولیؔ دکھنی

از

مولوی بدالدین صاحب شکیب بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

جہاں میں زندۂ جاوید تیری دُرفشانی ہے
ترے اشعار سے رنگین اُردو کی جوانی ہے

دکن کے نام سے روشن جہاں میں نام ہے تیرا
زبانِ ریختہ کا عہدِ نو پیغام ہے تیرا

تیری طبع رواں پر شوخیٔ گفتار قرباں ہے
ترے طرزِ بیاں پر نطق گوہر بار قرباں ہے

تیری آواز اک بانگِ درا تھی کاروانوں کو
سخن آموز تھی تیری زباں سب بے زبانوں کو

تیری ہر سعی و کاوش میں تھا رازِ زندگی پنہاں
نقوشِ اولیں ہیں تیری سازِ زندگی پنہاں

ولیؔ! آ دیکھ تیری ابتدا کی انتہا کیا ہے
ولیؔ! آ دیکھ تیری داستاں کا ماجرا کیا ہے

ولیؔ! گہوارۂ علم و ادب ہے پھر دکن اپنا
ولیؔ! فردوس بر روئے زمیں ہے یہ چمن اپنا

ولی اور اُسکی شاعری

از

گارساں دتاسی

مترجمۂ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ریڈر تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

ہر قوم میں شاعر نثر لکھنے والوں سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ خیالات کی شوخی نظم ہی کے ذریعہ سے ظاہر کیجاسکتی ہے ردیف و قافیہ کی موزونی، ان لوگوں کے لئے جو کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یا جنھیں دماغ کاوی کی مشق نہیں ہے، باعث دلکشی ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی ہر قوم میں اعلیٰ درجہ کے شعرا کی قدر اسی قوم کے مورخوں یا فلسفیوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر کے کلام سے ہر کس و ناکس محظوظ ہو سکتا ہے، اور آخر الذکر کی تصانیف کو صرف وہی پڑھتے ہیں جنھیں مطالعہ کا شوق ہے۔

ہندوستان میں قدیم زمانے میں نیز عہد وسطیٰ و جدید میں یہ بات محسوس کیگئی کہ عوام الناس کو خطاب کرنیکا بہترین ذریعہ شاعری ہی ہے اسی سے ان میں اعلیٰ جذبات پیدا کئے جاسکتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مذہب و تمدن کے خیالات قانون و فلکیات اور غرضکہ ہر وہ چیز جس کا علم حاصل کرنا مفید ہو سکتا ہے، عوام کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ قدیم ہند کی تمامتر سنسکرت کتب نظم میں ہیں۔ ہندوی (ہندوستانی) کی تمام کتب بھی نظم میں ملتی ہیں۔ یہ زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہے اور اس زبان میں آپ کو ہندوستان کی جدید ادبیات ملیگی۔

مسلمانوں نے خاصکر اس زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انھوں نے اس زبان کی شاعری کے ذریعہ فلسفہ و حکمت کے مسائل عوام کے سامنے پیش کئے۔ انھوں نے اس زبان میں خدا کی حمد و ثنا کے گیت گائے۔ یہ حمد و ثنا اپنا ایک مخصوص انداز رکھتی ہے جو وید مقدس اور قرآن مجید کے انداز سے مختلف ہے۔ چنانچہ سودا نے کہا ہے:-

زاہد و پیر مغاں برہمن و شیخ اے یار ۔ دل میں کہتے ہیں ترے ہاتھ سے غم چاروں ایک

یا جیسے ولی نے کہا ہے:-

ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب
ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب

تماشا دیکھ اے لیلی کہ تیرے غم کی گردش میں
بگولے کی نمط پھرتا ہے مجنوں خوار ہر جانب

ولی جنت میں رہناں نہیں درکار عاشق کوں
جو طالب لامکاں کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

ہو کے غواص میں دریا میں بدن کے دیکھا
صدف دل ہے حقیقت سوں گہر کی محرم

اس شاعری کا مقصد انسان کو روحانی کیف سے آشنا کرنا ہے اور اسکو ذات حقیقی سے وابستہ کرنا ہے جو تنہا باقی ہے اور سب کچھ فانی ہے۔ جیسا کہ ولی نے کہا ہے:۔

جز اسکی ذات اور کسی کو نہیں ثبات
ہے قابل ممات یہ جتنی ہے کائنات

ان حقایق کے ثبوت کے لئے علم ریاضی سے مدد نہیں ملسکتی بلکہ ان میں یقین حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع ہیں۔ چنانچہ ولی نے کیا خوب کہا ہے:۔

حکمت عشق بو علی سوں نہ پوچھ
نیں وہ قانون شناس اس فن کا

حکمتاں کی سب کتاباں دہو سئے یکبارگی
گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

عالماں سوں پوچھیا ہوں میں اکثر
عقدۂ دل کوں نہیں کیا ہے حل

یہ شعرا ہمیں مجاز کے راستہ سے حقیقت کی طرف لیجاتے ہیں۔ حُسن مجازی کی جو تصویریں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں وہ استعاروں کے رنگ و روغن سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ حُسن ازل کبھی عورت کی صورت میں یا کبھی نوجوان لڑکے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس پر جذبات کو ابھی غلبہ حاصل نہیں ہوا، جو سادہ اور معصوم ہے اور اسکی جبلت فطرت کی آغوش میں تربیت پائے ہوئے ہوتی ہے۔ اس نوخیزی کے زمانے میں اس کا جسم تندرست اور پاک ہوتا ہے۔ اس کی چہرے

کی جلد ابھی سخت نہیں ہوئی۔ اور غم روزگار سے ابھی جھریاں نہیں پڑیں۔ اس ضمن میں اس کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اہل مشرق بجائے عورتوں کے نوخیز لڑکوں سے اظہار محبت کیوں کرتے ہیں۔ اس رسم کا تعلق عہد قدیم کی بد اخلاقیوں سے مطلق نہیں جن سے مسیحی یورپ بھی کلیتہً ناآشنا نہیں رہا۔ ان بد اخلاقیوں کی مذمت مسلمانوں کے مذہب میں بھی اسی طرح کی گئی ہے جس طرح مسیحی مذہب میں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اہل ایشیا کے نزدیک اخلاق کوئی بے معنی لفظ نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ شعرا نے یہ رسم اسلئے اختیار کی کہ مسلمانوں کی مستورات گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتی ہیں۔ ان سے دلفریب حسن کی حریف کوئی اجنبی آنکھ نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی شریف عورت کے متعلق کوئی شاعر کچھ لکھدے تو اسے بڑی بے عزتی سمجھا جائیگا۔ اور اغلب گمان اسکا ہے کہ اس عورت کا شوہر یا باپ یا بھائی شاعر صاحب کی درگت بنائیگا اور اس قسم کی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ چنانچہ شاعر بیچارے کے لئے اسکے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ وہ بلا کسی بدنیتی کے در حدیث دیگراں اپنے جذبات کو ظاہر کرے جس طرح اگر کوئی یورپین شاعر کسی بچے کے حسن کا ذکر کرے تو کسی شخص کے احساس پر ٹھیس نہیں لگیگی۔ اسی طرح اگر ایشیائی شاعر یہ طرز اختیار کرے تو اسکو مورد الزام نہیں قرار دینا چاہیئے۔ میں نے جن مسلمان اہل علم وفضل سے اس باب میں گفتگو کی ہے انھوں نے اسکے یہی اسباب بیان کئے۔ لیکن امرد پرستی صرف غزل تک محدود ہے جو ہمارے یہاں کے songs (گیتوں) سے ملتی جلتی ہے۔ مثنویوں میں جہاں شاعر عشق ومحبت کی کوئی داستان یا تاریخی حالات بیان کرتا ہے، تو یا تو تاریخی نسوانی کیرکٹر اسکے پیش نظر ہوتا ہے یا وہ اپنے دماغ سے قصّے کی ضرورت کے مطابق اپنی ہیروئیں (heroines) پیدا کر لیتا ہے۔ ان مثنویوں میں شعرا حُسن نسوانی کی ہر ادا اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ باید وشاید۔

ہندوستان کے مُسلمانوں کو اصناف شعر میں غزل سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ صنف شعر ہمارے odes (گیت) سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ یہ کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان سب اشعار میں ردیف وقافیہ کی پابندی کیجاتی ہے۔ آخر کے شعر میں شاعر اپنا تخلص بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ شاعر اپنی غزلوں کے مجموعے کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے جسے دیوان کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلوں کے ماسوا قصیدے، مثنویاں، ترجیع بند اور مخمس، رباعیات اور ابیات بھی شامل کر دی جاتی ہیں۔ میں اسوقت اہل علم کے سامنے ولی کے اسی قسم کے مجموعہ کو پیش کر رہا ہوں۔ یہ مجموعہ ابتک طبع نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان کے اور دوسرے صاحب دیوان شعرا کے مقابلے میں ولی کو ایک خصوصیت حاصل ہے جسطرح جے۔ بی روسو[1] کے گیت فرانسیسی ادبیات میں امتیاز رکھتے ہیں۔ اسی طرح ولی کا کلام ہندوستانی زبان میں ہے۔

(۱) پیرس میں ۱۶۷۱ء میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۷۴۱ء میں انتقال کیا۔

ولی نے اور دوسرے شعرا کی طرح بہت زیادہ نہیں لکھا اور اس نے اسکی وجہ حُسن انداز سے بتائی ہے اسمیں خود نمائی کی جھلک ہے، جو عام طور پر مشرقی شعرا میں پائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

ولی دیوان میں میرے تو وہ دفتر کی حاجت نہیں ۔۔۔۔۔۔ کہ مجھ دیوان میں ہر یک شعر سو دفتر برابر ہے

کلکتہ میں ابھی قسم کے تین دیوان شائع ہوئے ہیں۔ کلیات میر تقی، انتخاب سودا، اور دیوان سوز۔ اگرچہ ان کتابوں میں نہ تمہید ہے اور نہ حواشی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ انکی خوب قدر ہو رہی ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ ولی کے دیوان کو بھی ہندوستانی ادبیات کے شائقین ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ جنکی کثیر تعداد فرانس اور انگلستان میں موجود ہے۔ اسکے ذریعہ سے اسلامی ہند کے ایک بڑے شاعر کے طرز نگارش سے لوگوں کو واقفیت حاصل کرنیکا موقع بہم پہنچے گا۔

ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا اور ولی تخلص۔ اسکے ہمعصر اسے ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانتے ہیں اور اسے ہندوستانی شاعری کا آدم خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ "بابائے ریختہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے :-

ولی ہی زالیٔ ملک سخن ہے ۔۔۔۔۔۔ ہوا جوں خادم شاہ ولایت

گرچہ منصب میں وہ ہزاری ہے ۔۔۔۔۔۔ فوقیت لے گیا ہوں بلبل سوں

ولی غالباً سورت میں پیدا ہوئے جسے ہندوستان کے مسلمان باب المکہ کہتے ہیں۔ میں نے یہ قیاس اسواسطے قایم کیا کہ وہ شہر سورت کا محبت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی میں اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔
اس کے کلام کا بیشتر حصہ سترھویں صدی کے وسط میں لکھا گیا۔ اس کا قیام کبھی سورت میں، کبھی گجرات کے دوسرے شہروں میں اور کبھی دکن میں رہا۔ چنانچہ اس نے اسکی نسبت یوں ذکر کیا ہے :-

ولی ایران و توران میں ہے مشہور ۔۔۔۔۔۔ اگرچہ شاعر ملک دکن ہے :

ولی پروانگی کرتا تری مُلک دکھن بھیتر ۔۔۔۔۔۔ یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس

شہر ستارا کا وہ اس طرح ذکر کرتا ہے :-

لیا ہے گھیر تجھ زلفاں نے تیرے کان کا موتی | گر یو ہند کا لشکر لگیا ہے جا ستارے کوں

معلوم ہوتا ہے کہ ولی بنگال میں کچھ دنوں رہے۔ بنگال کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

ہوا ہے رنگ بنگالہ تیرے نرگس کے جادو سوں | معطر ہے سواد ہند تیری زلف کی بو سوں
اس انکھیاں ہور زلف کا دیکھیا ہے ازبس جو طلسم | شعر تیرا اے ولی یو سحر بنگالا ہے (۱)

غالباً ولی نے کچھ زمانہ دہلی میں بھی گذارا۔ اپنے بعض اشعار میں وہ جمنا کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرے دریاؤں پر اسکو ترجیح دیتے ہیں۔

زلف تیری ہے موج جمنا کی | تل نزیک اس کی جوں سناسی ہے

اپنے وطن گجرات سے دوری کا اس طرح شکوہ کیا ہے:-

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل | بیتاب ہے سینے میں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اسکی زخم کا جہاں بیچ | شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے نگار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں | پھر اسکے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

A

علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں ولی کی نسبت صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "شمس ولی اللہ گجرات کا باشندہ ہے اور دکن کے شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد میں ہندوستان (شمالی ہند) آیا تھا اور عالمگیر نے اسکو نوازا تھا۔ ولی ہندوستانی زبان کا مشہور استاد ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جسنے دکھنی زبان میں شعر کہا اور ایک دیوان چھوڑا جو قابل ذکر ہے۔" اس مختصر ذکر کے بعد علی ابراہیم خاں نے ولی کے اشعار کے نمونے پیش کئے ہیں جو تین صفحات پر مشتمل ہیں(۲)۔ مصحفی نے اپنے "تذکرہ شعرائے ہندی" میں ولی کا ذکر نہیں کیا۔ اور بینی نرائن نے اپنی کتاب "دیوان جہاں" میں ولی دکھن کو اسکے ہم نام مرزا محمد ولی دہلوی سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ اور ولی دکھن کے اشعار کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں ولی نے عقاید کے اعتبار سے اامیوں اور سنت جماعتوں کے درمیان کی راہ اختیار کی تھی۔ وہ خلفائے راشدین کے متعلق جہاں ذکر کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنت جماعت سے تعلق رکھتا ہے

---

(۱) اس شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ولی بنگال میں رہے تھے۔ بنگال کے جادو کا عام طور پر شعرا کے ہاں ذکر ملتا ہے۔ (مترجم)
(۲) میرے ذاتی کتب خانہ میں ولی کے کلام کے دو نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر ٹرنر میکن کا ہے جنہوں نے شاہنامہ شایع کیا ہے اور دوسرا میرے عزیز دوست کپتان ٹرائیر نے میرے لئے نقل کروایا ہے۔

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ کا جب کبھی وہ تذکرہ کرتا ہے تو اس کا انداز شیعوں یا امامیوں کی طرح ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ولی نے اہل علم کی طرح اپنی خودداری کو قایم رکھا اور اپنے اشعار کو والیان ملک کی تعریف سے ملوث نہیں کیا۔ اس باب میں وہ میر تقی، میر حسن اور سودا سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تینوں شاعر ولی کے بعد بہت مشہور رہے انھوں نے شاہان دہلی، نوابان اودھ و بنگال کی تعریف میں جو قصیدہ خوانی کی ہے وہ مبالغہ سے مملو ہے۔

معلوم ہوتا ہے ولی کو اہل یورپ کی حُسن کاری کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے اس کا ذکر کیا ہے:۔

تری صورت کہ یو رشک چمن ہے   ہوے ہیں رنگ تصویر فرنگ دیکھ

ولی کے شاگردوں کا علی ابراہیم نے ذکر کیا ہے۔ انمیں سے ایک معز خاں تھے جن کا تخلص عمر تھا۔ موصوف دکن میں کسی اہم عہدہ پر ممتاز تھے اور اپنے ہمعصروں میں شاعر کی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ولی کی شاعری میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہم اسے حافظ شیرازی سے مشابہ قرار دیسکتے ہیں۔ اسمیں حافظ کی خوبیاں اور نقائص دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلامی صوفیائے کے انداز میں شاہد و شراب کے ذکر میں وہ بڑے بڑے مسائل بیان کرجاتا ہے۔ مثلاً:۔

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف   رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں مسجود سوں کیا نسبت ہے   اولیٰ ہے کہ مائل ہو توں موجود طرف

پایا ہے جو کوئی دولت فقر: مشتاق نہیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کوں شان دولت   چاکھیا جو مزا قلندری کا

بالخصوص نعت میں وہ تصوف کی باتیں بیان کرتا ہے:۔

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے   ہو فنافی اللہ دایم یادیزدانی کرے:
مرتبہ خُلت پناہی کا وہ پاویگا جو کوئی: مثل اسمٰعیل اول جیو کی قربانی کرے:
وہ چہ پاوے مطلب راضیتہً مرضیتہ   محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے

اپنے اشعار کی نسبت خود اس کا یہ خیال ہے:۔

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی　　　باہر ہے تری فکر رسا حد بشر سوں

ولی کی مذہبیت اسکی پاک باطنی کی آئینہ دار ہے اس میں ریاکاری کو دخل نہیں۔ ولی کے کلام کا تین چوتھائی حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ چند مستزاد، ترجیع بند، مثنویاں اور قصیدے بھی ہیں۔ اس نے مخمس اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ اور الگ الگ ابیات بھی ملتے ہیں۔ ولی کا انداز تحریر سلجھا ہوا ہے۔ اسکے کلام میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ در اصل اسکے بعد کے آنیوالے ہندوستانی شعراء نے بڑی حد تک اس کا تتبع کیا ہے۔ ولی کو اپنے کلام کی صفائی اور فصاحت کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اشارۃً اس نے کہا ہے:-

اے سکندر نہ ڈھونڈ آب حیات　　　چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

شروع میں میرا خیال تھا کہ ولی کے کلام پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے حواشی لکھوں اور ساتھ ہی ساتھ مشکل اشعار کی تشریح بھی کروں۔ لیکن ولی کے کلام کا مسودہ ایک سال سے مطبع میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر اپنے ارادہ کی تکمیل کروں تو اور زیادہ تاخیر ہوگی۔ اسلئے فی الحال "دیوان ولی" کو شائع کرتا ہوں۔ باقی کام پھر دیکھا جائیگا۔ میرا خیال ہے اسکے کلام کی تشریح اور لسانیاتی حواشی کو علیحدہ جلد میں اسی تقطیع پر بعد میں شائع کروں۔ تقطیع اور کاغذ وہی رہیگا جو دیوان ولی کا تاکہ بعد میں جو کوئی چاہے ان دونوں جلدوں کو ایک ساتھ ملالے۔ ان حواشی میں ہر غزل کے ان غیر مانوس الفاظ کی تشریح کرونگا جو خالص دکنی ہیں اور جو ہندوستانی کی عام لغتوں میں نہیں ملتے۔ ساتھ ساتھ مشکل تشبیہوں اور استعاروں کی تشریح کردیگئی ہے۔ جہاں میں نے ضرورت سمجھی وہاں قلمی نسخوں کے حوالے بھی دیئے ہیں اور متن کے اختلافات بتلائے ہیں۔ میں نے ولی کے کلام میں سے صرف ان حصوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ پیش کیا ہے جنکے متعلق میں نے سمجھا کہ وہ ہمارے اہل ملک کی دلچسپی کا باعث ہونگے مکمل ترجمہ اسلئے غیر ضروری تھا کہ ولی کے ہاں الفاظ کو بہ نسبت خیالات کے زیادہ اہمیت ہے۔ کسی یورپین زبان میں پورے کلام کا ترجمہ بیکار ہوگا اسلئے کہ پڑھنے والا اس سے اکتا جائیگا اور بجائے لطف اندوز ہونے کے پریشان ہو جائیگا۔ اسلئے کہ مشرقی شعراء ایک ہی خیال کو مختلف اندازوں سے الفاظ الٹ پھیر کے بیان کرتے ہیں۔

میں نے حتی الامکان صحیح متن پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ صرف اُن حصوں کو مقابلہ کرکے اس جگہ شائع کیا ہے جو مختلف قلمی نسخوں میں موجود تھے۔ اس کام میں میرے پیش نظر چھ مختلف قلمی نسخے تھے۔

ان چھ نسخوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا ہاؤس لندن، کے دو نسخے بھی میرے پیش نظر رہے۔ بعض صورتوں میں مسٹر

شیکسپیر کے مشورہ سے بھی ہیں اسی ضمن میں مستفید ہوا۔

اس تمہید کو ختم کرنے سے قبل ہندوستانی ادب کے اُن شایقوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چونکہ انھوں نے ابتک شمالی ہند کے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسواسطے ممکن ہے کہ وؔلی کے کلام کے دکھنی اور ہندی الفاظ انھیں غیر مانوس معلوم ہوں۔ وؔلی کی زبان خالص ادبی نقطۂ نظر سے شمالی ہند کی زبان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانی ادب کے یورپین شایقین نے اسکی طرف ابھی توجہ کم کی ہے (مقدمہ دیوان وؔلی مرتبہ دی تاسی)۔

ولی میر

(از)

مولوی ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم ۔ اے لکچرار اُردو سٹی کالج

[اس نظم کے مطلع میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جدید تحقیقات کے رُو سے اب معتبر نہیں رہا۔ لیکن ایک زمانے تک یہ مشہور تھا کہ میر تقیؔ کا مزار اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کی نذر ہو گیا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے مطبوعہ "انتخاب میرؔ" میں نور الرحمٰن صاحب نے بھی اِس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی (مرحوم) کے ایک شعر میں بھی اِسی روایت کی جانب تلمیح ہے ؎

کہتے ہیں قبر میری ریل میں آجائیگی
مر رہتا ہوں جو اِسی راہ میں، مدفن بھی سہی

میری شاعرانہ مصلحت نے اِسی روایت کو مفید مطلب سمجھ کر، داخل مطلع کیا ہے۔]

ریل کی پٹڑی کے نیچے میرؔ گڑ کر رہ گیا
اور وؔلی بیچارہ کھڑکی سے بچھڑ کر رہ گیا (اورنگ آباد)

اِک دکن سے جاکے، دہلی میں جگت اُستاد تھا
لکھنؤ میں ایک، دہلی چھوڑ کر، آباد تھا

ہے وہ لایعقل جو منکر ہے، دکن کے پیر کا
آپ بے بہرہ ہے جو قائل نہیں ہے میر کا

یہ ولایت، اور، میری، سب کو یاں ملتی نہیں
لاکھ سودا ہو یہ "مرزائی" یہاں چلتی نہیں

جو قلم کا ہے دھنی، اُس کا جہاں میں راج ہے
خالی پیلی کی ولایت کل نہیں، گر آج ہے

ہے زباں اُردو کی جب تک، یہ رہیں گے سربلند
گردشِ ایام انہیں پہنچا نہیں سکتی گزند

میرؔ جو ہے، ہے "وؔلی" اور جو وؔلی ہے "میرؔ" ہے
میری نظروں میں برابر دونوں کی توقیر ہے

ہمارا قومی شاعر

(از)

جناب مانک گرو وہن سنگھ سہانی صاحب بی۔ اے۔ ام بی ایس ایس۔ ایف آر ایس اے

مترجمہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔ مددگار سٹی کالج

اردو زبان کے شاعر ولی کا کلام پہلی دفعہ جرمنی میں شائع ہوا۔ ادر کئی سال قبل ڈاکٹر نکولا زپر نامی ایک ممتاز جرمن فلسفی کراچی میں مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ہم نے اسلامی فلسفہ، ہندوستان کے مسائل اور آجکل کی زندگی میں مذہب کے موقف پر گفتگو کی جسکا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس جرمن فلسفی نے کھڑکی میں سے چاند کی طرف نظر ڈالی اور پھر میری طرف پلٹ کر کہا:۔

"میری جیب میں ایک ایسے پرستار محبت کی چھوٹی سی کتاب ہر وقت رہتی ہے جسے ہماری قوم پوجتی ہے میں جہاں جاتا ہوں یہ میرے ساتھ رہتی ہے"

وہ کتاب ایک دیوان تھا اور وہ پرستار محبت گوئٹے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کیا ہمارے ہندستان میں کوئی ایسا پرستار محبت نہیں پیدا ہوا، جس نے باعظمت ترانے گائے ہوں؟ لیکن کتنے افراد ایسے ہیں جن کے دلوں میں اُس کی یاد محفوظ ہے۔ اہل اطالیہ کو بھی اپنے ایک پرستار محبت پر ناز ہے۔ ڈانٹے اطالیہ کا قومی شاعر ہے۔ انگلستان میں براوننگ سبھا ہی اور شیلی انجمنیں قائم ہیں، لیکن ہمارے تعلیم یافتہ افراد میں سے کتنے ایسے ہیں جو ہمارے اردو شاعر ولی سے واقف ہیں۔

سطح مرتفع دکن کے ایک گوشہ میں جو آفتاب کی حدت کی وجہ سے ہمیشہ تپتا رہتا ہے۔ ہمارا وہ اردو شاعر پیدا ہوا۔ جس کی حیات اور نغموں نے اُس کے نام کو مقدس بنا دیا ہے۔ لیکن کتنے اردو بولنے والے سندھی نہیں بلکہ ہندستانی۔ اُس سے واقف ہیں؟ یہاں کے کالجوں میں متعدد مضامین کی تعلیم ہوتی ہے لیکن نہیں ہوتی تو اردو ادب کی۔ ایران کے سرآوردہ صوفی شاعر حافظ شیراز اور مولانا روم کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے، لیکن ولی کا کلیات نہیں پڑھا جاتا۔ جامعوں میں متعدد مضامین کے لئے جدا جدا مستقل پروفیسر مقرر ہیں۔ لیکن اردو شاعری کا کوئی پروفیسر نہیں ہے (میری مراد جامعۂ بمبئی سے ہے) اس کے باوجود وہ ہمارے دلوں کا بادشاہ ہے۔

ہمارا خسرو بے تاج ہے، کیونکہ وہ غریبوں کے دلوں میں رہتا ہے۔

وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور رہا۔ اُس کی زندگی خود ایک راگ تھی۔ وہ فطرت کی تمام چیزوں میں خدا کا جلوہ دیکھتا تھا۔ اور حُسن کا پرستار تھا۔ اُس نے ایک راہب کی طرح سوگوار زندگی نہیں بسر کی۔ اُسکی زندگی ایک روحانی زندگی تھی اور اس لئے عطر بیز، پُرلطف اور عشق فطرت کی دولت سے مالا مال تھی۔ تعلیم یافتہ، خود غرض، دنیادار اور چالاک لوگوں نے اُس کو اور اُس کے کلام کو دل سے بھلا دیا ہے، لیکن غربا اُس کے گیت گاتے ہیں۔ راستوں پر بھیک مانگنے والے فقیر اور فاقہ کش سائل اور کھیتوں میں کام کرنیوالے کسان اور پنگھٹ سے پانی لانے والی دوشیزہ لڑکیاں، ولی کو اپنا راجہ اور اوتار سمجھتی اور اُس کے گیت گاتے ہیں۔ بسمارک نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اُسکی زندگی ناکام تھی! اُسوقت اُس کے ذہن میں وہ تمام لڑائیاں تھیں جو اُس نے کیں گویا اس امر کا اعتراف کر رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کی زندگی کو المناک کر دیا۔ غریب ولی کے کلام کے دل دادہ ہیں۔ اُس نے اپنے گیتوں سے اُن کے دل شگفتہ کر دیئے۔ ولی کے کلام کے سکون بخش اور متصوفانہ عناصر ہندوستان، پنجاب اور خاص کر حیدر آباد کے سادہ دل لوگوں کو بہت پسند آتے ہیں تعلیم یافتہ افراد جذب منفعت، نفس پرستی یا ایک میکانی دماغ کے ظاہری تصورات میں غرق ہیں۔ لیکن دیہاتی متصوفانہ خیالات کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔ حضرت ولی مفلسوں کے دلوں میں براجمان ہیں۔ کیا یہ کسی شاعر کی عظمت کا اہم ثبوت نہیں ہے؟ ولی ایک ایسا شاعر ہے جو تخلیقی قوت کا مالک ہے۔ اُس کا کلام صرف احساسات اور موسیقی کا نہیں بلکہ فلسفے کا بھی حامل ہے۔

ولی ایک بلند پرواز شاعر ہے، اور بلند پروازی تخلیقی قوت کا دوسرا نام ہے شعر کے چار اعلیٰ محرکات (۱) فطرت (۲) حب وطن (۳) محبت (۴) مذہب ہیں۔ ولی کی نظموں کو آسانی کے ساتھ ان چار اہم شقوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان چاروں قسموں میں سے ہر ایک میں آپ کو نمایاں تخلیقی حُسن اور ایک روحانی شائستگی نظر آئیگی۔ اُس نے فطرت کے متعلق کیسی کیسی پیاری باتیں کہی ہیں! اُس کے نزدیک مادہ حُسن کا آئینہ ہے اور وہ پرندوں اور جانوروں کا ذکر اپنی نظموں میں کس قدر لطف اور آگہی کے ساتھ کرتا ہے۔ ولی ان کا گرویدہ تھا اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بھی اُس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہونگے۔ ولی جنگلوں اور ستاروں، کوہسار و پہاڑوں ندیوں اور چشموں کے مرقعے ایسے لطف کے ساتھ پیش کرتا ہے، جو محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو نوجوان حب وطن کی زیادہ بہتین صداقت کے متلاشی ہیں، ولی کا مطالعہ کریں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُس کا کلام وطن دوستانہ ادب میں خاص طور پر ولولہ انگیز ہے۔

ولی کے نزدیک عشق و محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اکثر جدید ادیبوں کی طرح اُسکے ذہن میں عشق کا مفہوم ایک نرے جنسی جذبہ تک محدود نہیں ہے۔ ولی کے نزدیک محبت کے معنے جذبۂ ایثار کے ہیں عیش و عشرت نہیں بلکہ ایک جہاتی زندگی۔ عاشق اگر اپنے مطلوب سے ملنا چاہے تو اُسے پہاڑوں کو عبور کرنا پڑتا ہے، یا اگر اُس کے درشن کے لئے بے تاب ہو تو اس سے بھی زیادہ

اندھیری رات میں ایک گہرے اور تاریک دریا کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ولی کا عشق صوفیوں کے عشق کی طرح گہرا ہوتا ہے۔ اپنے محبوب کی تلاش میں وہ خدا کو اپنا راہبر سمجھتا ہے، اور اس اعتقاد کی بنا پر کہ رنج و ملال بھی ایک آسمانی عطیہ ہے، اس کو رنج و مصیبت میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ اس کی سرگردانیوں میں ایک ایسی کیفیت ہے جو سچ پوچھئے تو مجھے پدماوتی کی سرگردانیوں کی باعظمت داستان میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس اردو شاعر نے اپنے افسانوں میں ایک ایسی محبت کے خواب بیان کئے ہیں جنکی تعبیر دنیا سے قطعی کنارہ کشی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ولی کے حزنیوں میں سکون آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت توحید کے ایک اعلیٰ تصور کا الہام ہے۔ ولی ایک حقیقی صوفی ہے۔ وہ زندگی کے حزن و ملال، حسن و دل کشی اور کشمکش اور ناکامیوں کو سمجھتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ان تمام میں ایک روحانی قوت کارفرما ہے۔ ولی کی شاعری میں ایک صحیح روحانی تصور کی تجلی ہے۔ یہ ویدانت اور اعلیٰ اسلام کا تصور ہے۔ یہ ہندستان کا تصور ہے، ایشیائی دنیا کا تصور ہے۔ یہ ہمہ اوست کا مسلک ہے۔ مشرق کو وحدانیت کے اس باعظمت علمبردار کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب دینی پیشواؤں کے حرص و آز اور فرقہ بندی سے بلند و بالا ہے۔ وہ محبت کے اعلیٰ تر مذہب کا حسن دیکھتا ہے جو تمام مذاہب کی تہ تک پہونچ جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندستان کا یہ مسلم شاعر ایک رشی کی طرح محترم ہے۔ اس کی آنکھیں غیب کے جلوے دیکھتی ہیں، اس لئے وہ ہمارا "بادشاہ" ہے۔ ہمارا خسرو بے تاج۔ کیا غیب داں ہمارے حقیقی بادشاہ نہیں ہیں؟ سلطنتیں دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح فنا ہو جائینگی لیکن حضرت ولی کا اقتدار قائم و دائم رہیگا۔ اس کی تعمیر مفلسوں کے دلوں میں تصور کی تخلیقی قوت سے ہوی ہے۔ اس اردو شاعر کے ان الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فرقہ بندی کو ترک کردو اور عجز و انکسار سیکھو۔ میرے خیال میں اتحاد اور ترقی کے لئے ہندوستان کو آج ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے۔

یہی وہ تعلیم ہے جو ولی کے کلام میں نغمہ کے روپ میں جلوہ گر ہوی ہے۔ سندھ، پنجاب، اور دوسرے صوبوں کے متعدد علاقوں میں جہاں مروجہ تعلیم نے چالاکی اور ہوسناکی کی وبا نہیں پہونچائی ہے، ولی کی نظموں نے ہندو مسلم اختلافات دور کردیئے ہیں۔ ہزارہا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یہ "شاعر صحرا" فی الواقع ایک مسیحا ہے۔ اور وہ اس کے گیت گانے کے لئے میلوں اور تیوہاروں میں یکجا ہوتے ہیں۔ ولی کے کلام میں میرے اکثر ہم وطنوں کو ایک ایسی دولت ملتی ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی دولت بے حقیقت ہے۔ ایک حسن، دریا کنارے رنگ برنگ کے پھولوں کے مماثل۔ ایک مذہب جو بیسیوں سال سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ہمدموں کی طرح مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ حضرت ولی کی نظموں میں نسلی، قومی اور ملکی اتحاد

۲۲۸۸۷ یادگار ولی از سید محمد

کے ہزار ہا جلوے ہیں۔

میرے لئے یہ امر باعث تعجب نہیں ہے کہ ہم دن بدن فسیتی، بربادی اور ابتری کی طرف جا رہے ہیں۔ ناقص تعلیم اور سیاسیات کے غلط مطالعے نے نوجوانوں کے دلوں پر تقلید کے نقوش مرتسم کردیے ہیں، اور تقلید اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مماثل ہے۔ تم نے خود اپنی روایات اور تمدن کے تصور کو بے رحمی کے ساتھ روند ڈالا ہے، اور اب بھٹک رہے ہو۔ تم اپنی روح کی تربیت سے منھ موڑ کر ایک سیاست زدہ تمدن کی طرف متوجہ ہو گئے ہو۔ اس نا تمنا ہی تقلید میں تمھاری "تعلیم" ممکن ہے تمھیں "چالاک" بنا دے۔ لیکن یہ تمھیں خود اظہاری کی دولت اور حسن سے سرفراز نہیں کر سکتی۔

اے نوجوانو! میں تم سے ولی کے کلام کے مطالعہ کی درخواست کرتا ہوں۔ تمام سندھی اور ایرانی اور اردو شاعروں نے جس حُسن، اتحاد اور محبت میں اپنے گیت اور افسانے بنائے ہیں، میں اُن کے محاسن کے ایک جدید معیار سے مطالعہ کی اپیل کرتا ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ ان کا کلام تمام قوموں کے لئے اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے، وہ مذہب اور حُسن کو ایک دوسرے میں سمونے میں مدد دینگے جس سے ہندستان کے لئے ایک جدید تمدنی تہذیب کی اساس وجود میں آئیگی۔ اور وہ قوم کے نونہالوں کو سمجھائیں گے کہ تعلیم مُرجھائی ہوئی پتیوں کو جھاڑنے کا نام نہیں، بلکہ علم کے درخت کی پرداخت کا نام ہے، جس کا ثمر محبت ہے۔

---

٩٢٨ ٤٩١٤٣
د ل ی - م

ولیؔ

(از)

صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکشؔ (عثمانیہ)

اے دکن کی سرزمین، اے قبلۂ ہندوستاں
تیرے ذرّے مہر ہیں، تیری زمیں ہے آسماں

عظمتِ ماضی کا دل افروز نظارہ ہے تو
مشرقی تہذیب کا پاکیزہ گہوارہ ہے تو

تیرے ہر پہلو میں ہیں احساس کی بیداریاں
تیرے ہر منظر میں ہیں جذبات کی سرشاریاں

ہے خزاں ناآشنا تیرے گلستاں کی بہار
تجھ پہ ہے سایہ فگن، آمرزشِ پروردگار

تیرا دریائے کرم کرتا ہے گوہر بیزیاں
تیرے خطّے سے ہوا کرتی ہیں مردم خیزیاں

جو، جواہر تو نے چمکائے ہیں اپنی خاک سے
ان کا سینہ بھر دیا ہے جلوۂ ادراک سے

وہ ولیؔ، تیرا ہی اک فرزند ہے خاکِ وطن
جس کے ہونٹوں نے کیا اردو میں آغازِ سخن

روح ہے جس نے بھری اردو کے خالی جام میں
اک حدیثِ کیف ہے جس کے ہر اک پیغام میں

دامنِ اردو کو جس نے کر دیا گلشن بدوش
جس کے اعجازِ بیاں سے جاگ اٹھے اربابِ ہوش

اک حیاتِ نو عطا کی جس نے موجودات کو
اک نئی روحِ طرب دی جس نے محسوسات کو

اس فضائے آب و گِل کو نور جس نے کر دیا
ذرّہ ذرّہ کو جوابِ طورؔ جس نے کر دیا

سوز کی رنگینیاں برسائیں جس نے ساز سے
جگمگا اٹھے ستارے جس کی ہر پرواز سے

جس کے نقشِ پا کا ہر ذرّہ منور ہو گیا
جس کے ہر آنسو کا قطرہ رشکِ گوہر ہو گیا

نقطۂ انجام جس کا مرکزِ آغاز تھا
جس پہ تجھ کو ناز ہے اور تجھ پہ جس کو ناز تھا

ولی کی اہمیت

از
مولوی شیخ چاند صاحب مرحوم ام اے۔ ال ال بی۔ ری سیرچ اسکالر

[یہ اس مضمون کا صرف ابتدائی حصہ ہے جو مرحوم نے یوم ولی کے لئے لکھنا شروع کیا تھا افسوس ہے کہ وہ اپنی علالت اور بے موقع وفات کی وجہ سے اس کو نامکمل چھوڑ گئے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے کی تدوین فہرست اور دوسرے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں انھوں نے اُردوے قدیم میں غیر معمولی بصیرت پیدا کرلی تھی۔ انکے انتقال سے ادب اور خصوصاً حیدرآباد کو بہت ہی نقصان پہنچا۔ یہ مضمون جو مرحوم کے اموں نے ہمیں بھیجدیا ہے انکی ایک آخری یادگار کے طور پر اس مجموعے میں شریک کیا جاتا ہے]

کس دور کا شاعر ہے؟ ولی اردو شاعری کے متوسط دور کا سب سے بڑا اور واجب التعظیم علمبردار ہے۔ دور متوسط سے ہماری مراد وہ زمانہ ہے جو انتزاع دول دکن (فتح گولکنڈہ ۱۰۹۸ھ) سے شروع ہوتا ہے اور محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۱۳۱ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ عہد محمد شاہ کے آغاز سے اردو شاعری میں ایک نئے دور کی بناء پڑتی ہے جو ایہام گوئی کا دور ہے۔

بہرحال ۱۰۹۸ھ سے لے کر ۱۱۳۱ھ تک کا جو زمانہ ہے وہ تاریخ ادبیات اردو میں ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت تک نہ صرف دکن کی تہذیب و تمدن اور شعر و سخن میں انقلاب پیدا ہو گیا بلکہ نربدہ کے تمام جنوبی علاقے اور گجرات میں مغلوں کی فتوحات نے شمالی ہند کی تہذیب و معاشرت کو پھیلا دیا۔ چنانچہ ان علاقوں کے بڑے بڑے شہروں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ شمالی ہند کی بستیاں ہیں اور دہلی کے تمدن و معاشرت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی قدیم ہیئت تبدیل ہو گئی۔ برہان پور، اورنگ آباد، احمد آباد اور سورت وغیرہ میں اس کے نمایاں آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔

معاشرت اور تمدن کے گوناگوں شعبوں پر نظر ڈالنا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہمارا مبحث شاعری ہے۔ اس دور میں گجرات اور دکن کے بڑے شہروں کی زبان اور شمالی ہند کی زبان میں کیا باریک فرق تھا۔ اس کو اس مختصر مضمون میں واضح طور پر دکھانا دشوار ہے۔ لیکن اس زمانہ کی شمال و جنوب کی تصانیف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد زبان محاورات اور روزمرہ لب و لہجہ کا جہاں تک تعلق ہے دونوں مقاموں کی زبانوں میں کوئی فرق نہیں۔

برہان پور کا علاقہ ایک مدت قبل قلمروئے مغلیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اس لئے وہاں شمالی ہند کی آبادی حکمرانی و جہانبانی کے سلسلے میں منتقل ہو چکی تھی اور اسی لئے وہاں کی زبان پر دہلی کے بیّن اثرات پڑ چکے تھے۔ گجرات بھی بہت قبل مفتوح ہو چکا تھا اور وہاں کے بڑے شہروں خصوصاً احمد آباد اور سورت میں یہ اثرات نمایاں تھے۔ دکن بعد کو فتح ہوا لیکن چونکہ اورنگ زیب نے بعہد شہزادگی اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام ۱۰۶۸ھ میں قرار دیا تھا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی تسخیر کے عزم سے تقریباً تمام مدت حکومت اورنگ آباد کو پورے ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دے رکھا تھا اسلئے اسکے ساتھ ہندوستان کی کثیر آبادی اورنگ آباد اور اسکے قرب و نواح میں بس گئی تھی۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر سمیت دس لاکھ کی آبادی اورنگ زیب کے ساتھ آئی تھی۔ اس کثیر آبادی نے اورنگ آباد کی قدیم دکھنی زبان کو مٹا دیا۔ اور اس پر تسلط پاکر شمالی ہند کی زبان کو عام کر دیا۔ نہ صرف زبان بدل گئی بلکہ تہذیب و معاشرت کے تمام شعبے متاثر ہو گئے۔ اس وقت یہ کہنا دشوار تھا کہ اورنگ آباد دکھن کا شہر ہے بلکہ شمالی ہند کی بستی معلوم ہوتا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی منتقل شدہ زبان میں شاعری کا آغاز دکن میں کیونکر ہوا؟ دکن میں مدتوں قبل قدیم اردو میں شعر و شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس زبان میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اتنا ادب اب بھی دستیاب ہوا ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور بعض اعتبارات سے اس کا درجہ تمام ادبیات اردو میں نہایت بلند ہے۔ دکھنی سلطنتوں کے تاجدار اور اہل دل صوفیوں اور بزرگوں نے اس میں طبع آزمائی کر کے اسکو مقبول عام بنا دیا تھا۔ جب دکھنی سلطنتیں مفتوح ہوئیں تو اس کے چرچے عام تھے۔ صاحب کمال شاعروں نے اس میں مغلوں کے ابتدائی عہد میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ اس دور کے بعض شاعروں کے کلام اب بھی دستیاب ہوتے ہیں مثلاً قادر وغیرہم۔ لیکن ان کی شاعری کو زیادہ فروغ اور شہرت نہ ہوئی۔ البتہ ولی کے کلام نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور وہ کرامت دکھائی کہ اس کو مقبول خاص و عام کر کے انتہائی وسعت کے ساتھ رواج دیا۔

اردو ادبیات میں اہمیت ولی کو اردو ادبیات کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب جنوب میں دکھنی شاعری کی شمع ٹمٹمانے لگی تو اور دکھنی زبان کی جگہ ایک۔ دوسری زبان نے لی تو اس نئی زبان میں بعض شاعروں نے قدیم

دکھنی شاعروں کے چرچوں سے متاثر ہو کر طبع آزمائی شروع کی۔ ان میں ولی کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اسکی شاعری کی مقبولیت دکن و گجرات تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں ہل چل ڈالدی۔ چنانچہ وہ مستند اساتذہ جنھیں اپنی زبان میں طبع آزمائی کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا اور جو فارسی گوئی کو کمال جانتے تھے۔ اور اس زبان میں استادانہ مہارت اور عام شہرت رکھتے تھے وہ بھی ولی کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس زبان میں طبع آزمائی شروع کی حضرت بیدل اپنے وقت کے امام فن اور مجتہد سخن تھے۔ دہلی کے تمام شعراء ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ ان کے دل میں بھی ولی کے کلام نے تڑپ پیدا کر دی۔
چنانچہ بقول قایم نہ صرف وہ بلکہ اس وقت کے اساتذہ اس طرف مائل ہو گئے۔ قایم کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"ولی کے دیوان کی ہر بیت مطلع آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی وہ ریختہ کو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہتا تھا کہ اس وقت کے اکثر اساتذہ ازراہ ہوش ریختہ موزوں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قدوۃ السالکین وزبدۃ العارفین مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک غزل اس زبان میں کہی ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:۔

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہے ہم میں　　اس جنس بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں"

ولی کا کلام زبان و بیان اور عروض و قواعد کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہے کہ اس پر اب تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ اور اسکی زبان شمالی ہند کی زبان سے اس قدر ملتی جلتی تھی کہ قائم نے بیدل کے متعلق لکھا ہے کہ "اس زبان" میں ایک غزل کہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ زبان کا فرق نہ تھا اگر یہ فرق ہوتا تو شمالی ہند کے شعرا کبھی ولی کے کلام کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے۔ اس کی تقلید میں شعر کہنا تو بہت دور تھا۔ ہم پہلے حصے میں جو بیان کر آئے ہیں کہ اورنگ آباد اور شمالی ہند اور خصوصاً دہلی کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا اسکی تائید اوپر کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اردو شاعری کے آغاز کی تاریخ.... صد ۲۳ - ۴۴" اس کا ایک شعر ہے

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں　　ولی ولی ہی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو کا ایک شعر ہے:۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز　　گو ولی کا سخن کرامت ہے

ان تمام بیانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے شمالی ہند میں اردو شاعری کو روشناس کرایا اور وہاں کے شاعروں میں ہل چل ڈالدی۔ اپنے کلام کے اثر سے ان کو ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا اور اس طرح بنا ڈالی۔ اس لحاظ سے اس کو ریختہ کا باوا آدم اور بابائے ریختہ کہا جاتا ہے جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہے۔

عہدِ ولی کی سیاسی اور تمدّنی حالت

(از)

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔اے ال ال بی (عثمانیہ)

اگرچہ ابتک دکن کے شاعر ولی کی پیدائش اور موت کی قطعی تاریخیں نہیں معلوم ہوسکیں لیکن اس کی ادبی زندگی کے عام بہاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن کے ایک بہت ہی مضطرب زمانہ کی پیداوار ہے۔ اس قدر یقینی ہے کہ وہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے آخری اور ابتدائی عشرات میں شعروسخن کی خدمت کرتا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دکن کا عہدِ اضطراب ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کے سیلاب سے دکھنی سلطنتوں کی تمام دیواریں منہدم اور تمدن کی تمام شمعیں خاموش ہورہی تھیں۔ وہ علمی صحبتیں جن کے پرکیف نغمے تمام ہندوستان کو گرویدہ کئے ہوئے تھے سونی تھیں۔ شاہزادہ اکبر کے الفاظ میں جس نے ہندوستان کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے باپ کو ایک باغیانہ خط میں لکھا تھا "افسوس دکن کی وہ شاداب وسیع وادیاں جو ایک زمانہ میں فردوس بریں معلوم ہوتی تھیں اب خشک اور بے چراغ پڑی ہوی ہیں"[1] غالباً ان سلطنتوں کے خاتمہ سے مغل فاتح کا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ یہ سلطنتیں اپنی تمام شگفتہ روایات کے ساتھ فنا تو ہوگئیں لیکن مغلوں کے اصلی دشمن اپنی جگہ برقرار رہے اور مغل حکومت کا چراغ ٹمٹماتا رہا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ تو کوئی خلاف قیاس چیز نہ تھی۔ اس کے آثار اس وقت سے پیدا ہوچلے تھے جبکہ دکن کے سرپرست ملک عنبر۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی اور سلطان محمد قطب شاہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین شخصیتیں جو دکن کی تینوں سلطنتوں کی رہنمائی کرتی تھیں ایک ساتھ راہی عدم ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تین شخصیتیں قدرت کی طرف سے دکن کی حفاظت کے لیے ودیعت کیگئی تھیں۔ ان کے مرنے سے دکن کا کوئی سرپرست باقی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمدنگر کا خاتمہ کرکے بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے زیرنگین کرلیا۔ اگرچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں سترہویں صدی کے آخری عشرہ تک باقی تھیں اور سلطنت بہمنی کی یاد تازہ کرتی تھیں لیکن یہ مغلوں کی زنجیروں میں اسقدر جکڑی ہوی تھیں کہ

---

[1] سفرنامہ منوچی جلد چہارم ص ۱۷۵

ان کا دم گھٹا جاتا تھا ان کی سیاست خشک اور تدبر رائگاں ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان سلطنتوں کی دولت نقدو جواہر کی شکل میں مغلوں کے ہاتھ میں کھچی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ان کی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ چنانچہ گولکنڈہ کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی سیاح برنیر کہتا ہے کہ "گولکنڈہ میں اورنگ زیب کا حاجب احکام جاری کرتا ہے۔ پروانے دیتا ہے۔ عوام کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے اور ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال خود مختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق حکمراں کے"[1]۔ ان حالات میں کسی علمی اور تمدنی ترقی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنے آخری دم تک علمی اور تمدنی خدمت کی۔ سچ تو یہ ہے کہ مغل سیادت کی مجبوریوں کے باوجود ان سلطنتوں کا علمی اور تمدنی خدمت کرنا دکن کا ایک معجزہ ہے۔ غالباً ان سلطنتوں میں پچھلی روایتوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بیجاپور کے جگت گرو کی قوت عمل کام کر رہی تھی تو دوسری طرف گولکنڈہ کے والی محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے پاکیزہ ذوق اور خدمات اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرسودہ ماحول میں بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے، ان سلطنتوں کی قوت مدافعت، علمی پیداوار اور عام تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سلطنتوں نے اپنی آخری سانس تک خاطر خواہ عمرانی خدمات انجام دیں۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے یہ بے دست و پا تھیں لیکن تمدنی اعتبار سے یہ اپنے پورے عروج پر تھیں۔

اگر بیجاپور پر سرسری نظر ڈالی جائے تو مغلوں کے سیلاب کے مقابلہ میں اس جنوبی سلطنت کی کشمکش حیات اپنے میں بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ ان حالات میں جبکہ ہر طرف زوال چھا رہا تھا اور ملک کے ہر گوشہ میں کمزوری نمودار تھی اس کا پرجوش مقابلہ اس سلطنت کا بڑا سرمایہ حیات ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے مشہور جنرل جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے ایسی شکست ہوئی تھی کہ وہ اسی شرم کے مارے راہی عدم ہو گیا۔ اس کے چند سال کے بعد بہادر خاں کوکلتاش اور دلیر خاں نے کوشش کی لیکن وہ بھی بری طرح ہزیمت کھا گئے اور پھر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اور جب بیجاپور کا آخری محاصرہ ہو تو بیجاپور کے مشہور جنرل شرزہ خاں اور عبدالرؤف خاں نے مغل فوجوں کا اس قدر دل کھول کر مقابلہ کیا کہ مغل عاجز آ گئے تھے اور مغلوں کی عزت اور ناموس کا سوال پیدا ہو گیا تھا، کہ شہنشاہ نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کو امداد کیلئے بلا بھیجا اور وہ کمک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو شہنشاہ نے کہا تھا کہ "حق سبحانہ تعالیٰ از تردد خان فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہ داشت"[2]۔ لیکن جب تک شہنشاہ بذات خود

---

[1] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵ [2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۷ و ص ۳۱۸

محاصرہ کے لیے نہیں آئے بیجاپور کی تسخیر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ بالآخر شہنشاہ اپنی تمام طاقت کے ساتھ بیجاپور کی دیواروں کے پاس آ گئے یعنے بیجاپور کے ایک مورخ کے الفاظ میں "سلطنت تمامی ہندوستان بہ آں سرو سامان بر سر کاوش و کاہش یک شہر غریب نارساں کہ عبارت از بیجاپور است شد"[1] اس کے باوجود بھی محاصرہ نے طول کھینچا اور پیہم شورشوں کے بعد اس وقت فتح ہوا جب کہ اہل بیجاپور نے اپنی حمیت و خود داری کا تمام سرمایہ ختم کر لیا۔ اگرچہ بیجاپور فتح ہو گیا لیکن اس کی حمیت اور خود داری کے افسانے اپنی تمام دلسوزیوں کے ساتھ اب بھی تازہ ہیں۔ اہل بیجاپور کو ابتک وہ المناک نظارہ یاد ہے جبکہ سکندر عادل شاہ کی بہن شہر بانو جو اپنی رعایا میں پادشاہ بی بی کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کیجاتی تھی عادل شاہی خاندان کی عزت و ناموس کے لیئے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ رہی تھی۔ یہ دکن کی دوسری چاند بی بی تھی اور بیجاپور کا مورخ زبیری کہتا ہے کہ گو اس کی عمر ۱۶ سال تھی لیکن "معاملات ملک رانی خوب فہمید۔ مہمات را بر وجہ شایستگی سرانجام میداد"[2] مغل اس کو جانتے تھے اور مصالحت کی یہ شرط قرار دی کہ اس کو مغل سلطنت کے حوالہ کیا جائے۔ بیجاپور کے ارباب سیاست مجبور ہو گئے۔ اور ملک میں بڑا سماں برپا ہو گیا جب شاہزادی نے دیکھا کہ ملک کا بچاؤ اس کی قربانی پر موتوف ہے تو وہ فوراً وطن کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو گئی۔ جس وقت یہ شاہزادی بیجاپور سے جا رہی تھی اہل بیجاپور اس کے آخری دیدار کے لیے راستوں پر کھچا کھچ جمع ہو گئے اور اکثر دردمند دل ڈھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

اس زمانہ کی علمی پیداوار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان تمام اہل علم کی جن میں ادیب و شاعر شامل ہیں ایک بڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ مثال کے لیے علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ملک الشعرا ملا نصرتی اپنے تمام ادبی سرمایہ کیساتھ تنہا اس رو بہ زوال زمانہ کی نمایندگی کر سکتا ہے۔ اس کے کلام کی ادبی لطافت اور معنی آفرینی کے علاوہ اس میں ایک اور جاذبیت ہے اس کی شاعری میں حسن و عشق یا گل و بلبل کی مزخرفات تو بہت کم ہیں لیکن وہ ان کی بجائے جنگ و جدل کی ولولہ انگیز تصویریں کھینچتا ہے۔ اہل بیجاپور کو مغلوں کی حرص و آز اور دست درازیوں سے شرما کر جنگ آزادی کا سبق دیتا ہے۔ علی نامہ اور خاورنامہ اصل میں دکن کے رزم نامے ہیں جو بیجاپوریوں کی صحیح زندگی اور قومیت کا پتہ دیتے ہیں[3] اور زوال کے زمانہ میں ان کا لکھا جانا حیرت انگیز ہے۔

بیجاپور کی عام تمدنی حالت کا اندازہ اس کی عمارتوں سے ہو سکتا ہے۔ ان عمارتوں کی تو بہت بڑی تعداد ہے

---

[1] خافی جلد دوم ص ۳۱۷ [2] بساتین السلاطین ص ۵۳۹ [3] بساتین السلاطین ص ۴۸۷

جو اس سلطنت کے دو سو سالہ دور میں تیار ہوی ہیں لیکن آخری زمانہ کی عمارتوں کو دیکھا جائے جبکہ یہ سلطنت روبہ زوال تھی تو وہ اپنی عظمت میں بہت بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں محمد عادل شاہ کے عہد کی بنی ہوی عمارتیں آثار محل اور آنند محل مع اپنی شان و شوکت اور گلکاریوں کے غایت درجہ جاذب نظر ہیں۔ اور گول گنبد تو آج دنیا کی عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اس زمانہ میں کس طرح تیار ہوئیں جبکہ اس ملک کے قوائے ذہنی اور جسمانی مضمحل ہو چکے تھے اور سلطنت کا سفینہ حیات ڈوبنے کو تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے متعلق ایک شاعر کا یہ راگ گانا تو سمجھ میں آتا ہے کہ

گر اکسیر سرور و سوز سازند　　　ز خاک پاک بیجاپور سازند

لیکن اس آخری زمانہ کے متعلق شاہزادہ اکبر کا یہ کہنا کہ یہ "ہندوستان کا ایک ہیرا تھا"[لہ] بہت حیرت انگیز ہے۔

جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت ہمت شکن معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں مغلوں کی اشتہار بازی کو زیادہ دخل تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خود گولکنڈہ کے ارباب سیاست نے اپنے سیاسی فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی کارکردگی میں کوئی نقص نہ تھا اور جو کچھ کام خراب ہوا اس کے باعث خود مغل تھے جو جا و بیجا مداخلت کرتے تھے۔ اگر عبداللہ قطب شاہ میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی تو اس کی ماں حیات بخشی بیگم اس کی تلافی کر رہی تھی۔ سلطان محمد کے انتقال کے بعد اسی خاتون نے ۴۵ سال تک گولکنڈہ کی سیاسی خدمت کی اور گرتی ہوی سلطنت کو بچایا۔ جب ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کی فوجوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کرلیا اور تمام ارباب سیاست بے دست و پا ہو گئے تو گولکنڈہ کی یہ ہیروئن اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور محاصرین سے مردانہ وار گفتگو کر کے بیچ بچاؤ کیا۔ گولکنڈہ کی قوت مدافعت بیجاپور سے کہیں زیادہ تھی جب ۱۶۸۶ء میں گولکنڈہ کا آخری محاصرہ ہوا تو قطب شاہی سلطنت نے نہ صرف خاطر خواہ مدافعت کی بلکہ اپنی روایتی خودداری اور اولوالعزمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مغل افواج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر دل کھولکر مدافعت کی کہ شہنشاہی طاقت کے باوجود قلعہ کی تسخیر کیلئے آٹھ مہینوں سے زیادہ لگ گئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوی تھی کہ چند بیوفاؤں نے قلعہ کے دروازے کھول دیے تھے۔ لیکن اس حوصلہ فرسا ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر ہستیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے سچی وفاداری کا ثبوت دیا اور جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ گولکنڈہ کے محاصرہ کیساتھ دکن کے ہیرو عبدالرزاق لاری کا نام ہمیشہ یادگار رہیگا جس نے اپنے بادشاہ کیلئے ہر قسم کی قربانی کی رات کی تاریکی میں جب دشمن قلعہ میں گھس آئے تو عبدالرزاق دیوانہ وار دشمن کی تلواروں تلے گر گیا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس برجا تھے "تا جان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود" کی دل ہلا دینے والی آواز دور دور

لہ سفرنامہ منوچی جلد چہارم صفحہ ۱۷۵

تک سنائی دیتی تھی اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اس اثناء میں جبکہ قلعہ کے اندر سخت بدحواسی طاری ہو گئی ابوالحسن قطب شاہ کا اطمینان قلب ایک حیرت انگیز واقعہ ہے ۔ جب شہنشاہی افسر روح اللہ خاں اور اعتبار خاں اس کو گرفتار کرنے کیلئے شاہ نشین کے پاس آ گئے تو انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ابوالحسن اپنی شاہی نشست پر اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے اور اس سے ذرہ برابر پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی ۔ پوری دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی ۔ اپنے تمام معمولات پورے کئے اور اتفاق یہ ہے کہ اس اثنا میں جب کھانے کا وقت آ گیا تو حسبِ عادت کھانا میں شرکت کی گئی اور دسترخوان پر دوست و دشمن سب بٹھائے گئے ۔ گفتگو کے دوران میں ان مغل افسروں نے پوچھا کیا بات ہے کہ آپ اس قدر خاطر جمع معلوم ہوتے ہیں ۔ ابوالحسن نے کہا کہ پریشان ہونے کی کیا بات ہے ۔ خدا نے مجھے یہ عزت دی تھی اب وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے ۔ قدرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں ہر شخص کو سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے ۔ اگرچہ ان مغل افسروں نے ہندوستان میں ایسے بیشمار بدقسمت تاجداروں کو گرفتار کیا تھا لیکن یہ بلند کردار سوائے گولکنڈہ کی دیواروں کے کسی جگہ نہیں پائے گئے ۔ جس طرح سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس بلند پایۂ اخلاق کی روشنی میں ہوئی تھی اسی طرح اس کا خاتمہ بھی خودداری اور اولوالعزمی کا سچا مظاہرہ تھا ۔

گولکنڈہ کی علمی پیداوار بھی اپنی جگہ بڑی تفصیل کی طالب ہیں ۔ محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کی علمیت اور علمی سرپرستی تو ایسے واقعات ہیں کہ ان پر گولکنڈہ کو ناز کرنا چاہیے ۔ ان کے عہدہائے حکومت میں تاریخیں لکھی گئیں ۔ شاعروں نے دواوین مرتب کیے ۔ مدرسے قائم ہوئے اور حکومت سے ان کی ہمت افزائی ہوئی لیکن اس سلطنت کا آخری دور بھی علم و فن کا حقیقی مرکز تھا ۔ عبداللہ قطب شاہ خود عالم اور شاعر تھا اپنے بزرگوں کی طرح اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں دیوان چھوڑے ہیں ۔ اس کے عہد کا مورخ نظام الدین احمد لکھتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں فارسی اور اُردو شاعری کی خوب گرم بازاری تھی ۔ کبھی رات رات بھر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں ۔ اب بھی گولکنڈہ کی در و دیوار میں غواصیؔ، قطبیؔ، جنیدیؔ اور ابن نشاطیؔ کی نغمہ سرائیاں سنائی دیتی ہیں ۔ غواصی عبداللہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ طوطی نامہ اور سیف الملوک نظم کے کئی مجموعے اس وقت موجود ہیں ۔ اگرچہ ابوالحسن قطب شاہ کو صرف پندرہ سال حکمرانی کے ملے تھے لیکن اس قلیل مدت میں بھی علم و فن کی بہت کچھ سرپرستی کی گئی ۔ یہ خود بھی شاعر تھا ۔ فائزؔ، لطیفؔ، نوریؔ اور غلام علیؔ اس عہد کے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو ادب میں بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے [۱]

قطب شاہوں کے عام تمدن کا اندازہ ان کے بنائے ہوئے شہر و عمارات سے ہو سکتا ہے ۔ حیدرآباد زمانہ وسطیٰ کا عظیم الشان شہر تھا ۔ جس وقت اس شہر کی تعمیر ہو رہی تھی اور اس میں تمام عمرانی ضروریات بہم پہنچائی گئی تھیں تو مورخ فرشتہ

---

[۱] ماخوذ از اُردو شہ پارے ڈاکٹر زور

نے لکھا تھا "شہرے کہ تمامی ہندوستان شرقاً غرباً، جنوباً و شمالاً مثل آن لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[1] حالانکہ یہ اکبر و جہانگیر کا عہد ہے جبکہ آگرہ اور لاہور جیسے شہنشاہی شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوخیز شہر بھاگ نگر ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا تعجب کی بات یہ ہے کہ زمانہ انحطاط میں بھی اس شہر کا تمدن بڑھتا گیا اور اپنے آخری زمانہ میں اتنا بڑھا کہ باہر کے لوگ حیران رہجاتے تھے۔ خافی خاں جو عہد عالمگیری کا بڑا مورخ ہے کہتا ہے کہ "خوبہائے آن شہر لطافت آب و ہوائے آن سرزمین چشمہائے نمکین آن سبز فام و سیر حاصلی آن مرز بوم اگر پردازم از سررشتہ سخن باز می مانم"[2] شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ محمد ساقی جو گولکنڈہ کی تسخیر کے وقت یہاں موجود تھا حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے "آرامگاہیست برقطعہ زمین بہشت، راحت جسم و آرام جان آبادی وسیع تر از احاطہ خیال، عمارات وسیع تر از پایہ اندیشہ، رطوبت ہوا، عذوبت و روانی چشمہا شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گل و سبزہ این سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است"[3] حالانکہ عالمگیری عہد میں ہندوستان کے شہنشاہی شہروں کی جو حالت تھی وہ سب جانتے ہیں۔ آگرہ اور لاہور کے علاوہ شاہجہاں آباد کی دنیا میں شہرت تھی ان مورخوں کا جو شاہجہاں آباد میں رہکر آئے تھے حیدرآباد کو سراہنا اس شہر کی عظمت کا سچا ثبوت ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اہل حیدرآباد بھی اپنے شہر کے مقابلہ میں شہنشاہی شہروں کو قابل وقعت نہیں سمجھتے تھے اور حیدرآباد کی تعریف میں بجائے دہلی کو پیش کرنے کے ایرانی شہروں کی مثال دیتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت حضرت مومن استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے اپنے قصیدۂ تہنیت میں کہا تھا ؎

چو صفاہاں نو شد از شاہجہاں عباس شاہ　　　حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہاں نوی

قطب شاہی عمارتوں کی بہت بڑی تفصیل ہے۔ ان محلات کے علاوہ جو گولکنڈہ میں بنائے گئے تھے حیدرآباد میں علحدہ قصر بنائے گئے۔ داد محل کی شان و شوکت تو اب بھی بہت سوں کو یاد ہے اور باہر کے سیاح بڑے لطف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ چار محل، ندی محل اور گوشہ محل آخری زمانہ کی یادگاریں ہیں لیکن زمانہ کی ستم ظریفی اور مغل فاتحوں کی بیدردی سے ان کا خاتمہ ہوگیا جس وقت یہ موجود تھے، قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرتے تھے۔ خود مغل بھی جو شاہجہانی محلات میں رہکر آئے تھے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد جب شاہنشاہ اورنگ زیب حیدرآباد میں داخل ہوئے تو قطب شاہی محلات کی رفعت اور ذوق تعمیر کو دیکھکر بڑی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ نعمت خاں عالی نے جو شہنشاہ کے ہمراہ رکاب تھا عرض کیا کہ "دو بلند ہمت بودند۔ عمارت ہائے بلند ساختند" شہنشاہ کی حیرت اور نعمت خاں کا جواب قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرنے

---

[1] تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ص۱۷۳　　[2] خافی خاں جلد دوم　　[3] مآثر عالمگیری ص۳۰۱

کے لیے کافی ہے۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا کام بخش حیدرآباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنے لیے علٰحدہ محل کی تعمیر کر لی تھی جس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے۔ لیکن شاہزادہ نے جواب دیا تھا کہ قطب شاہی محلات میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے۔ قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پر عظمت ہیں کہ ان کی پوری دیکھ بھال تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ یہ اسی شاہزادے کے الفاظ ہیں جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا۔

ولی سے پہلے دکن کی اُردو شاعری

از

جناب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی

جامعہ عثمانیہ اُردو زبان کی ترقی کی وہ جدید منزل ہے جہاں یہ کاروان صدیوں کے مراحل طے کرنے کے بعد پہونچا۔ اب اگر ہم گزشتہ منزلوں کے راہ رؤں کی سعی و کاوش کی قدر و منزلت کے اعتراف میں اپنی عقیدت اور احسان مندی کا کوئی باج ادا کریں تو درحقیقت یہ ایک سعادت ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اپنی سحر آفرینی سے ادب اُردو کے دریا کا بہاؤ جو بدل دیا، اُس کے متعلق حال میں ملک نے اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ امر واقعی برمحل ہے کہ ہم دکن کی سرزمین میں ولیؔ کی یاد تازہ کریں۔ ابھی جبکہ حالی کے جادو کو چلنے کے لئے سو سال کا عرصہ درکار تھا دکن کے پتھریلے مرز بوم میں اُردو ادیبوں کے ایک گُل سرسبز نے وہ مہک پھیلائی کہ پورے سو سال تک اسی کی خوشبو مہکتی رہی۔

دکن میں جب بہمنی سلطنت قایم ہوئی (۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء) تو اس وقت تک فارسی شاعری نے ترقی کے سب مدارج طے کر لئے تھے۔ اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس اسلامی سوسائٹی نے ہندوستان اور دکن میں نشو و نما پائی اس کا اصلی سرچشمہ ہندوستان سے باہر وسط ایشیا اور ایران میں واقع تھا۔ بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی زمانہ کی تاریخ ادبیات کے اکثر پہلو ایران و وسط ایشیا کی تاریخ ادبیات سے مربوط ہیں، اس لحاظ سے جب دکنی ارباب ادب نے فکر و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا تو ان کے سامنے فارسی شاعری کا پیکر موزوں موجود تھا، دکنی شاعروں نے بھی فارسی مثنوی، فارسی قصیدہ اور فارسی غزل کا چربہ اُتارنا شروع کر دیا۔

ہمارے عام قومی انتشار اور پراگندگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری عام قومی زبان کی تاریخ تاریکی اور گمنامی کے پردوں میں اوجھل ہو گئی ہے، ہماری زبان کے ایسے شاہکار جن پر ہر زبان ناز کر سکتی ہے خود ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ آج ہم اپنی زبان کی تاریخ یا عہد بہ عہد ترقی کی کوئی مسلسل رو دیداد مرتب نہیں کر سکتے۔

بہر حال جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دکن میں ولی سے پہلے اردو نظم کی ابتدا کب ہوئی اور کن حالات میں ہوئی تو ہمیں اس کا کوئی

صحیح علم نہیں ہوتا۔

جو مواد ہمارے پاس موجود ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اپنی روحانی قوت کا سکہ بٹھا رہے تھے۔ اس وقت اردو میں یہ سکت پیدا ہوچکی تھی کہ سلوک و اخلاق کے بعض ابتدائی مسایل اس میں نظم کئے جائیں۔ ۸۲۵ھ میں خواجہ بندہ نواز واصل بحق ہوگئے۔ ۸۶۵ھ میں جبکہ نظام شاہ بہمنی اپنے ظالم باپ ہمایوں کے بعد آٹھ سال کی عمر میں تخت و تاج بہمنی کا وارث ہوا ہے بہمنی سلطنت میں امن و امان کا دور تھا۔ بادشاہ کی ماں نرگس بانو، خواجہ جہاں اور محمود گاواں کی تدبیر و دانش اور غیر معمولی قابلیت سے بہمنی قلمرو میں ہر جانب اطمینان اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ لامحالہ ادب اور شاعری کا بھی خوب چرچا رہا۔ اس دور کے ایک شاعر نظامی سے ہم واقف ہیں۔ اس کی دکنی مثنوی ہماری نظر سے گزری ہے۔

خواجہ بندہ نواز اور نظامی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو بیک نگاہ واضح ہوجاتا ہے کہ زبان کے ارتقا کے مدارج طے کرنے میں دوسری اور ہستیوں نے بھی پوری سرگرمی سے حصہ لیا ہوگا، نہ صرف خواجہ صاحب سے پہلے بلکہ خود ان کے زمانہ میں اور بعد میں بھی۔

بہرحال نظامی کی مثنوی دکنی عشقیہ شاعری کے قصر بلند بام کی بہت ہی مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔ اس ابتدائی مثنوی کو چھوڑ کر غزل، قصیدے یا مرثیے کا اس زمانہ کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، عشقیہ شاعری کے اس ابتدائی نقش کے ماسوا معاشرت یا زندگی کے کسی اور پہلو کی ابھی غالباً نظم و شعر میں ترجمانی نہیں کی گئی تھی۔

اب وہ زمانہ آجاتا ہے جبکہ بہمنی عظمت و شوکت کا تار و پود بکھر گیا۔ پانچ حکومتوں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اب اگرچہ بہمنی سلطنت کی جیسی عظمت خواب و خیال ہوگئی لیکن ان پانچوں حکومتوں نے پوری کوشش کی کہ بہمنی سلطنت کے علمی وقار اور ادبی سرپرستی کی اعلیٰ روایات اپنی قدیم رونق و شان کے ساتھ باقی رہیں۔

سنہ ۹۰۰ھ سے سنہ ۱۰۰۰ھ تک پورے سو سال کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں سوائے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور فیروز و محمود کے کسی اور کا نام معلوم نہیں ہوتا۔

میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم نے بیجاپور کی خاک پاک میں جنم لیا تھا۔ فیروز اور محمود نے گولکنڈہ کی فضا میں پرورش پائی۔ میراں جی اور شاہ برہان الدین جانم کا تو خیر کچھ حال معلوم ہے اور کچھ کلام بھی موجود ہے، لیکن فیروز اور محمود کا نہ تو کچھ حال معلوم ہے اور نہ ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب ہوا ہے، وجہی اور ابن نشاطی جیسے باکمال شاعروں نے فیروز و محمود کا جو لوہا مانا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ زبان کو صاف کرنے اور اس کو ترقی دینے میں فیروز و محمود نے کوشش و سعی کا پورا حق ادا کیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی سے گزر کر غزل اور قصیدے کے میدانوں میں بھی جولانی شروع ہوچکی تھی۔ شاعری کے حلقہ میں عشق اور تصوف و سلوک کے علاوہ فخریہ، مرثیہ، اور اخلاقی نظموں کی کڑیاں بھی داخل ہوچکی ہوں گی زمانہ مابعد کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ کسی ابتدائی بنیاد کے بغیر مرتب نہیں ہوسکتے تھے۔

ان دو ابتدائی صدیوں کے بعد اب ہم اس زمانہ میں پہونچ جاتے ہیں جبکہ شاعروں اور نظم نگاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پیدا ہو گئے، اور شمع سخن اس شان سے فروزاں ہوئی کہ پہلی کوششیں ماند پڑ گئیں، خوش قسمتی سے اس زمانہ کی کوششوں کا ثمرہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے۔ اسکی بعض پاکیزہ نمونے سمندر پار نا واقف لوگوں کی حفاظت اور نگرانی میں موجود ہیں۔

دکنی شاعروں کا فکر و تخیل اب عشق اور تصوف کے دائرے سے نکل کر رزمیہ، تاریخی، نیچرل اور دوسری تمام اصناف سخن میں پرواز کرنے لگا جو خیرہ خصوصیت ہمیں سمیاں پیدا چکا ہو اس کے لحاظ سے ہم ان سب اصناف پر قدرے تفصیل سے نظر ڈال سکتے ہیں۔

ردیف اور قافیہ کی سہولت کی بنا پر مثنوی کی صنف سخن نے جو عام قبولیت حاصل کی اور فارسی میں اُس کی وجہ سے جو اعلیٰ ادب فراہم ہو گیا وہ دکنی شعرا کے لئے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوا، دکنی مثنویاں اردو ادب کے لئے ایک گراں بہا زیور ہیں، زیادہ تر اسی صنف سخن میں دکنی شاعروں نے اپنے فکر و تخیل کی روداد یں قلمبند کی ہیں۔ اس دور کے جتنے بھی شعرا کا علم حاصل ہے ان سب نے بجز چند شاذ و مستثنیٰ صورتوں کے ایک یا ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ مثنویاں یا تو آپجی ہیں یا فارسی سے ترجمہ،

دکنی شعرا نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں پوری کامیابی سے کھینچی ہیں، چاہے اخلاق و موعظت ہو یا فلسفہ و تصوف، چاہے عشق کی موشگافیاں ہوں یا جنگ و پیکار کی خون آشامیاں، چاہے گھریلو زندگی کی پرکیف روداد ہو یا مناظر قدرت کی سحر طرازیاں، تاریخ و سوانح کو بھی ان قادر الکلام شاعروں نے نظم کا جامہ اس عمدگی سے پہنایا کہ شاعری ساحری ہو گئی۔

عاشقانہ شاعری

پہلے عاشقانہ شاعری پر قدرے تفصیلی نظر ڈالنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تدریجی ارتقا کے پہلو کا بھی ساتھ ساتھ علم ہوتا جائیگا نظامی کی مثنوی کے بعد بلحاظ تاریخ تصنیف جو مثنوی نظر آتی ہے وہ وجہی کی قطب مشتری ہے[۵] (سنہ ۱۰۱۸ھ) پھر غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال (سنہ ۱۰۳۵ھ) اور طوطی نامہ (سنہ ۱۰۴۹ھ)، احمد کی لیلیٰ مجنوں (سنہ ۱۰۵۰ھ) مقیمی کی چندر بدن و مہیار (سنہ ۱۰۵۰ھ) صنعتی کا قصہ تمیم انصاری (سنہ ؟) ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور یوسف زلیخا (سنہ ۱۰۵۶ھ) جنیدی کی ماہ پیکر (سنہ ۱۰۶۴ھ) ابن نشاطی کی پھول بن (سنہ ۱۰۶۶ھ) نصرتی کی گلشن عشق (سنہ ۱۰۶۸ھ) طبعی کا قصہ بہرام و گل اندام (سنہ ۱۰۸۱ھ) غلام علی پدماوت (سنہ ۱۰۹۱ھ) ہاشمی کی یوسف زلیخا (سنہ ۱۰۹۹ھ) وغیرہ

ان مثنویوں میں قطب مشتری، چندر بدن، ماہ پیکر خود دکنی شاعروں کی تراوش فکر کے نمونے ہیں باقی فارسی سے ترجمہ،

ان مستقل مثنویوں سے قطع نظر سلطان قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبد اللہ قطب شاہ، اور علی عادل شاہ ثانی ہر ایک کے کلیات میں بعض مختصر مثنویاں ایسی موجود ہیں جن میں عاشقی کی کتھا بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظامی کی مثنوی کے بعد ان مثنویوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو بیک نگاہ واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف اسلوب بیان بلکہ زبان کی سلاست نے بھی اب ترقی کی کئی منزلیں طے کر لیں۔

---

[۵] جشن ولی کے موقع پر جو نمائش مخطوطات قایم ہوئی تھی اس میں ایک مثنوی موجود تھی جسکی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۱۲ھ ہے ۱۲

ان تمام مثنویوں پر تفصیلی تبصرہ کافی وقت کا محتاج ہے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا کہ قطب مشتری میں خود بادشاہِ وقت سلطان قلی قطب شاہ کی روئداد محبت کو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جو بھاگ نگر کی ایک حسین رقاصہ بھاگ متی کے عشق کا نتیجہ تھا۔

غواصی کی مثنویاں سیف الملک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کو ایک کامیاب ترجمہ قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ غواصی نے ہندی الفاظ کو بڑی ہمدرگی سے دکنی زبان میں آمیز کیا ہے، کلام بہت سادہ اور تصنع و آورد کی قید و بند سے آزاد ہے۔

غواصی سے گزر کر ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالیں تو پچیس تیس سال کے اندر ایک بڑا انقلاب نظر آتا ہے، جذبات کی حقیقی تصویر لفظی اور معنوی صنائع بدائع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی مرصع ہے، لیکن واقعی یہ اعجاز سخن ہے کہ سلاست اور روانی بڑی کوشش سے برقرار رکھی ہے۔

اسی زمانہ کی ایک دوسری مثنوی "گلشن عشق" نصرتی کے سحر نگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہے، اس مثنوی میں انسان کے حقیقی جذبات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

عاشقانہ جذبات کا اظہار صرف مثنوی کی حد تک ہی نہیں رہا بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف تر زمین پر بھی بہت جلد پڑ گیا۔

سعدی اور حافظ کی فارسی غزل گوئی کے بعد ہندوستان میں غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا اور خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی اس کی آواز بازگشت میں دکنی شعرا نے بھی اپنا زور قلم صرف کیا اور داد سخنوری دی ہے، جو مواد ہمارے پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعرا نے اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں۔ دکنی شاعری کے سلسلہ میں جو عظیم الشان ذخیرہ مثنوی اور مرثیہ کی صورت میں دستیاب ہوا ہے اس کے مقابل غزلوں کی مقدار بہت کم ہے، سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے سوا دوسرے نامور شعرا، وجہی، غواصی، نصرتی، شوقی، ہاشمی وغیرہ کی جو غزلیں ہمیں معلوم ہیں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس امر کے باور کرنے کے لئے نہایت قوی ثبوت ہے کہ رستمی، نصرتی، غواصی وغیرہ جیسے قادر الکلام شعرا نے اس صنعت میں بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا۔ مگر افسوس اب ناپید ہے، صرف سلاطین گولکنڈہ اور علی عادل شاہ شاہی اور ہاشمی وہ خوش نصیب شعرا ہیں جن کی بیسویں غزلیں ان کے کلیات میں موجود ہیں۔

غزل گوئی کا اصل موضوع محبوب ہے، لیکن فارسی شاعری میں اور اس کے بعد خود اردو شاعری میں محبوب کی جو درگت بنی وہ ہمارے ادب کا ایک افسوس ناک پہلو ہے۔ مگر دکنی غزل نگاروں نے عربی اور ہندی شعرا کی طرح واقعیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، سلاطین کا بالخصوص محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کے دیکھنے میں سارا وقت صرف ہوتا تھا اور رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آٹھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا، اور پھر چونکہ سلطان قطب شاہ بوجہ اس کے کہ خود ایک عاشق مزاج اور سوختہ دل شاعر کی حیثیت رکھتا تھا، اور بھاگ نگر کی پری صفت اور حور وش معشوق کے زلف گرہ گیر کا اسیر تھا

اس لئے جو غزلیں لکھی ہیں وہ حقیقت بردار ہیں۔

ان غزلوں میں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی جدت، تشبیہ و استعارات کی لطافت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

رزمیہ شاعری

دکنی شاعروں نے جہاں عشق کی حکایات لذیذ کو صفائی اور ندرت سے بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، وہاں جنگ و پیکار کی دار و گیر کو بھی نہایت سلیقہ اور ہنرمندی سے مرتب کیا ہے، اس قسم کی مثنویوں میں رستمی کا قادر نامہ (سنہ ۱۰۵۹ھ) شوقی کا فتح نامۂ نظام شاہ (سنہ ؟) سیوک کا جنگ نامہ (سنہ ۱۰۹۲ھ) لطیف کا ظفر نامہ (سنہ ۱۰۹۵ھ) بہت سرآمد ہیں۔

رستمی کے قادر نامہ کو دکنی ادب کا سر سبد گل کہنا بجا ہے، چوبیس ہزار شعر کی ضخیم مثنوی صرف اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ ڈالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، گو یہ مثنوی ابن حسام کی تالیف کردہ ایک فرضی داستان قادر نامہ کا دکنی ترجمہ ہے لیکن اس کی وجہ سے رستمی کا پایہ کچھ کم نہیں ہوجاتا، اسی طرح ظفر نامہ اور جنگ نامہ دونوں غالباً ترجمے ہیں۔ البتہ شوقی کا "فتح نامہ نظام شاہ" خود اس کی ذاتی محنت کا ثمرہ ہے اس مثنوی میں اُس یادگار معرکہ کی روداد قلم بند کی گئی ہے جو تلی کوٹ کے میدان میں مہاراجہ بیجانگر کے مقابل اسلامی سلطنتوں کی صف آرائی کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

نصرتی کے قصیدے بھی رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے، واقعات جنگ، صف آرائی کی تفصیل، لڑائی کا سماں، باجوں کی آواز، توپوں کی گرج، ہتھیاروں کی جھنکار، دشمن کی فراری وغیرہ امور کی جو کامیاب مرقع نگاری کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اسی کے ساتھ شوکت لفظی، خیالات کی جدت، تسلسل بیان قابل قدر ہے

تاریخی شاعری

تاریخ و سوانح کے لئے نثر ہی موزوں ہے، لیکن موزوں طبعی اس کو بھی نظم میں پڑھ کر لذت گیر ہوتی ہے، دکنی شاعروں کی ایسی مثنویاں بھی مقررہ معیار پر کامیاب اُتر سکتی ہیں۔

نصرتی کا علی نامہ (سنہ ۱۰۷۶ھ) اور تاریخ اسکندری (سنہ ۱۰۸۳ھ) اور مومن کی "اسرار عشق" (سنہ ۱۰۹۳ھ) اس نوع کی امتیازی یادگاریں ہیں۔

علی نامہ دراصل علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی تاریخ ہے، ضمناً بادشاہ کی مدح میں جو قصائد کہے تھے وہ شامل کر دیئے ہیں، ادب اور تاریخ دونوں کو اس کتاب میں جس طرح آمیزش دی گئی ہے وہ نصرتی کے سحر نگار قلم کا حق ہے۔

اخلاقی شاعری

اخلاق اور موعظت کا میدان شعر و سخن کی مشق کے لئے بہت کافی طور سے کامیاب ثابت ہوا ہے، گلستاں، بوستاں حدیقہ سنائی وغیرہ جیسے شاہکار دکنی شعراء کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئے۔ اس خصوص میں راآزی کی تصنیف "تحفہ" (سنہ ۱۰۴۵ھ) اخلاقی مثنوی کا گویا نا حال معلوم شدہ پہلا نمونہ ہے، اسی زمانہ کی ایک دوسری تالیف "پند نامہ شغلی" بھی قابل قدر ہے۔

معاشرتی شاعری

معاشرتی موضوعات کسی خوش فکر شاعر کے لئے بہت ترغیب دہ میدان فکر ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات اور گذرنے والے واقعات کو شاعری کا لباس پہنا کر لطیف اور پاکیزہ جذبات کا مرقع بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

سنترے فروخت کرنے والیوں کی آوازوں کو جہاں ایک دکنی عصری شاعر نے ایک انگریزی شعر کا ایک لطیف موضوع بنا ڈالا، وہاں قدیم دکنی شاعروں نے عید، نوروز، شب قدر، ولادت، سالگرہ، شادی بیاہ، ضیافت، محرم وغیرہ جیسے پامال موضوعات میں حسن و زیبائی پیدا کر دی قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ شاہی، نصرتی، شوقی، وغیرہ کی تراوش فکر، نزاکت اور لطافت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے، نیز اس وقت کے رسم و رواج، طور وطریق، عادات و اطوار کو کافی طور سے واضح کرتی ہے غرض معاشرت کا ہر پہلو صاف طور سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔

نیچرل شاعری

شمالی ہند میں غزل گوئی کی زمین جس طرح پامال ہوئی اور وہاں کے شعرا کی فکر زلف دگیسو میں جس طرح اُلجھ گئی اس کی بنا پر عام طور پر یہ خیال ہے کہ اُردو شاعری نیچرل شاعری کے بازار میں تہی مایہ ہے، اور اب عام خیال یہ ہے کہ جدید اُردو شعرا نے اس موضوع میں جو ساز چھیڑا ہے وہ دراصل مغربی مضراب کا ہی ایک سُر ہے۔

لیکن یہ قصہ بھی اب ایک تقویم پارینہ کا مصداق ہے۔ دکنی شعرا کی مشق سخن اس موضوع میں بھی کسی طرح شرمندہ نہیں ہے مناظر قدرت سے طبیعت میں جو سرور پیدا ہوتا ہے وہ اگر کسی اچھے نظم نگار کی نظم میں منعکس نہ ہو تو تعجب کا مقام ہوگا۔

سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے کلیات میں پھول پھل، ترکاری، باغ، حوض، محل، چاندنی رات وغیرہ جیسے حالیہ موضوعات پر کئی مثنویاں اور قطعے موجود ہیں۔ اور یہ کسی طرح پست معیار کے نہیں ہیں۔ نصرتی کا قصیدہ جو موسم سرما پر لکھا گیا ہے۔ ہر طرح قابل ستایش ہے اسی طرح دھوپ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نصرتی کی قادر الکلامی کا شاہد ہے

صوفیانہ شاعری

کسی اسلامی قوم کی زبان میں شعر لکھے جائیں تو اس میں تصوف و سلوک کو بھی ایک خاص موضوع قرار پانا اب نہیں تو پہلے بہت ضروری تھا، دکنی زبان کے ارتقا کی ایک خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ فقراد مشائخ طریقت نے بھی اس کی غور و پرداخت میں اپنا وقت صرف کیا ہے، لامحالہ خود دکنی شاعری میں تصوف و سلوک بھی ایک خاص موضوع قرار پاگیا۔ خواجہ بندہ نواز، میران جی شمس العشاق شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، قادر، شاہ من عرف وغیرہ جیسے صاحبان طریقت نے اپنے کلام میں سلوک اور تصوف کے کئی دقیق مسائل حل کئے ہیں۔

قصائد

انسان کے جذبہ شکر گذاری نے شاعری کی زبان میں اپنی جو رُوداد بیان کی ہے، وہ ہر زبان کے ادب کا ایک زیور ہے دکنی قصائد بھی دکنی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کئی شعرا نے قصائد لکھ کر اپنا زور بیان دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ جس ذخیرہ کا ہم کو اب تک پتہ چلا ہے اس میں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب شعرا قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ شاہی اور نصرتی ہیں۔ ان میں سے پہلے تین شعرا کے قصیدے عام طور سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ علی عادل شاہ شاہی اور

نصرتی کے قصیدے قابل ذکر ہیں۔

یہ قصائد فارسی قصیدوں کی طرز پر لکھے گئے ہیں، وہی تشبیب، وہی گریز، وہی مبالغہ آمیز مدح ممدوح اور وہی دُعا، لیکن ہر شاعر نے دکنی ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جدت ضرور پیدا کی ہے، شاہی کے قصائد کا زورِ بیان، الفاظ کی شوکت، شاہانہ طمطراق داد کے قابل ہے نصرتی نے جس خوبی اور عمدگی سے قصیدہ کے پیرایہ میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے، اور پھر جوشِ خیالات کی جدت، تشبیہ اور استعارات کی ندرت یہ سب حق یہ ہے کہ زندگی جاوید کے مستحق ہیں۔

مرثیہ

شاعروں کے جذبات شکرگزاری نے جس طرح قصیدہ کی صورت اختیار کی اسی طرح حسرت اور غم نے مرثیہ کا ڈھنگ اختیار کیا، دکنی مراثی آج بھی رولا سکتے ہیں، افسوس ہے کہ چند مرثیوں کے علاوہ اس صنف ادب پر بھی اب تک تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

قدیم سے قدیم جو مرثیہ ہم کو دستیاب ہوا ہے وہ وجہی کا ہے۔ شعرائے گولکنڈہ کے منجملہ قطب شاہ، ظل اللہ، عبداللہ، وجہی، غواصی، لطیف، سیوا، مرزا وغیرہ کے مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں، اور شعرائے بیجاپور کے منجملہ شاہی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا وغیرہ کا نام مرثیہ نگار کی حیثیت سے قابل تذکرہ ہے ہم نے کئی مضامین کے ذریعہ اس صنف ادب پر بحث کی ہے، اب یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے

دکنی شاعری کے خصوصیات

اس ساری مساحت کے بعد دکنی شاعری کی بعض خصوصیتوں پر سرسری طور سے کچھ کہنا ضروری ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی شاعری کا موضوع زیادہ تر صرف حسن و عشق، شاہد و ساقی گل و بلبل کے محدود دائرے میں گھوم کر رہ گیا لیکن ہماری دکنی شاعری نے صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بیان کی بلکہ جہاں اس نے حسن و عشق کے بہترین جذبات اور خیالات کے موتی پروئے وہیں اخلاق اور تصوف کا گراں بہا سرمایہ بھی مہیا کیا۔ اگر ایک طرف رزمیہ شاعری اور تاریخی واقعہ نگاری کا ذخیرہ موجود ہے تو دوسری طرف مرثیہ گوئی اور مناظر نویسی کا وافر مواد موجود ہے، معاشرت اور تمدن کے متعلق بھی میدان خالی نہیں ہے۔ مضامین کی یہ گوناگونی دکنی شاعری کی اولین خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی سادگی اور عام فہمی ہے، دکنی شاعری کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے مشکل اور ثقیل لغات اس میں نہیں دیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے لفظی خزانہ کو ایک گنج نامحدود کی صورت حاصل تھی۔

قدیم دکنی شاعری کی تیسری خصوصیت اس کے عمدہ تشبیہات اور لطیف استعارات ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ تشبیہ اور استعارے سب زیادہ تر اپنے ماحول سے ماخوذ ہیں۔

خاتمہ

یہ خصوصیات اہم اور قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جن کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا۔

گو یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسلامی علوم اور آداب میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، اصابت فکر و رائے کا ٹوٹا پڑ چکا تھا، شرح

اور حاشیہ کی گردش میں ارباب علم و فن سرگرداں تھے، قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلیٰ جذبات کی نشو و نما اس زمانہ کی شاعری کی دسترس سے بالکلیہ باہر تھی، اس لیے اس وقت کی شاعری میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کی سدھار اور اخلاق عامہ کی بہتری اور زندگی کے لئے کوئی اعلیٰ نصب العین مقرر کرنے میں کیا نقطۂ نظر قایم کیا تھا تو محض فضول ہے۔

اس زمانہ میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالبًا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاہری اور رسمی قواعد مقرر ہو گئے تھے۔ ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ہے۔

اس اصول کے تحت اگر ہم قدیم دکنی شاعری کا جائزہ لیں تو ہم کو ناکامی نہیں ہوتی، بیسیوں شاعروں کا کلام بلاشبہہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔ فقط۔

یادِ ایامِ ولی

از

محمد عبدالعزیز صاحب غوثی متعلم سال سوم جامعہ عثمانیہ

یکایک کشتیٔ ملکِ دکن منجدھار میں آئی   سپاہ فوجِ "عالمگیر" جب رفتار میں آئی
غلامی آگئی حصے میں، آزادی ہوئی رخصت   تجمل ہی رہا باقی نہ حریت نہ شعریت
پرخچے اڑ گئے باغِ ادب کی ڈالی ڈالی کے   مسرت سو گئی اور بھاگ جاگے بے کمالی کے
دکن کی شش جہت میں "فاتحوں" کا بول بالا تھا   گلا اردو کا مغلوں کی چھری سے کٹنے والا تھا
زبان فارسی اترا رہی تھی کامرانی پر   لگائے آنکھ، بیٹھی تھی، دکن کی حکمرانی پر
تری ہستی سے اردو نے ولی پھر زندگی پائی   زبان فارسی کے راج نے شرمندگی پائی
اسیر دام پیری ہوگیا تھا شعر کا پیکر   رگوں میں تو نے دوڑایا جوانی کا لہو یکسر
سخن تھا منہ چھپائے زیر دامانِ گراں خوابی   جلائی نیند کی تاریکیوں میں تو نے مہتابی
ہویدا تو نے کردی حسن کے چہرے کی رنگینی   دہانِ شاہدِ الفت میں بھر دی تو نے شیرینی
بچاری تھا دل بے تاب تیرا حسن فطرت کا   ہوس نا آشنا تھا فلسفہ تیری محبت کا
ترے نغموں میں ہے عریاں ترنم موجِ کوثر کا   ترا ہر لفظ اک ترشا ہوا ٹکڑا ہے جوہر کا
تری غزلوں میں ٹھنڈک چاندنی کی محسوس ہوتی ہے   ہر اک آواز تیری حسن میں ملبوس ہوتی ہے
ترا ہر شعر ہے تشریح رازِ فطرتِ انساں   جھلکتا ہے تری میٹھی زباں میں چشمۂ حیواں

ترا دیوان ہے یا قسمتِ عاشق کی تفسیریں
تری غزلیں نہیں، خوابِ محبت کی ہیں تعبیریں

ولی کے تلامذہ کا دور

(انر)

مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی۔ لکچرار اردو جامعۂ عثمانیہ

دکن کی اردو شاعری کا وہ دور، جسے " ولی کے تلامذہ کے دور " سے موسوم کیا گیا ہے، کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور اہم ہے۔ دوسرے ادوار کے مقابلے میں اسکی چند نمایاں خصوصیات ہیں اور کچھ ایسے اثرات، جو عہد آفریں ثابت ہوئے۔ یہ دور، ولی کے انتقال کے زمانے سے لیکر کم و بیش نصف صدی کی شعری پیداوار پر حاوی ہے۔ اسکو درحقیقت " قدیم دکھنی شاعری " کا دور آخر سمجھنا چاہیئے کیونکہ، تاریخی اعتبار سے یہ ایسے زمانہ پر حاوی ہے، جسمیں دو مختلف شایستگیوں کا تصادم واقع ہوتا ہے۔ وہ دکنی معاشرت اور ادبی شایستگی جو دو سال کے طویل عرصہ تک، بیجاپور اور گولکنڈے کے علم دوست حکمرانوں کی سرپرستی میں نشو و نما پاتی رہی تھی، اب اسکے تار و پود بکھرنے کا وقت آگیا تھا، اور اسکے اجزا سے ایک نیا عہد تعمیر پانے کو تھا، جسمیں اردو شاعری کے، دو دور افتادہ دبستانوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے شعری مذاق اور روایات کو بنانے اور ترقی دینے میں زیادہ تر ایسے شعرا کا حصہ ہے، جنہوں نے ریختہ کو، ولی سے سیکھا تھا، اور اسی کے قائم کئے ہوئے نہج پر چلتے تھے۔ انہیں سے بعض تو ایسے تھے، جو ولی کی شہرت کو عروج پاتے دیکھ چکے تھے، اور اسکے وجد آفریں نغموں سے متاثر تھے چند کو اس اُستاد عصر سے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو معناً اس سے مستفید تھی۔

مغلوں کی فتح دکن، اور بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد سے دکن کی قدیم اردو شاعری کی ترقی مسدود ہوگئی۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے، عوام اور خواص سب کو حیران و پریشان کر رکھا تھا، بیچارے شاعروں اور انشاپردازوں کی کیا حقیقت تھی وہ اپنی بساطِ علم و ہنر سمیٹے اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس دورِ تباہی کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے۔ قاضی محمود بحری، جو بیجاپور کے مشہور شاعر اور " من لگن "۔ " عروس عرفاں " اور " بنگاب نامہ " وغیرہ کے مصنف ہیں، بیجاپور کی تباہی کے بعد، قدردان اور سرپرست کی تلاش، اور یارانِ ہم مذاق کی صحبت کی جستجو میں اپنی اُجڑی نگری کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہکر نکلے۔ گولکنڈے پر ابھی بُرے دن نہیں آئے تھے۔ اسکی ادب نواز فضا میں، دل کی حسرتیں پوری کرنے کا خیال ذہن میں لیکر اس طرف کو راہی ہوئے۔ لیکن رستہ میں قزاقوں نے اُنھیں لوٹ لیا، اور مال و اسباب کے

کے ساتھ شعر و سخن کا بہت سا سرمایہ بھی دستبرد میں آ گیا۔ خود بہ ہزار خرابی گولکنڈہ پہنچے۔ اور سمجھتے تھے کہ اب ساری کلفتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن، ابھی مشکل سے سال ڈیڑھ سال اطمینان سے بسر کرنے پائے ہونگے، کہ وہی آسمان یہاں بھی پیدا تھا۔

گولکنڈے پر جب تباہی نازل ہوی، دکھنی شعرا کے لئے دنیا تنگ تھی بیسیوں باکمال شاعر خانماں برباد ہو گئے۔ جن میں کچھ سکت رہ گئی تھی، وہ کرنول، ساھوٹ اور ارکاٹ کی طرف کوچ کر گئے۔ سنہ ۱۱۷۱ھ میں جب دہلی تباہ ہوی، تو یہاں کے باکمالوں کا بے خانماں ہو جانا، اور تلاش روزگار میں فیض آباد اور لکھنو پہنچنا، اس طرح کے سانحہ کا ایک دوسرا، مگر، کم دردناک نمونہ ہے۔ کیونکہ دہلی کے شعرا کیلئے اب بھی توقعات باقی تھیں۔ لیکن دکھنی شعرا کا روزگار اب ختم ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب، اور ان کے ہمراہ شمال سے جو لوگ دکن آئے تھے، وہ، انکو غنیم کے ملک کے افراد سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ انھیں، اپنا اور اپنے بہی خواہوں کا دشمن، اور ان کی طرف رُخ کرنا نمک حرامی تصور کرتے تھے۔ پھر وہ لوگ جو شمال سے، یہاں پہلے پہل وارد ہوے تھے۔ زیادہ تر فارسی کے دلدادہ تھے، دکھنی ادب اور شاعری کا اُنھیں شغف نہیں تھا۔ خود عالمگیر طبیعتاً اور ضرورتاً، کاروباری وضع کے انسان تھے۔ انھیں شعر و سخن سے زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ یہ ایسے واقعات تھے، جنھوں نے مل جُل کر، دکھنی شعرا کی تباہی کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ولی کے، اپنے وطن سے دل برداشتہ ہونے میں بھی، ان واقعات کو دخل تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعر و سخن کا وہ ذوق، جو سالہاسال کے عرصہ سے، دکن کے مختلف مرکزوں میں نشو ونما پا رہا تھا، یک لخت مردہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ باقی رہا۔ مگر شعرا کے مطمح نظر بدل گئے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی، جو اپنے ذوق کی تشفی کے لئے مذہب اور تصوف کی پناہ ڈھونڈنے لگی تھی۔ بغداد کی اسلامی سلطنت کی تباہی کا بھی، فارسی شعرا پر یہی اثر ہوا تھا۔ دکھنی شعرا کے رُجحانات میں یہ تبدیلی، ولی کے آخری ایام ہی سے شروع ہو چکی تھی۔

گولکنڈے کی شکست و ریخت کے بعد، جو شاعر بچ رہے تھے، ان میں اکثر ایسے تھے جو، ایک چھوڑ، دو دو سلطنتوں کے چراغ، اپنی نظروں کے سامنے گل ہوتے دیکھ چکے تھے۔ ان کے دوست احباب اور عزیز و اقارب، ان کے روبرو تہ تیغ کئے گئے۔ اور ان کے سرپرست اسیر کر لئے گئے۔ اس طرح کے دردناک واقعات دیکھنے کے بعد، دنیا اور اسکے جاہ و مرتبہ کی ناپائداری کا اثر انسان کے دل پر جس قدر بھی گہرا ہو، کم ہے۔ ایسی حالت میں اُسکے لئے صرف ایک سہارا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ، مذہب اور تصوف ہے۔

یہ غور کرنے کا واقعہ ہے کہ وہی سرزمین، جہاں اس سے پہلے، عبداللہ، حسن شوقی، رستمی، نصرتی، وجہی، محمد قلی، غواصی اور ابن نشاطی، جیسے ٹھیٹ ادبی مذاق رکھنے والے شاعر پیدا ہو چکے تھے، اس زمانہ میں بحری، وجدی

ولی ویلوری، محمد علی عاجز، ضعیفی، اور ذوقی جیسے مذہب پرست شعرا کو نشو و نما دیتی ہے! یہ سب کے سب مذہبی موضوعات یا تصوف پر لکھنے والے شاعر تھے۔ اور اردو کی بڑی بڑی متصوفانہ مثنویاں، جیسے "من لگن" "پنچھی باچھا" "روضۃ الشہدا" "چت لگن" وغیرہ اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ اس زمانہ کے جو کارنامے، ادبی معلوم ہوتے ہیں، ان میں بھی مذہبی پہلو غالب ہے، مثلاً محمد علی عاجز نے جو قصے لکھے وہ درحقیقت مسائل فقہ کی توضیحات ہیں۔

مذہبی شاعری کی ایک دوسری صنف، مرثیہ ہے، جسکو اس زمانے میں خاص عروج ہوا۔ شہدائے کربلا کے المناک واقعات لکھنے کے لئے، اس زمانے کے شاعر خاص طور پر موزوں تھے۔ اور اسی لئے انکی مرثیہ نگاری کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ گجرات کے ایک مشہور مرثیہ نگار ہاشم علی نے اس کا تذکرہ اپنے مرثیوں میں کیا ہے۔

مرثیہ نگاروں میں عشرتی، مرزا، قادر، سیدن، امامی، قابل ذکر ہیں۔ ان کے مرثیے اس میں شک نہیں کہ انیس اور دبیر کے بسیط اور ادبی مرثیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، لیکن "مرثیت" جو ان کا اصل اصول تھا، اس کے پیدا کرنے میں انھیں خاصی مہارت تھی۔ بعض موقعوں پر، خصوصاً، جہاں حضرت علی اصغر کی شہادت، یا امام قاسم اور حضرت فاطمہ کبریٰ کی شادی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، جذبات کی فراوانی نے، ان مرثیوں میں ادبی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔

روحی اور سیدن کے مرثیوں میں کچھ جدتیں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً روحی نے غزل کے انداز میں ایک مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں:-

آج غمناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں، سمن کے گل
غم زدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں — نرگس و لالہ و یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
نقش پا دیکھ، دل ہوس رکھتا — سر پہ رکھنے کو تجھ چرن کے گل

سیدن نے اپنے بعض مرثیوں میں عجیب جدت دکھائی ہے۔ ایک مرثیہ میں انھوں نے حضرت فاطمہ کبریٰ کی شادی کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اس کے لئے استعارے اور کنائے سب حزنیہ استعمال کئے ہیں۔ اسکے صرف دو شعر یہاں نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں:-

ماہِ محرم میں دیکھو، چندا، ہو مالی آئیا — تارے گگن کے گوندہ کر سہرا جو شہ کن لائیا
کنگنا ستم کا باندہ کر، دکھ کے ابٹنا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر، انجھواں سیں تن نہلائیا

اس عصر کا ایک تیسرا حلقہ "مکتب ولی" کے شعرا کا ہے۔ جس میں وہ تمام سخن پرداز شامل ہیں، جو ولی کے انداز پہ شعر لکھتے تھے۔ خواہ انھوں نے براہ راست استفادہ کیا ہو یا بہ واسطہ۔ ولی کے تلامذۂ خاص کا پتہ چلانا، آسان کام نہیں ہے کیونکہ اول تو ولی کے زمانہ میں، تذکرہ نگاری کا شوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ولی کے زمانہ کے بعض شعرا کا حال تذکرہ نگاروں کو خود ولی کے کلام سے معلوم ہوا، دوسری بات یہ ہے کہ ولی کسی مقام پر جم کر نہیں رہے۔ ان کی حالت ایک تابندہ سیارے کی سی تھی، جس کا راستہ تو معین کیا جا سکتا ہے، لیکن جس کا قیام ہر وقت ایک نئے مقام میں ہو۔ کبھی وہ اورنگ آباد میں طلوع ہوئے تو کبھی احمد آباد اور سورت میں چمکے۔ کبھی دہلی کی محفلوں کو گرمایا، تو کسی وقت پھر اورنگ آباد لوٹ آئے۔ اور یہاں کے حلقہ شعرا کے لئے رونق بزم بنے۔ اس طبیعت کے انسان سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی مقام پر رہ پڑے، اور نوجوان شعرا کی تربیت کے لئے وقف ہو جائے۔ چونکہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ زیادہ تر گجرات میں بسر ہوا، اس لئے یہ بات ضرور قرین قیاس ہے، کہ ان کے دوست، سید ابوالمعالی جیسے کئی نوجوان شاعر، ان کے گرد جمع رہے ہونگے، اور ان میں سے کچھ مشق سخن بھی کرتے ہونگے۔ چنانچہ خواجہ حمید اورنگ آبادی نے، اپنے تذکرے "گلشن گفتار" میں ایسے دو شعرا کا حال لکھا ہے جو ولی کے شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ یہ اشرف اور رضی ہیں۔ حمید، اشرف کو "بلا واسطہ شاگرد ولی" بتلاتے ہیں۔ خود ولی نے بھی اپنے کلام میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اشرف کا یو مصرع، ولی مجکوں ہے دلچسپ   الفت ہے دل و جاں کو مرے، پیم نگر سوں

رضی کے متعلق، حمید لکھتے ہیں۔ "متوطن احمد آباد، از شاگردان رشید ولی محمد"۔ ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشرف میں اور ان میں مقابلے رہا کرتے تھے۔ ہر ایک، دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتا تھا۔ ایک دفعہ اشرف نے، کڑی زمین میں ایک غزل حسب ذیل کہی تھی:۔

ہوا ہوں بستۂ زلف سجن، شکن کی قسم   ہوا ہوں صید رم مہرن، ہرن کی قسم
پتنگ وار ہے، دل، جب سے شمع رُو پہ فدا   اگن میں شوق کے جلتا ہے تن، اگن کی قسم
پیا، دیکھا جو ترے جام چشم کی گردش   ہوا ہوں شوق کی مئے سے مگن، نین کی قسم
پڑا ہے خاک نمن، جو برہ کے کوچے میں   ہے پائمال ترا، اے سجن، چرن کی قسم
یہ شعر سُن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف   تمام شاعر ملک دکن، سخن کی قسم

رضی نے بھی اسکے جواب میں ذیل کی غزل لکھی، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح اشرف سے کم نہیں ہیں:۔

خراب نرگس مستانہ ہوں، نین کی قسم   برنگ بلبل دیوانہ ہوں، چمن کی قسم

جمالِ انجمن آرائے شمع رُخ پہ ترے
شب وصال میں پروانہ ہوں، لگن کی قسم

عذابِ روزِ قیامت سیں کچھ نہیں پروا
شہیدِ خنجرِ جانانہ ہوں، کفن کی قسم

پیا کی چشم کی وحشت کوں دیکھ، جیوں مجنوں
شکارِ دامنِ ویرانہ ہوں، ہرن کی قسم

دیکھا ہے جب سیں رضیؔ پیچ و تابِ طُرّۂ یار
مزارِ خاک سیں جیوں شانہ ہوں، شکن کی قسم

ایک اور شاگرد، شیخ ثناء اللہ، ثناؔ کا ذکر، فائقؔ نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، جو احمد آباد کے رہنے والے اور مولانا نور الدین حسین صدیقی، سہروردی کے مرید تھے۔ فایقؔ کے قول کے مطابق، ثناؔ، وؔلی کے "اجلّ تلامذہ" میں شمار ہوتے تھے۔

مذکورۂ بالا، بلا واسطہ شاگردانِ رشید کے علاوہ، کچھ شاعر ایسے بھی ہیں، جن کے متعلق، صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ وؔلی سے حقیقی تلمذ رکھتے تھے یا معنوی۔ شفیقؔ اورنگ آبادی نے "چمنستانِ شعرا" میں آزادؔ اور داؤدؔ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ وؔلی کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ آزادؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ "اپنے آپ کو وؔلی کا شاگرد سمجھتے تھے"۔ خود وؔلی نے بھی آزادؔ کے ایک مصرع کی تضمین اس طرح کی ہے:۔

آزادؔ سے سُنیا ہوں یو مصرعِ مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا پورا شعر یہ ہے:۔

آئیں، جہاں کی ساری، آزادؔ، صنعتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزادؔ، دکن کے رہنے والے تھے اور ان کا نام محمد فاضل تھا۔

داؤدؔ، اورنگ آباد کے قابلِ اعتبار شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اور صاحب دیوان تھے۔ ان کے فرزند، جمال اللہ عشقؔ، بھی اچھے شاعر گذرے ہیں شفیقؔ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "در ریختہ اکثر تتبع وؔلی می نماید"۔ اور اسکے ثبوت میں خود ان کے یہ دو شعر پیش کئے ہیں:۔

سند یو بس ہے تجھے مصرعِ وؔلی داؔؤد
کہ تجکوں شورِ قیامت سیں بے نیاز کیا

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سُن کر
تجھ طبع میں داؔؤد، وؔلی کا اثر آیا

داؤد" اور انکی طرح بہت سے ایسے شعرا کے متعلق، جو ولی کی تقلید کرتے تھے، یہ تصفیہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں سے کتنوں نے ولی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا اور مشورہ سخن حاصل کیا۔ لیکن یہ پوشیدہ بات نہیں ہے کہ بڑے بڑے شاعر، اپنے آپ کو اس خدائے سخن کے ساتھ، کسی نہ کسی طرح، وابستہ کرنے اور انکی تقلید کرنے کو، باعث عزت سمجھتے تھے۔ میر تقی میر کے بعد کے شعرائے بھی، اُن کی تقلید کو فخر سمجھا۔ تقریباً ہر اُستادِ عصر اور عظیم المرتبت شاعر کا یہی حال ہے۔ متاخرین اُن کے اتباع کو، سند تصور کرتے ہے۔ ولی کی اُستادی کے آگے، اُن کے زمانے سے لے کر اس وقت تک تمام شاعر، سرِ تسلیم خم کرتے آئے ہیں۔

ولی کے بعد، قدیم دکنی شاعری کے سب سے بڑے استاد، سید شاہ سراج الدین، سراج اورنگ آبادی مانے گئے ہیں۔ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے انھیں ولی کا جانشین تسلیم کیا ہے۔ شفیق نے لکھا ہے کہ ولی کے بعد، دکن میں، ریختہ کی گرم بازاری، اور رونق انھیں کے دم سے قائم ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اورنگ آباد میں، نہ صرف دکن کے بڑے بڑے شاعر جمع تھے، بلکہ شمالی ہند کے شعرا اور علمائی بھی، کافی تعداد موجود تھی، جن میں شاہ غلام قادر سامی، عبد القادر مہربان، میر غلام علی آزاد، اور عبد الولی عزلت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب، اساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ اور ان کے گرد، شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جمع رہتی تھی۔ شفیق، آزاد کے شاگرد رشید، اور معتقد تھے، اور اپنے اُستاد کے علم و فضل کے مقابلے میں کسی اور کا ذکر بھی گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ جب ہم ان کی زبان سے، سراج کے متعلق مذکورہ بالا الفاظ سنتے ہیں، تو سراج کا پایہ ہماری نظر میں اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ولی کے بعد، قدیم دکھنی شاعری میں سراج کے رتبہ کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہوسکا۔ اس حقیقت کا اظہار سراج نے بھی اپنے ایک شعر میں کیا ہے:-

تجھ مثل اے سراج، بعدِ ولی
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج کی شاعری، سوز و گداز اور لطافت اور سادگی کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اُن کی یادگار سے ایک ضخیم دیوان، اور ایک نفیس مثنوی، "بوستان خیال" باقی ہے۔ دیوان کے چند شعر اقتباس کرکے یہاں پیش کئے جاتے ہیں، جن سے اُن کی، اور اُن کے زمانہ کی شاعری کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکیگا۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں:-

گر آرزو ہے تجکوں، تالاب کا تماشا
کشتی میں چشم کی آ، دیکھ آب کا تماشا

ہر قطرہ اشک میں ہے ظاہر جمالِ مہ رو
پانی میں جیوں عیاں ہے مہتاب کا تماشا

اے قبلۂ دل وجاں! تری بھنووں کے دیکھے زاہد کوں خوش نہ آوے محراب کا تماشا

حیات انسانی کی سبک روی اور ناپائداری کو ان دو شعروں میں ظاہر کیا ہے:۔

آبِ رواں ہے حاصل عمر شتاب رو لوحِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں مطرب غلط ہے، جام غلط، انجمن غلط

ایک جگہ معشوق کی زلف کی تعریف کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں تری زلف کوں دیکھ اہل شریعت قربان ہے اس کفر پر ایمان ہمارا

سراپا کی تعریف میں یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

ناز کے دیوان میں اے مطلع حسن و جمال قد ترا ہے مصرعہ، وابرو ہے فردِ انتخاب

ایک عام خیال کو کس عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہے:۔

یا تو گلزار آپ ہو جانا یا کسی گلبدن کے ہو رہنا

اپنے زمانہ کی حالت ایک غزل میں یوں بیان کی ہے:۔

عالم کے دوستوں میں مروت نہیں رہی شرم وحیا و مہر وشفقت نہیں رہی
ظاہر میں کیا رفیق کہاتے ہیں آپ کوں لیکن انھوں کے دل میں محبت نہیں رہی
ملتے ہیں راستی سیں، جو کوئی کج نظر ملے خوبوں میں پاکباز کی حرمت نہیں رہی
نالایقوں میں عمر کوں کرنا عبث تلف ہم صحبتی کی اُن میں لیاقت نہیں رہی
بھولے ہیں ہر صنم کے کرشمے پہ ہوش کوں ان زاہدوں میں کشف و کرامت نہیں رہی
سفلے ہوئے عزیز، عزیز اب ہوئے خراب بے جوہروں میں قدر شرافت نہیں رہی

مت ہو بہارِ گلشنِ دنیا کا عندلیب
اس پھول بن میں بوئے رفاقت نہیں رہی

سراج کی شاعری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی اکثر غزلیں شمالی ہند تک پہنچ گئی تھیں، اور لوگوں کی ورد زبان تھیں۔ بعض تذکرہ نگار، ان کے اشعار کو کسی دوسرے شاعر سے بھی منسوب کر دیا کرتے تھے۔

سراج جو ولی کے خلیفہ اول تھے، وہی خلیفہ آخر بھی ثابت ہوئے۔ انھیں پر دبستانِ قدیم کے، عظیم المرتبت شعرا کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ، ایک طرف تو وہ فضا اب سونی ہو چکی تھی، جس میں دکنی شعر و سخن کی پرورش ہوئی تھی، دوسرے اورنگ آباد میں، جو اب دکن کا پائیہ تخت تھا، شمالی ہند کے شعرا خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ [۲] دو مختلف دبستانوں کے میل جول اور اختلاط سے ایک نئے اسلوب کا فروغ پانا ضروری تھا۔ یہ نیا اسلوب جو پیدا ہوا، شمال اور دکن کے روزمرے اور محاورے پر مشتمل تھا۔ چنانچہ سراج کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے وہ اسی جدید اسلوب اور زبان کے شاعر تھے۔ درگاہ، شاہ تجلی وغیرہ اسی مخلوط زبان میں شعر کہتے رہے۔ تعمیر جدید کا یہ سلسلہ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے آخر عہد میں انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ، تجلی کے شاگرد رشید، شیر محمد خاں ایمان، جو اپنے زمانہ میں، شمالی ہند اور دکن، دونوں جگہ کے شاعروں کے ہاں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اسی زبان میں شعر سر انجام کرتے تھے، جس میں دہلی کا کوئی استاد شعر کہتا تھا۔

شاعرِ اعظم

از

مرزا باقر علی صاحب زاہدؔ متعلم سٹی کالج

اے ولیؔ باکرامت شاعرِ شیریں بیاں
مانتا ہے شاعرِ اعظم تجھے ہندوستاں

تجھ سے پہلے بھی کئی شاعر دکن میں تھے ولے
جو ذہانت تجھ میں تھی اوروں نے وہ پائی کہاں

تو اگر دعویٰ کرے اپنی زباں کا ہے بجا
وہ سلاست، وہ لطافت، اور وہ تیری زباں!

آج بھی اردو تری شرمندہ احسان ہے
تو دکن میں شاعری کا مدتوں تھا پاسباں

مثنوی اور مرثیے کا رنگ پھیکا پڑ گیا
دیکھ کر صنفِ غزل میں تیرا سحر آگیں بیاں

دو صدی کے بعد بھی بھولے نہیں اہلِ دکن
تو نے بعدِ مرگ پائی ہے حیاتِ جاویداں

تھا سٹی کالج میں برپا جشن تیری یاد میں
نام تیرا تھا ولیؔ ہر اک کی وردِ زباں

اُردو شاعری میں وؔلی کا رُتبہ

از

جناب محمد عبدالحکیم صاحب متعلم ام۔ اے ابتدائی شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عنوان بالا پر جامعات ہند کے پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ طلبہ سے مسابقتی مضامین لکھائے گئے تھے۔ ممتحنین نے ذیل کے مضمون اور زین العابدین صاحب کے مضمون کو علی الترتیب پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کے معینہ انعامات عہ اور عسہ کا مستحق قرار دیا ہے۔

نیرنگیٔ دہر کی اعجوبہ کاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آج جو باتیں سب سے زیادہ مشہور و معلوم، روشن اور واضح ہیں، اُنھیں کے آغاز و ابتدا پر گمنامی اور تاریکی کے اتنے تہ در تہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا اٹھاتے جائیے لیکن مقصود کی جھلک کہیں نظر نہ آئے گی۔ چاہ بابل، مارِ ضحاک، جوئے شیر، کوہ بیستون، دیوار قہقہہ اور جام جم دنیائے ادب کے مسلمات سے ہیں لیکن جہاں تک ان کی پیدائش و آغاز کا تعلق ہے ہماری معلومات کا دامن خالی ہے اور تاریخ تو سرے سے ان کے وجود ہی کا انکار کرتی ہے۔ انسانی زندگی کے عموماً تین دور مانے گئے ہیں طفلی۔ شباب اور پیری لیکن ہم میں سے کون ہے جو اس لمحے کا تعین کر سکے جب وہ عہد طفلی ختم کر چکا اور جس کے بعد اس نے دائرہ شباب کے اندر قدم رکھا، یا اس روز بد کا نام لے سکے جس پر اس کے عہد شباب کا خاتمہ ہوا تھا۔ صبح اپنی ساری نورافشانیوں کے ساتھ روز آتی ہے اور شام کا جلوۂ محجوب کس دن ہماری آنکھوں سے نہیں گذرتا لیکن ہے کوئی جو اس ساعت کو متعین کر دے جس سے صبح کا آغاز یا شام کی ابتدا ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال زبان اُردو کا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آغاز کب سے ہوتا ہے۔ علمائے لسانیات آج تک جو کچھ کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور کے بعض بعض فقرے پیش کر دیئے ہیں اور بس۔ زبان اُردو کے پہلے فقرے کے نام سے آج تک کوئی چیز پیش کی جا سکی۔ اور نہ آیندہ اس کا امکان نظر آتا ہے۔ لیکن جب روشنی کا غلبہ تاریکی پر ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ صبح ہو گئی ہے اور جب تاریکی روشنی پر غالب ہو چکتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ شام ہو گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب دلی کا

کلام شعرائے دہلی اور دکن کو اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا لیتا ہے تو اُردو کی ادبی اور لسانی حقیقت مسلّم ہو جاتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے صبا کی ضو فشانی شام کی ظلمت خیزی اور شفق کی خونابہ فشانی معلوم اور مسلّم ہے اور دلیل و ثبوت سے قطعاً بے نیاز۔

وَلی سے قبل دکنی لٹریچر پر ایک نظر

مولانا آزاد کے مشہور تذکرہ آبحیات کی سند پر عرصہ سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ وَلی اُردو زبان کا پہلا شاعر ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی اور اب ہمارے سامنے ولی سے قبل کے شعرا کی ایک پوری صف موجود ہے۔ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا مشہور فرمانروا محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) ایک صاحب دیوان شاعر گذرا ہے جس نے وَلی سے مدتوں پہلے اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین کی تھی۔ صاحب تاریخ ادب اردو کی رائے میں "سادگی شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے"، مگر ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کے سبب اُردو شعر و شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو صاف اور شیریں نہیں کہا جا سکتا۔ محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا جب دکنی زبان پر بھاشا، سنسکرت اور فارسی کا اثر بہت زیادہ پڑ رہا تھا اس لئے کبھی تو ان کے کلام میں ہندی الفاظ، ترکیبوں اور بندشوں کی ایسی بھرمار ہو جاتی ہے کہ اشعار اردو زبان کی بجائے بھاشا کے اشعار معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً

بسے چندنی میں جب لٹک پیو ہمارا — اوتن عکس دیپی چندر تھی اُتارا
بسے جن ہیا میں پیرت ہم سجن کی — میں اُس کی پِرت کچ نہیں اوتس پیارا
چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا — کہ اس بن نہیں ہمن ٹک دل قرارا (ماخوذ از شعرالہند ص۲۱)

ایسے اشعار ہیں جن کی زبان کو اردو کے بجائے ہندی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ قطب شاہ کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو ہندی بحور و اوزان میں کہے گئے ہیں جنھیں ہم کسی طرح اُردو کا نام نہیں دے سکتے۔ بعض جگہ جہاں اُنھوں نے فارسی کا تتبع کیا ہے۔ وہاں فارسی الفاظ کی ایسی کثرت ہے کہ اشعار تقریباً فارسی ہی کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً

اے وضعہا کہ کل جو کیا تازہ لے صنم — او غمزہ تازہ تازہ ترا عارفانہ کر
ہاتف ندا کرے کر والے زمزم صبوح — میرے دلم میانہ رمز نہانہ کر
بیدار یم تمن سوں ہمارے کہاتی ہے — او چشم عارفانہ ترا ٹونہ ٹانہ کر
پیوستہ با تو باد معاقی عروس عیش — قلقل کی صوت بجتی ہے صورت بہانہ کر (شعرالہند ص۲۵)

غرض یہ ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں بھاشا اور فارسی کا گوارا، لطیف اور معتدل امتزاج کم ملتا ہے وہ فارسی کی طرف جب جھکتے ہیں تو ایک دم فارسی ہی کہنے لگتے ہیں اور جب بھاشا کی طرف توجہ کرتے ہیں تو کبت۔ دوہے اور گیت کہنے لگتے ہیں لیکن بعض بعض جگہ ان کا کلام ضرور صاف ہو گیا ہے جیسے:۔

دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دو دے گا   تمن کو مراداں کے بھرے جام دو دے گا

گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ خود اہل ذوق تھے اور شعراء ادبا نیز دوسرے اہل فن کی قدر کرتے تھے انہیں کی سرپرستی اور قدردانی کی وجہ سے دکن میں اُردو شعر و شاعری کی تربیت و ترقی شمالی ہند سے بہت پہلے ہوئی۔ ان شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جو ان سخن شناس اور علم پرور بادشاہوں کے دامن دولت سے وابستہ تھے ان میں سے ہر ایک کا نام لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ چند مشہور شعرا جن کا تعلق دربار گولکنڈہ سے تھا یہ ہیں۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شغور، بیچارہ، طالب اور مومن۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمد قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا یہ دونوں بادشاہ چونکہ مذہباً شیعہ تھے لہذا ان کے اثر سے دکھنی شاعری میں مرثیہ اور تصوف کا اضافہ ہوا۔ بہت سے مرثیے اور قصائد اہلبیت کرام و ائمہ عظام کی شان میں کہے گئے اور دکھنی شاعری کا ذخیرہ بڑھتا گیا لیکن زبان ان ساری نظموں کی بوجھل اور ثقیل ہے۔ صفائی اور شیرینی ابھی تک پیدا نہ ہو سکی تھی۔ غزل لکھنے کا رواج بھی اس عہد میں ہو چلا تھا لیکن غزلوں میں عموماً ہندی کے تتبع میں عشق کا اظہار عورت کی جانب سے کیا جاتا تھا اس عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو دکنی روزمرہ میں غلط بولے جاتے تھے شعرا اپنے کلام میں بھی ویسے ہی لاتے ہیں عام اس سے کہ لغت کے لحاظ سے وہ صحیح ہوں یا غلط۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ قطب شاہی سلاطین کے دور میں دیگر اصناف سخن کی نسبت مثنوی کو بہت ترقی ہوئی۔ دربار گولکنڈہ کے شعرا میں سے بہتوں کا نام تاریخ ادب میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ چند مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ مثنوی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ دوسرے اقسام نظم کے مقابلہ میں اس میں وسعت زیادہ ہے۔ مثنوی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ابیات باہم مقفیٰ اور مردف ہوں۔ ہر بیت قافیہ و ردیف کے اعتبار سے اپنے سابق و لاحق ابیات سے قطعاً جداگانہ ہوتی ہے قافیہ اور ردیف کی وہ پابندیاں جن سے غزل قصیدہ اور رباعی کا میدان نہایت تنگ ہو جاتا ہے مثنوی کی راہ سے علحدہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو مثنوی کے اندر زور تخیل کی نمائش اور جولانی طبع کے اظہار کا نہایت عمدہ موقع ہاتھ آتا ہے مثنوی کی وسعت اور ہمہ گیری کے سبب سے اس میں ہر قسم کے مضامین فلسفہ، پند و نصیحت، اخلاق، عشق و محبت، رزم، بزم، سوانح، مناظر قدرت، تاریخ وغیرہ پوری آسانی اور زور و جوش کے ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ پس قطب شاہی دور میں مثنوی کی اس درجہ مقبولیت کا سبب اس کی ہمہ گیری اور وسعت ہی کو کہہ سکتے ہیں۔ غواصی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے دربار گولکنڈہ کا شاعر تھا مشہور مثنوی سیف الملوک، اس کی یادگار ہے۔ اس مثنوی میں اس نے سیف الملوک شہزادہ مصر اور بدیع الجمال شہزادی چین کی باہمی محبت کا قصہ نظم کیا ہے۔ مثنوی کی داستان الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ غواصی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ مثنوی پھول بن ابن نشاطی کی تصنیف ہے۔ مثنوی کی ہیروئن پھول بن کے نام پر اس کا نام رکھا ہے، اس مثنوی میں طلسماتی دنیا کے عجائب و غرائب دکھائے گئے ہیں جہاں انسان بے تکلف جانوروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اور جہاں لقمان و سکندر جیسے مافوق الفطرت اشخاص کے پند و نصائح سے استفادہ کا ہر شخص کو موقع ملتا ہے۔ اس موقع پر ایک مثنوی کا مردِ دکھلا مصنفہ تحسین الدین کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جسے مشہور جرمن شاعر گیٹے نے ترجمہ کرا کے سُنا اور بہت محظوظ ہوا۔ کامروپ

شاہ اودھ کا بیٹا ہے اور کلا قصہ کی ہیروئن لنکا کے بادشاہ کی بیٹی ہے دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۸۳۶ء
میں گارساں دتاسی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ دربار گولکنڈہ کے آخری شعرا جنیدی طبعی اور فائز ہیں۔ جنیدی نے اپنی مثنوی ماہ پیکر ۱۰۶۲ھ
میں تصنیف کی طبعی اور فائز دونوں گولکنڈہ کے رہنے والے تھے۔ طبعی نے ایک مثنوی تیرہ چودہ سو اشعار کی "بہرام و گل اندام" کے نام سے لکھی
ہے قصہ نظامی کی مثنوی ماہ پیکر سے لیا ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے۔ فائز نے ۱۰۹۴ھ میں فارسی قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ
نظم دکنی میں کیا۔

دربار بیجاپور کے مشہور شعرا رستمی، نصرتی، شاہ ملک، امین، سیوا، مومن، ہاشم، اور مرزا تھے نصرتی علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ تا ۱۶۷۲ء)
والی بیجاپور کے عہد میں کرناٹک سے بیجاپور آیا۔ بادشاہ نے ازراہ قدردانی اسے اپنا مصاحب خاص بنایا اور ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا
صاحب تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں کہ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی مضمون آفرینی، زور طبع اور اوج تخیل
کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ زبیری نے اپنے بیان میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ نصرتی نہایت پرگو اور
بلند پایہ شاعر تھا۔ تین مثنویاں اس کی یادگار ہیں پہلی مثنوی علی نامہ ہے اسی کے صلے میں اسے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ اس میں علی عادل شاہ کے
سوانح زندگی، فتوحات، داستان عیش و طرب بیان کی گئی ہیں درمیان میں کہیں کہیں مدحیہ قصائد بھی آگئے ہیں۔ یہ پہلی مثنوی ہے جس میں ایک
بادشاہ کی مدح کی گئی ہے۔ اس کے قبل ہمیں کسی بادشاہ کی تعریف میں کوئی مثنوی نہیں ملتی۔ نصرتی کی دوسری مثنوی گلشن عشق ہے لیکن اس میں بھی
وہی عیب ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بعض اشعار تو صاف ہیں لیکن بہتیرے نہایت ادق مشکل اور پیچیدہ ہیں کہیں
عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت ہے تو کہیں بھاشا و سنسکرت کی۔ نصرتی کی تیسری مثنوی گلدستہ عشق ہے اس نے قصیدے اور غزلیات کے
دو مجموعے بھی چھوڑے ہیں۔ دکنی لٹریچر میں خاص اہمیت کی چیز چھ ہزار ابیات کی ایک مثنوی یوسف زلیخا نام کی ہے اس کا مصنف
مشہور نابینا شاعر ہاشمی ہے اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد، غزلیں، مرثیے، قطعے اور رباعیاں سب کچھ تھیں اس کے کلام
کی چند خصوصیات ہیں۔ غزلوں کا حصہ ریختہ کی بجائے ریختی میں کہا گیا ہے۔ قدیم بھاشا کا رنگ پورے مجموعہ کلام پر چھایا ہوا ہے ایہام کی بھی
کثرت ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندی شاعری کی تقلید میں ان کے یہاں بھی عشق کی ابتدا عورت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایک
اور مشہور شاعر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ قاضی محمود متخلص بہ بحری ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار تھی ان کی ایک
مثنوی "من لگن" نام کی تصوف میں ہے یہ ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی۔ زبان اس کی مشکل اور ادق ہے۔

ولی کے قبل دکنی لٹریچر کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے اس کی زبان، خصوصیت، معنویت اور اس کے عام میلان کا ذکر جستہ جستہ اوپر کی
تحریر میں کر دیا گیا ہے لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے بھی ایک نظر اس لٹریچر پر ڈالی جائے سب سے پہلی بات تو یہ
ہے کہ اب اس کی زبان یکسر مہجور و متروک ہے شمالی ہند کے اہل زبان کا تو کیا ذکر خود اہل دکن بھی بدقت تمام اس دور کی شعر و شاعری کو

سمجھ سکتے ہیں۔ زبان کا چونکہ ابتدائی دور تھا اس لئے کوئی خاص اصول یا ضابطہ لوگوں کے پیش نظر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر لکھنا اس زمانہ کی عام خصوصیت ہے۔ خیالات و جذبات میں عموماً رکاکت، ابتذال، سطحیت، عامیانہ پن اور سوقیت ہے، معدودے چند کو چھوڑ کر عمق اور معنویت سب کے یہاں عنقا ہے۔ چنانچہ میر تقی میرؔ نکات الشعراء میں فرماتے ہیں "مخفی نماند کہ احوال یکے ازیں شاعران سمت دکن کہ پربلے رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولیؔ سید عبدالولی سراجؔ و آزادؔ کہ معاصر ولیؔ بود، سر رشتہ مربوط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود باقی سر فہ کلافہ داشت" غواصی، ہاشمی اور نصرتی مشہور شعرا ہیں لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان میں سے کوئی بھاشا اور فارسی کے امتزاج کا نقطۂ معتدل نہ دریافت کرسکا۔ سب کے یہاں افراط و تفریط ہے ہمیں اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ زبان کی ابتدائی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان تمام شعرا کا کلام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن فارسی میں بھدے اور ثقیل سنسکرت یا بھاشا کے الفاظ کی پیوندکاریاں اور بھاشا میں غیر موزوں عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب کے جوڑ بند نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں یہ حالت عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ولیؔ کے ظہور کے بعد عالم شعر و شاعری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو گیا۔ ولیؔ کے ابتدائی کلام کو زبان کی حیثیت سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے لیکن وسطی دور سے انھوں نے ایک ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جو میرؔ و سوداؔ اور غالبؔ و ذوقؔ کے زمانے میں پروان چڑھی اور جس کی مقبولیت ہر دلعزیزی اب بھی ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

ولیؔ کی امتیازی شان

فطرت کا یہ اصول ہے کہ اپنے انعامات و احسانات کی بارش کے لئے انسانی بھیڑ میں سے صرف چند کو چھانٹ لیتی ہے اور انھیں مخصوص شرف و امتیاز کا مالک بنا کر لوگوں میں معزز و مفتخر کر دیتی ہے تاریخ ان بزرگ ہستیوں کے ناموں کو اپنے زرین اوراق کی زینت سمجھتی ہے اور آنے والی نسلوں کے سامنے فخریہ پیش کرتی ہے۔ قطب شاہی دور سے لے کر ولیؔ کے ظہور تک سیکڑوں شعراء اور ادیب پیدا ہوئے سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض انجام دیا، اور سب کے لئے ہمارے دلوں میں وقعت ہے لیکن جس مبارک ہستی نے (ایم مہدی حسن مرحوم کی زبان میں) "ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لایق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے" وہ ولیؔ کی ذات اور صرف ولی کی ذات ہے یہ شرف ازل ہی سے ولیؔ کے لئے مخصوص ہو چکا تھا کہ بھاشا اور فارسی کا خوشگوار لطیف اور شیریں امتزاج ولیؔ ہی کی ذات سے رونما ہو گا اگر ولیؔ کا ظہور نہ ہوا ہوتا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی مدت تک اور ہمارے شعراء دکنی زبان کی ناہمواریوں اور بھاشا اور فارسی کی غیر فطری آمیزش کے الجھاؤ میں گمراہ رہتے۔ یہ صرف ولیؔ کا کارنامہ ہے جس نے ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھی جس میں ہر نوع کے مضامین تاریخ، فلسفہ، شریعت، تصوف، اخلاق اور جمالیات کی سمائی نیز نازک سے نازک حسیات، واردات اور کیفیات کی عکاسی کی قدرت بدرجۂ اتم موجود ہے ولیؔ نے آنے والی نسلوں کے لئے ایک صاف سیدھی اور کشادہ شاہراہ تیار کر دی اور انھیں تخلیق زبان کی دشوار گذار راہوں اور ان کے مصائب سے نجات بخشی۔

ولی کے مختصر حالات

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ولی جیسے بلند پایہ شاعر کے حالات زندگی تفصیل سے تو کیا اجمال کے ساتھ بھی نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ شخص اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر اس کثرت سے کتابیں لکھی جاتیں کہ ایک پوری لائبریری ان سے تیار ہو سکتی اور واقعات و سوانح کا ہر باب ولی کی تصویر کے خد و خال تک کو روشن اور اُجاگر کر دیتا۔ لیکن ہماری غفلتوں اور بے نیازیوں کا یہ حال ہے کہ آج ہم ولی کا صحیح نام بھی تحقیق نہ کر سکے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ولی محمد، ولی الدین، حاجی ولی، شمس الدین اور شمس الحق میں سے کون سا ان کا حقیقی نام تھا اکثر شعرا اپنے نام پر تخلص بھی اختیار کرتے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ ولی محمد، ولی الدین، یا حاجی ولی میں کوئی ان کا نام ہوگا لیکن یہ بھی قیاس ہے بہرحال اس بحث کو طے کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ولی ۱۰۷۹ھ بمطابق ۱۶۶۸ء اورنگ آباد میں پیدا ہوئے بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے ان کو احمد آبادی اور گجراتی بتلایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ولی کا اورنگ آبادی ہونا ہر اعتبار سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ البتہ وہ عرصہ تک طالب علمی کے سلسلے میں احمد آباد میں مقیم رہے اور ۱۱۵۵ھ بمطابق ۱۷۴۲ء یہیں ان کا انتقال بھی ہوا اور دریا خاں کے گنبد کے سامنے دفن ہوئے۔ سورت میں بھی عرصہ تک ان کا قیام رہا ایک مثنوی سورت کی تعریف میں لکھی ہے۔ احمد آباد میں انھیں شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ سے بیعت تھی، ولی نے دلی کا سفر بھی دو مرتبہ کیا اور کچھ عرصہ وہاں بھی مقیم رہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن دہلوی سے ولی کو ایک خاص عقیدت تھی شاہ صاحب نے ہی ولی کو مشورہ دیا تھا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببراز تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"، اور تذکرہ قدرت میں ہے کہ انھوں نے یہ الفاظ کہے "شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اُردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد"، غرض شاہ صاحب کے مشورے کے موافق زبان اور مضامین ہر لحاظ سے ولی نے اپنی شاعری میں اصلاح کی اور فارسی خیالات و مضامین کی گنجائش کے لئے ریختہ میں تغیر و تبدل کئے، یہاں تک کہ ریختہ کی وہ قدیم ناہمواری اور شتر گربگی کا خاتمہ ہو گیا اور ایک فصیح، سلیس اور رواں زبان تیار ہو گئی۔ اب ہم یہاں ولی کی شاعری پر ایک تفصیلی نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور پھر ولی کے کلام کی خصوصیات سے بحث کریں گے۔

ہمیں مولانا احسن مارہروی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے دو سال کی پیہم جستجو اور جگر کاوی کے بعد "کلیات ولی" کا نہایت صحیح ایڈیشن ایک فاضلانہ تبصرہ کے ساتھ شائع فرمایا۔ اس ایڈیشن میں مولانا کے بیان کے مطابق چار سو بائیس غزلیں، سات مستزاد، بارہ مخمس اور ترجیع بند چھ قصائد، دو مثنویاں، چھبیس رباعیاں، چھ قطعات اور چالیس مفردات شامل ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کو ہر صنف کلام پر کیسی حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اور یہ کہ وہ کتنے پُرگو شاعر تھے۔

ولی کی غزلیں

غزل ابتدا میں محبت اور داستان محبت کے لئے مخصوص تھی لیکن فارسی شعرا نے اس کی وسعتیں بے پایاں کر دیں کیفیات محبت کے علاوہ جو غزل کا حقیقی عنوان تھا۔ فلسفہ، اخلاق، تصوف، تاریخ، معاشرت ہر قسم کے مضامین غزل ہی میں لکھے گئے لیکن یہ بات البتہ تعجب انگیز ہے کہ باوجود غزل کی وسعت ہمہ گیری اور ہمہ آمیزی کے اپنے اصلی مرکز سے غزل بہت کم ہٹی ہے۔ یعنی اس

---

[5] تذکرہ شعرائے دکن عبد الجبار خان

کے اجزائے ترکیبی میں عناصر محبت کا اب بھی غلبہ ہے۔ ولی نے غزل کی حقیقی خصوصیات کو اپنے سامنے رکھا اور واردات عشق۔ درد والم۔ کیف و سرور۔ یاس وحرماں، لذت، مسرت، رنج وحسرت پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے غزل کے میدان کو محدود کر دیا ہے، ان کے یہاں تنوع بھی ہے لیکن جیسا کہ مولانا احسن مارہروی نے فرمایا ہے ولی کو امیر و داغ کا ہمعصر نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یاد رکھنا چاہیے کہ ولی عہد عالمگیر کا ایک شاعر تھا، اگر یہ خیال ذہن میں رہے تو ہم ولی کے رتبہ کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

آلام محبت :۔ ولی فرماتے ہیں۔

لالہ خونیں کفن کے حال سوں ظاہر ہوا　　　بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغِ زندگی

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے　　　گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم وچراغ زندگی

دنیائے عشق میں یہ بات مسلم ہے کہ محبت کی ابتدا ہی آلام ومصائب سے ہوتی ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

یا مثلاً ہمارے جگر صاحب فرماتے ہیں ؎

شروعِ راہ محبت ارے معاذ اللہ　　　یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

ولی بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، محبوب سے دلبستگی ایک داغ ہے اور ایسا داغ کہ زندگی میں تو معلوم نہیں اس نے کیا کیا غضب ڈھائے مرنے کے بعد بھی لالے کو خونیں کفن بنا رکھا ہے۔ لالہ کی رنگت سرخ ہوتی ہے اس لئے خونیں کفن کہنا عین حقیقت ہے اور چونکہ اس کی پنکھڑیوں میں سیاہ داغ بھی ہوتے ہیں لہٰذا لالے کا خالِ محبوب سے دل بستگی رکھنا ایک ایسا دعویٰ ہے جو خود ہی اپنا ثبوت بھی ہے

دوسرا شعر موسیقیت وترنم کے لحاظ سے تحسین وآفرین سے بے نیاز ہے فرماتے ہیں کہ اے محبوب! اے میری زندگی کے چشم وچراغ! اگر میں تجھے نہ دیکھوں تو دنیا اور دنیا کی مسرتیں تو ایک طرف یہ گنبد نیلگوں جو آفتاب کی ضیا پاشیوں سے منور اور ماہتاب کی سیم افشانیوں سے بقعۂ نور بنا رہتا ہے۔ میری نظروں میں تیرہ وتاریک ہو جائے۔ اس شعر سے ایک طرف تو عاشق کا اپنے محبوب سے انتہائی تعلق خاطر ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ آپ کسی حالت میں بھی اپنی تجلیات سے محروم نہ کریں اس لئے کہ یہ ایک بڑی ہی جانکاہ مصیبت ہوگی اور دنیا میری نظروں میں اندھیری ہو جائے گی ؎

رگِ جاں سے ہوا ہے خون جاری　　　یاد تیری پلک کی نشتر ہے

سادگی اور صفائی اس شعر کا جوہر ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر اس شخص کا ہے جس کے عہد کی زبان کا عام انداز یہ تھا۔

اگر ملک ہونا تو لشکر رکھو　　　سپہ ایک سوں ایک بہتر رکھو

تمن سب کو یو بات کا فام ہو　　　تمہارے انگے یو کتیا کام ہے

وصیت کئے لگ اُسے گھیان تھا — اسے ملک فرزند کا دھیان تھا
اجل آئی تو چھوڑا سارا گیا — اجل کا نہیں کوئی بیتیارا کیا

(دفایز از مثنوی رضواں شاہ)

مجبوب کی تعریف :-

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیماب ہے

مجبوب کی تعریف مشرقی شاعری کا ایک غیر مختتم باب ہے ہر شاعر عشوہ ترکانہ اور غمزہ بے باک کی داستان غارت گری میں مصروف رہتا ہے زلف چلیپا، گلاب انشاں جبیں، نرگس بیمار، عارض روشن، لب لعلیں، رُخ سیمیں، سلک گُہر، سینۂ شفاف، کمر زریں، ساق بلوریں، اس باب کے مستقل عنوانات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر شعرائے اردو کے دواوین کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے ہر عنوان کے تحت ایک اچھا خاصا لٹریچر جمع کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال ہمیں اس زحمت کشی کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ولی نے اپنے مجبوب کی کیا تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیماب ہے

اس شعر کی ساری خوبی اس کی سادگی اور بے تکلفی میں پنہاں ہے جس زمانے کی زبان کا نمونہ اوپر دیا جا چکا ہے اُس عہد میں ایسے صاف اشعار کہنا بجائے خود ایک بڑا کمال ہے لیکن ولی نے اس اجمالی تعریف پر اکتفا نہیں کی ہے۔ آگے فرماتے ہیں ؎

سوادِ خطِ خوباں دلکشی میں — بہارِ گلشنِ ریحاں ہوا ہے

ترا قد ائے بہارِ گلشنِ ناز — مثالِ سرو زیبِ صد چمن ہے

ترے لب پر جو خط عنبریں ہے — خطِ یاقوت سوں نقشِ نگیں ہے

چمن آرائے باغ خوش ادائی — نہالِ قد سرو گل جبیں ہے

ان اشعار میں ولی نے اپنے مطالب کو روانی و سلاست سے نہایت سادے انداز میں پیش کیا ہے باریکی، پیچیدگی اور نازک خیالی کا شائبہ تک نہیں ملتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تکلف و تصنع، باریک بینی اور دقت نظری کسی زبان کے ابتدائی دور میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ بے تکلفی اور بے ساختگی ابتدائے زبان کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو خیال جس صورت سے ذہن میں وارد ہوتا ہے شاعر ٹھیک اسی طرح الفاظ کے جامے میں اُسے جلوہ گر کر دیتا ہے۔ عام طور پر نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی ایسے موقعہ پر نا ممکن ہے کیونکہ زبان ابھی ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تاہم ولی چونکہ آپ اپنی دنیا کا پروردگار ہے وہ شعرا کی عام صفوف سے ممتاز ہے اس کے یہاں امتیاز و استثنار کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں اور وہ مضامین جو میر و سودا کے زمانے میں شعرا کے قلوب میں الہام ہوئے ولی کے معمولی اور پیش پا افتادہ مضامین ہیں۔ ولی فرماتے ہیں ؎

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب — تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

دیکھا جو تجکو آپ سے روشن جہان میں ۔۔۔ شرموں لیا نقاب زریں سر پہ آفتاب
گرمی سے بیقرار ہو نکلا ہے سینہ کھول ۔۔۔ تجھ عشق کا پیاہے مگر ساغر آفتاب
تجھ مکھ کے آفتاب اُپر گر کرے نگاہ ۔۔۔ پنہاں ہو ہر نظر ستی چوں شپّر آفتاب
جگ میں ولی سو کس کو برابر کہے ترے ۔۔۔ ذرّے سے ہے نزیک ترے کمتر آفتاب

میر تقی میر نے بھی اسی ردیف قافیہ میں غزل کہی ہے۔

منہ دھونے اس کا آتا تو ہے اکثر آفتاب ۔۔۔ کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب
اس رُخ کی روشنی میں نہ معلوم کچھ ہوا ۔۔۔ ہے گم کدھر ہوا ہے گیا کیدھر آفتاب
سر صدقے تیرے ہونے کی خاطر بہت ہی گرم ۔۔۔ مارا کرے ہے شام و سحر چکّر آفتاب
روشن ہی یہ کہ خوف ہے اس غصہ ور کا میر ۔۔۔ نکلے ہے صبح کانپتا جو تھر تھر آفتاب

اس میں کوئی کلام نہیں کہ میر کی غزل ولی سے بڑھی ہوئی ہے لیکن کیا عجب کہ ولی کی غزل کی بلند خیالی، نکتہ آفرینی اور جدت بیان نے میر کو اس طرف متوجہ کیا ہو اور "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" کے اصول پر انھوں نے یہ غزل لکھی ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ بنیاد ولی ہی کی رکھی ہوئی ہے نقش و نگار البتہ میر صاحب کے مرہون منت ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف میر صاحب کو پورے طور پر ہے وہ ولی کے شرفِ تقدم و اولیت کا لحاظ رکھتے ہیں چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے ۔۔۔ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

میر کا معیار نقد بہت بلند تھا چنانچہ اکثر شعرا اور باکمالوں کو اس کی شکایت رہتی تھی کہ میر صاحب کسی کے کمال کے معترف نہیں اور یہی وجہ تھی کہ جب میر صاحب کسی کی تعریف کر دیتے تو وہ خود کو نہایت معزز و مفتخر خیال کرنے لگتا۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ مشاعرے میں مصحفی اپنی غزل پڑھ رہے تھے لیکن میر صاحب خاموش تھے جب اس شعر پر پہنچے ؎

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا ۔۔۔ دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب نے سر اُٹھایا اور دوبارہ پڑھنے کو کہا اس پر شیخ مصحفی اس قدر مسرور ہوئے کہ وہیں کہا جب دیوان چھپواؤں گا تو اس شعر کے ساتھ حاشیہ بھی لکھ دوں گا کہ یہ وہ شعر ہے جسے میر صاحب قبلہ نے مکرر پڑھوایا تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میر کی تنقید کا معیار کتنا بلند تھا اور لوگ ان کی تنقید کا کیا پایہ سمجھتے تھے۔ اب میر کا شعر ولی کے متعلق پھر پڑھئے اور اس کی اہمیت کا اندازہ کیجئے

واردات و کیفیات

عشق بے پایاں ہے، ضروری ہوا کہ واردات و کیفیاتِ عشق بھی گوناگوں، بے پایاں و بے کنار ہوں لکھنوی شاعری ناسخ و آتش کے زمانے میں جذبات محبت کی سچی محاکات سے محروم ہو کر زلف و کاکل کے پھندوں میں گرفتار ہو گئی اور اپنی

ساری توجہ کا مرکز کنگھی، چوٹی، انگیا، کرتی کو بنا لیا تھا۔ اے کاش اُردو نظم کے ابوالآباء دکنی کی جذباتی شاعری جس کی دلاویزی، شیرینی، بے تکلفی اور لطافت آج بھی ہمارے لئے سبق آموز ہے، شعرائے لکھنؤ کے سامنے ہوتی کیف محبت کی کتنی سادہ اور معصوم تفسیر ہے جو ولی کا یہ شعر پیش کر رہا ہے۔

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں — پیارے تری بات پیاری لگے

وقت اور زمانے کا کوئی تعین نہیں تم خوش ہو، خفا ہو، ناراض ہو، تیوری پر بل ہوں، یا لبوں پر مسکراہٹ، ہر حال میں تمہاری باتیں دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کوئی تشبیہ ہے نہ استعارہ۔ الفاظ صاف سلیس، شستہ، موتی کی طرح ڈھلک رہے ہیں۔ شعر کی شرح کرنا چاہو تو نہیں ہو سکتی۔ ولی کا یہ شعر میر تقی میر کے مشہور شعر

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سے ٹکر کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

بے کسی کے حال میں یک آن میں تنہا نہیں — غم ترا سینے میں میرے ہمدم جانی ہوا

دنیا میری بدحالی و بیکسی کو دیکھ کر سمجھتی ہے کہ میں یکہ و تنہا بے یار و مددگار ہوں لیکن اسے کون سمجھائے کہ تیرا درد، میری محبت میرے سینے میں مصروف غمگساری و دلنوازی ہے اور میں اپنی ساری بدحالیوں اور شکستہ سامانیوں کے باوجود ایک لمحے کے لئے بھی تنہائی و مہجوری کا غم محسوس نہ کر سکا۔

مندرجہ ذیل اشعار ولی کی سادہ جذباتی مصوری کا انداز پیش کرتے ہیں۔

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم — کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

بے منت شراب ہوں سرشار انبساط — تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا

اے صنم تیرے دہن کے شوق میں — ہر کلی میں نعرۂ ناقوس ہے

عشق مجازی اور ولی

ولی کے سوانح زندگی کی اکثر و بیشتر حقیقتیں ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں، ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ولی عشق مجاز کے لذت آشنا تھے یا نہیں تھے لیکن اتنا تو بہر حال مسلم ہے کہ ان کے کلام میں چند ایسی غزلیں ملتی ہیں جو کسی طرح روحانیت کے دائرے میں نہیں آسکتیں اور وہ شدید تعلق خاطر اور اُس کی نوعیت جو ان غزلوں کے حرف حرف سے ظاہر ہے بتلاتی ہو کہ ولی کا محبوب اسی دنیا کا بسنے والا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف — اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے — یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی بجن باری اس بت کو پچاتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھوں کو لگاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت — یکبار ارے موہن چھاتی سے لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

اس غزل کے ہر شعر میں درد، تڑپ، التجا اور آرزو پنہاں ہے وہ صاف طور پر ولی کی دل باختگی کا اعلان کر رہی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ اس قسم کی غزلیں مخرب اخلاق اور حیا سوز ہوتی ہیں ان کا ذکر ہی نہ کرنا بہتر ہے لیکن میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نفس شاعری کو اخلاقی مسائل سے بہت کم تعلق ہے اور ایک شاعر کے کلام پر تنقید کرنے کا صحیح معیار شاعرانہ نقطہ نگاہ ہے نہ کہ اخلاقی زاویہ نگاہ۔

تصوف ولی کے کلام میں تصوف کے مضامین کی کثرت ہے۔ ولی بسلسلہ طالب علمی عرصہ تک احمد آباد رہے اور حضرت شاہ وجیہہ الدین قدس سرہ سے دست بیع ہونے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب سے خاص اخلاص وعقیدت رکھتے تھے۔ ولی کے متصوفانہ میلان خاطر پر اس حقیقت سے بھی کافی روشنی پڑتی ہے کہ جب وہ دلی میں آئے تو اگرچہ انہیں یہاں بہت لوگوں سے ملنے جلنے کا سابقہ پڑا لیکن ولی سب سے زیادہ متاثر حضرت سعد اللہ شاہ گلشن سے ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف، فقر و قناعت ان کی طبیعت میں داخل تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے — سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے
نکال خاطر فاتر سوں جام جم کا خیال — صفا کر آئینہ دل سکندری یہ ہے
خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر — کہ عاشقاں کے نزک شیشہ پری یہ ہے
بساء عزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست — تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

اشعار صاف اور سلجھے ہوئے ہیں مطلب بیان کرنے کی حاجت نہیں البتہ کشتی دل کی داد دینا ضروری ہے حق یہ ہے کہ نیکی کی زندگی بسر کرنا جادۂ اعتدال سے قدم نہ ہٹانا اور دنیوی آلائشات سے دامن بچانے کی روشن اور واضح تعبیر جس خوبی کے ساتھ کشتی دل کے سنبھالنے سے کی گئی ہے وہ اور طرح ممکن نہیں آگے فرماتے ہیں۔

پایا ہوں ولی سلطنت ملک قناعت — اب تخت و چتر حق میں مرے ارض وسما ہے

منازل تصوف چار ہیں۔ شریعت۔ طریقت، معرفت اور حقیقت۔ منزل شریعت میں سالک خود کو عبادت وریاضت کے لئے وقف کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ طریقت کی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور عبادات جسمانی سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن تصور حضرت باری تعالیٰ کا ہر وقت اور ہر گھڑی دل میں رکھتا ہے گویا زندگی کا ہر لحہ عبادت وریاضت ہی میں بسر کرتا ہے اب اس کے دل پر ذات الٰہی کی تجلیات منعکس ہونی شروع

ہوتی ہیں۔ یہی منزل معرفت کی منزل ہے اس کے بعد حقیقت کی منزل آتی ہے جہاں پہنچ کر سالک ہمہ تن نظارۂ انوار خدا میں محو ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی حقیقت بھی فراموش کر دیتا ہے لیکن اس منزل پر پہنچ کر سالک کی حیرت انتہا تک بڑھ جاتی ہے اور نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں اپنے محبوب کی ثنا بیان کرے۔ ولی اسی منزل پر پہنچ کر فرماتے ہیں۔

اے ولی تعریف اس کی کیا کروں ۔۔۔ ہر طرح مستغنی از اوصاف ہے

یوں تو خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا میں بہت سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن واقعہ یوں ہے کہ وہ ہر طرح تعریف و توصیف سے بالاتر اور ہر حمد و ثنا سے بے نیاز و مستغنی ہے۔ یہ نکتہ ہر شخص پر نہیں ظاہر ہوتا اس نکتے کو وہی خوب جانتا ہے جو مشاہدۂ جمال میں ہمہ تن مصروف ہے۔ ولی کے اس شعر میں لفظ ولی نے ایک خاص زور اور مناسبت پیدا کر دی ہے۔

دو چار شعر اور ملاحظہ ہوں۔

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہے خبر ۔۔۔ بے گماں وہ جہاں میں غافل ہے

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل ۔۔۔ اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

شاعرانہ تعلّی

شعرا کا عام دستور ہے کہ اپنے کلام میں خود کہیں کہیں فخر و تعلّی سے کام لیتے ہیں اور اپنے کلام کے حسن و خوبی کی طرف خود ہی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ دستور برا نہیں ہے بشرطیکہ واقعی اور صحیح خوبیاں گنائی جائیں البتہ جب مبالغہ جھوٹ اور بے سر و پا باتوں سے کام لیا جائے تو یہ شاعرانہ تعلّی خود شاعر کی ہجو بن جاتی ہے۔ فارسی شعرا میں جس نے فخر و تعلّی کے مضامین کو ایک مستقل صورت بخشی وہ عرفی ہے۔ عرفی نے پوری پوری غزلیں اور قصیدے اسی مضمون کے تحت لکھ ڈالے ہیں اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود داری، مردم گریزی اور رفعت تخیل نے ان قصیدوں اور غزلوں میں ایک خاص شکوہ اور تمکنت پیدا کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ عرفی کے محاسن شاعری کے لحاظ سے یہ تعلیاں اس پر پھبتی بھی ہیں۔ ولی نے ریختے میں صفائی، چستی، متانت اور وسعت پیدا کی اور لفظی و معنوی ہر لحاظ سے مستقل اضافے کئے اپنی ان خدمات کا انھیں پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے بھی فارسی شعرا کی طرح فخر و ناز کے مضامین باندھے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور ۔۔۔ اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

بسا ر دل سوں انس کے تریاد خاقانی ۔۔۔ ولی کو دیکھ کر اب رشک انوری یہ ہے

اے ولی لگتا ہے ہر دل کوں عزیز ۔۔۔ شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

تھوڑے سے تفحص و جستجو سے کلیات ولی میں سے فخریہ اشعار نکالے جا سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے مقصود صرف اتنا تھا کہ ولی کے کلام سے اس قسم کے چند اشعار پیش کر کے یہ بتلا دیا جائے کہ ولی کو خود اپنی خوبی و کمال کا پورا احساس تھا اور اس قسم کے جو اشارے ان کے کلام میں ملتے ہیں وہ واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

زاہدِ ریاکار و پیرانِ سالوس زہد و رندی میں فطری عداوت ہے شیخ کے جبہ و عمامہ، ریش و دستار اور تسبیح و عصا پر فقرے کسنا ہمیشہ سے شعرا کا دستور رہا ہے۔ بعض لوگوں نے شیخ کے واقعی عیوب گنائے ہیں اور بجا طعن و تشنیع کی ہے اور بعضوں نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور خواہ مخواہ غریب کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے شعرا کو مشورہ دیا ہے کہ زاہد کو بے سبب ہدفِ ملامت نہ بنایا جائے بلکہ پہلے ان کے کسی نہ کسی واقعی عیب کی طرف اشارہ کر دیا اس کے بعد پھر چاہے جو کچھ کہا جائے تاکہ بیان میں واقعیت اور حقیقت کا رنگ پیدا ہو جائے۔ مولانا کا مشورہ بہت خوب ہے لیکن ہے یوں کہ مندر و خانقاہ کی باطنی زندگی کے متعلق آئے دن اتنے انکشافات ہوتے رہتے ہیں کہ اب اشارات کی ضرورت نہیں رہی۔ مولانا مرحوم کا خطاب موجودہ شعرائے ہے ولی تو بہرحال اس مشورے سے بالاتر ہیں۔ دیکھئے زہاد و شیوخ کے ساتھ ان کا کیا سلوک رہا ہے ؎

آسماں اوپر نہ بوجھو چادرِ ابرِ سفید　　جانماز زاہدِ عزلت نشیں برباد ہے
زاہد کو مثلِ دانۂ تسبیح ایک آن　　کوچے ستے ریا سوں نکلنا محال ہے
شیخ مت گھر سے نکل آج کہ خوباں کے حضور　　گول دستار تری باعثِ رسوائی ہے

پہلے اور تیسرے شعر سے مولانا حالی کو شکایت ہو سکتی ہے لیکن دوسرے شعر میں تو ولی نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ تسبیح کے دانے رشتۂ تسبیح سے نکل نہیں سکتے اور اگر نکلے تو تسبیح کا وجود باقی نہیں رہ سکتا بعینہٖ یہی حال زاہد کا ہے کہ ریا کے رشتے میں جب تک منسلک ہے صحیح معنوں میں زاہد ہے لیکن جہاں ریا کا رشتہ ہاتھ سے گیا پھر زاہد زاہد نہیں رہا۔ ولی نے اس شعر میں زاہد، دانۂ تسبیح اور ریا سے رعایتِ لفظی پیدا کی ہے اور حق یہ ہے کہ یہ رعایت ایک حد تک پُر لطف ہے اس لئے کہ رعایتِ لفظی یہاں اصل مقصود نہیں ہے اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے۔ رعایت الفاظ کی یہ حیثیت جہاں بھی ہوگی مستحسن اور دلآویز ہوگی۔ آگے فرماتے ہیں ؎

زاہد اگرچہ فہم میں ہے بوعلی وقت　　میرے سخن کے رمز کو پایا نہیں ہنوز

ولی نے اس شعر میں زاہد کے اوپر ایک نہایت لطیف چوٹ کی ہے فرماتے ہیں کہ زاہد کی عقل و فہم فکر و نظر سے مجھے انکار نہیں اپنے وقت کا بوعلی سینا ہے (زاہد کو وقت کا بوعلی سینا کہنا نہایت شوخ طنز ہے) لیکن با ایں دعوائے ہوش و دانش مذاق عاشقی سے بیگانہ ہے اور یہی سبب ہے میرے مراتب کا تصور اس کے ذہن و دماغ سے بالاتر ہے اور سخنِ عشق کے رموز و نکات، ناز کی و لطافت کے سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی اس میں اہلیت نہیں
کبھی زیادہ کھُل جاتے ہیں اور بڑی حقارت اور ذلت سے غریب کو سخت ڈانٹ بتاتے ہیں۔

حقیقت سے تری مت سے ہم واقف ہیں اے زاہد　　عبث ہم پختہ مغزوں سے نہ کر اظہار خامی کا

ولی نے زاہدوں پر جتنی بھی پھبتیاں کہی ہیں ان میں واقعیت اور حقیقت کا رنگ ضرور جھلکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص شوخی اور جدت بھی پائی جاتی ہے مثلاً اس شعر میں ؎

آسماں اوپر نہ بوجھو چادرِ ابرِ سفید　　　جانماز زاہدِ عزلت نشیں برباد ہے

آسمان پر پھیلے ہوئے ابر کے ٹکڑاوں کو زاہد کی پھٹی ہوئی جانماز کی دھجیاں کہنا ایک ایسا مضمون ہے جس میں ندرت خیال اور شوخی تشبیہ کی اعلیٰ شانیں موجود ہیں۔ یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ولی کی پردہ دریٔ واعظ محض تمسخر و استہزا کی پوٹ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی ملتی ہیں اور اخلاق پند و نصائح کی طرف مخصوص اشارات پائے جاتے ہیں۔

قصیدہ

ولی نے قصائد کم لکھے ہیں اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طبیعت فقر و قناعت، عزلت و گوشہ نشینی صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی جانب زیادہ مائل تھی، انہیں دنیاداری، خوشامد پسندی، شوکت و حشمت، نام و نمود سے طبعاً نفرت تھی اسی لئے وہ زیادہ قصیدے نہ لکھ سکے، ایران میں اور خود ہندوستان میں قصیدہ گوئی کو ترقی اس وقت زیادہ ہوئی جب درباداری کی دھوم تھی اور شعرا مال و دولت انعام و اکرام کی چاٹ میں بادشاہ وقت کی مدح میں قصائد لکھ لکھ کر لے جاتے اور شاد کام و فیض یاب ہو کر واپس آتے۔ عرفی نے اکبر کی مدح میں نہایت زوردار قصیدہ لکھا ہے جس میں نرگس ردیف قرار دی ہے۔ یہ قصیدہ عرفی کے تخیل کی حیرت کاری کی ایک نادر مثال ہے۔ نظیری نے جہانگیر کی مدح میں جب یہ شعر لکھا۔

اے خاکِ درت صندلِ سرگشتہ سراں را　　　بادہ مژہ جاروب رہت تاجوراں را

تو جہانگیر نے نظیری کو تین ہزار بیگھے زمین انعام میں دی اسی طرح شاہ جہاں نے ایک شاعر کو سونے میں تلوایا تھا مسلمان سلاطین کی شعرا نوازی اور ان کے انعام و اکرام داد و دہش کے اس امنڈتے ہوئے دریا نے چمنستان شاعری کو سرسبز و شاداب بنا رکھا تھا اور خصوصیت کے ساتھ قصیدہ گوئی کو جو ترقی اس زمانے میں ہوئی وہ آج تک نصیب نہ ہو سکی۔

ولی کے دور میں اورنگ زیب فرمانروائے حکومت تھا وہ شعر و شاعری اور موسیقی کو ایک بیکار مشغلہ سمجھتا تھا اس لئے دربار میں شعرا کی قدر نہ ہوتی تھی اور اس کے بعد سلطنت مغلیہ کے اچھے دن ختم ہو گئے۔ چنانچہ ولی نے جتنے قصیدے کہے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو سلاطین امرا، یار و سنار کی مدح میں کہا گیا ہو۔ کچھ تو خوشامد و تملق سے ان کی طبعی نفرت اور کچھ ماحول کے اثر نے انھیں موقعہ ہی نہیں دیا کہ وہ کسی امیر یا رئیس کی شان میں قصیدہ کہیں ان کے تمام قصیدے نعت، منقبت یا اپنے مرشدوں کی تعریف و توصیف میں ہیں لیکن ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی میں ولی کو خصوصیت سے کمال حاصل تھا۔ ہم جب مولانا احسن مارہروی کی یہ رائے "ولی غزل کی طرح قصیدے میں کوئی خاص امتیازی حیثیت نہیں رکھتے"، پڑھتے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے اور نہیں سمجھتے کہ جس کے دیوان میں یہ قصیدہ ؎

ہوا ہے خلق پیر پھر کے فضلِ سبحانی　　　کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی

موجود ہو اس کی قصیدہ گوئی اور علو خیالی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ولی نے یہ قصیدہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی مدح میں لکھا ہے۔ اس کے بعض بعض شعر درج کئے جاتے ہیں۔

تمام پات تسبیح بجمدہٗ کے بہ حکم　　　زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
قطار قطرۂ شبنم سے آج سبزۂ خضر　　　لے سبحہ ہاتھ میں کرتا ہے ادعیہ خوانی
اس آب روح فزا کے کمال لطف کو دیکھ　　　چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی
چمن میں اس کے کرم نے دیا ہے حکمت سے　　　ہر ایک پھول کی پکھڑی کو رنگ ریحانی

پھر شاہ صاحب کے روضے کے چراغوں کے متعلق فرماتے ہیں

چراغ یاں کے ستارے نمن ہیں گردانت　　　دیئے ہیں چرخ کو تعلیم سبحہ گردانی
نئے قلم ہے مرا نیشکر سے شیریں تر　　　کیا ہوں لبکہ حلاوت سے شکر افشانی

قصیدے میں چار عناصر ہوتے ہیں۔ تشبیب۔ گریز۔ مدعا اور دعا ابتدائی حصّے کو تشبیب کہتے ہیں اس حصّے میں عشق و محبت، بہار، آشوب زمانہ جفائے فلک یا اسی قسم کے اور مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ گریز میں شاعر ایک نہایت لطیف پیرائے اور حسن انداز کے ساتھ عرض مدعا یعنی ممدوح کی مدح و ثنا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ گریز کا مقام بہت نازک ہوتا ہے دو مختلف مضامین کو ایک ایسے مرکز پر لانا پڑتا ہے کہ دونوں میں ربط قایم ہو جائے اور کہیں ناہمواری یا بے ربطی نہ معلوم ہو۔ ولی نے مندرجہ بالا قصیدے کی ابتدا بہار سے کی ہے اور بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ ذہن آہستہ آہستہ خود ان کے مدعا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور گریز کا کمال یہی ہے کہ اس میں آورد نہ ہو بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ تشبیب کہاں ختم ہوئی اور گریز کہاں سے کیا اور مطلب کس جگہ سے شروع ہوا ہم یہاں گریز کے موقع کے دو تین شعر درج کرتے ہیں اس سے ولی کی اُستادی کا حال معلوم ہوگا۔

تمام ملک ہوا حق کے فضل سے آباد　　　رہا نہیں ہے جگت میں نشان ویرانی
زہے بہار حلاوت زہے بہار طرب　　　کہ بلبلاں نے لیا شیوۂ غزل خوانی
چراغ گرد یہ روضے کے جو ہوئے روشن　　　ہر اک چراغ ہے جیوں آفتاب نورانی

بہار کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ بزم عیش و نشاط، موسم بہار کی طرب افشانی۔ عنادل کی نغمہ پردازی۔ پھولوں کی عنبر بیزی اور جلسہ ہائے طرب کی روشن و منور راتیں سرو چراغاں کے مناظر ایک ایک کرکے ذہن کے سامنے آتے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ روضے کے چراغوں کی نور افشانی کی بھی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ پورا قصیدہ پڑھ جایئے کہیں ناہمواری بے ربطی یا خلا کا نام و نشان نہ ملے گا۔ گریز کی اس درجہ چست اور موزوں مثالیں کم ملتی ہیں

مثنوی

مثنوی کی وسعت و ہمہ گیری، مقبولیت و ہر دلعزیزی سے متعلق ایک اجمالی بحث اسی تحریر میں کسی جگہ کی جا چکی ہے اُسے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ مثنوی میں ولی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افسانوی عشق و محبت، جن و پری کے قصے اور مافوق الفطرت داستانوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ مثنوی "دہ مجلس" جو ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہے وہ ان کی نہیں ہے بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔

ولی کی مشہور مثنوی وہ ہے جو انھوں نے سورت کی تعریف میں لکھی ہے یہ مثنوی اپنی مختلف خصوصیات کے باعث اس قابل ہے کہ وہ اُردو

کی جدید مثنویوں کے مقابلے میں بلا تامل پیش کی جاسکتی ہے۔ ولی کے ماقبل اور ہمعصر شعراء کا یہ حال ہے کہ محبت و الفت کے بے سر و پا اور ناممکن الوقوع افسانے جن میں مبالغہ کا عنصر مضحکہ انگیز حد تک بڑھ گیا ہے بہت لطف اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں جب ہم ولی کی مثنوی سورت پر نظر ڈالتے ہیں تو لا محالہ ان کے تجدد اور امتیاز کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ شعراء تلامیذ الرحمٰن سے ہیں تو اس کی تصدیق ولی کے کلام سے پوری طرح ہوتی ہے انھوں نے ہر موقع پر اپنی ایک جدید راہ پیدا کی اور اُردو شاعری میں زندگی اور نشو و نما کے سارے خصائص جمع کر دیئے یہ حقیقت ہے کہ اردو شعرا اس مجدد کی نکالی ہوئی راہوں پر اگر چلتے تو لکھنؤ اور دلی کے دو اسکول نہ پیدا ہوتے اور اردو شاعری میں جو ایک زمانے میں عریانی، ابتذال اور سطحیت آ گئی تھی اس کی نوبت نہ آتی اور اب تک ہماری شاعری ترقی کی دو ایک منزلیں اور طے کر چکی ہوتی۔ بہر حال یہ ایک ہونی بات تھی جو ہو کر رہی ہمیں اس موقع پر مثنوی میں ولی کے امتیاز پر گفتگو کرنی ہے۔ مثنوی سورت کے چند ابیات درج ذیل ہیں۔

عجب شہروں میں ہے پُر نور اک شہر	بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
کنارے اس کے اک دریائے تپتی	کہ دنیا دیکھنے کو اس کے ٹپتی
عجب قلعہ ہے واں ایک با قرینہ	انگوٹھی میں دُنیا کی جیوں نگینہ
نزک قلعے کے بار اگھاٹ ہے واں	کہ دائم گلرخاں کی ہاٹ ہے واں
رہے اس حاشیے پر جائے آرام	طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام
کہ اس بھیتر کنے ایسے ہیں تجبار	کہ قاروں کو نزک ان کے نہیں بار

ان اشعار میں ولی نے سورت کی تجارت دولت اور حسن کا ذکر کیا ہے کم و بیش یہ چیزیں آج بھی سورت کی خصوصیات ہیں۔ سورت کے تاجر دولت میں مشہور ہیں، حسن و جمال کے لحاظ سے بھی سورت کے مرتبہ کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولی اپنی مثنویوں میں واقعیت اور حقیقت پر زور دیتے تھے اور انہیں کو موضوع شاعری قرار دے کر ان میں شاعرانہ لطافتیں، زیبائش اور حسن پیدا کرتے تھے و حقیقت شاعری حقائق، واقعات اور تخیل کے ایک شیریں، موزوں اور دلاویز امتزاج کا نام ہے۔ تنہا خیال پردازی اور مبالغہ بدمزہ، بے معنی اور شاعری کے لئے رسوا کن چیزیں ہیں جن سے ولی کا کلام بڑی حد تک پاک ہے ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ جدیدیت کا رنگ کیسی ہمہ گیری کے ساتھ ہمارے اس قدیم شاعر پر چھایا ہوا تھا۔

رُباعی ولی نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور فارسی شعرا کی مکمل پیروی کی ہے رباعی چونکہ صرف چار مصرعوں کی ہوتی ہے اس لئے اس میں متعدد اور الجھے ہوئے خیالات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عموماً رباعی میں کوئی ایک خیال لے لیا جاتا ہے اور چوتھے مصرعے پر ایک خاص جدت اور ندرت کے ساتھ اس کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ ولی کے کمال کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ انھوں نے ہر صنف سخن پر اظہار خیال کیا ہے

اور کامیابی سے عمدہ برآ ہوئے ہیں نمونتاً دو ایک رباعیاں درج کی جاتی ہیں

رکھتا ہوں میں دل میں آہ جانکاہ ہنوز
اے شوخ نہیں اس سے ہے آگاہ ہنوز
تجھ غم سے ہیں گرچہ چشم پر آب دلے
سینے میں بجا ہے آتشِ آہ ہنوز

دنیا کی بے ثباتی اور ترک دنیا کی ترغیب۔

یہ ہستی موہوم دسے مجھ کو سراب
پانی کے اُپر نقش ہے یہ مثل حباب
ایسے کہ اُپر دل کو نہ کر ہر گز بند
اپس کو نہ کر خراب اے خانہ خراب

تاثیر دل نشینی اور سبق آموزی ولی کی رباعیات کا مایۂ خمیر ہیں اور ان خصوصیات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رباعیوں میں بھی اپنا درجہ ولی نے قایم رکھا ہے۔

ولی نے مخمس۔ مستزاد اور قطعات بھی کہے ہیں جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن مستزاد و قطعات غزل اور مثنوی کے ضمن میں آجاتے ہیں ان پر الگ بحث کرنا طوالت کا باعث ہوگا لہذا یہ چیزیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔

تشبیہ و استعارہ

تشبیہ و استعارہ کلام کے زیور ہیں اگر سلیقے سے انھیں کام میں لایا جائے تو کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے تشبیہ و استعارہ کی مدد سے ایسی طویل باتیں بھی جو صفحوں میں بیان نہیں کی جا سکتی ہیں چند جملوں یا لفظوں میں آسانی بیان کی جا سکتی ہیں۔ ولی فرماتے ہیں۔

آسماں اوپر نہیں ہے چادر ابر سفید
جانمازِ زاہد عزلت نشیں برباد ہے

جانماز کی دھجیوں کے انتشار کو بیان کرنے کا اس سے بہتر اور پُر لطف طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں چادر ابر سفید کہہ دیا جائے ولی کی تشبیہوں میں عموماً تازگی شگفتگی اور جدت ہوتی ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ
انگوٹھی میں دُنیا کی جیوں نگینہ

شہر سورت کے قلعے کی تعریف کر رہے۔ دنیا کو ایک عظیم الشان انگوٹھی فرض کیا ہے اور سورت کے قلعے کو اس انگوٹھی کا نگینہ قرار دیا ہے۔ تشبیہ کی یہ ایک عمدہ اور شگفتہ مثال ہے

ہوا معلوم تجھ زلفاں سے اے شوخ
کہ شاہِ حسن پر ظلِ ہما ہے

چہرہ کا استعارہ شاہ حسن سے کیا ہے اور پھر زلفوں کو ظل ہما سے تشبیہ دی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جس کے اوپر ہما کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جائے گا ولی کو اس کا تو یقین ہے کہ محبوب حسن کی دنیا کا بادشاہ ہے اس مناسبت سے ظل ہما کا خیال پیدا ہوتا ہے اور زلفوں کی سایہ فگنی کو دیکھ کر معاً یقین ہو جاتا ہے کہ یہ زلفیں نہیں ظل ہما ہے مضمون منطقیانہ ہو جاتا ہے لیکن کیفیت سے خالی نہیں ہے۔

رُوئے زمیں کا خال ہو زینت میں اے صنم تیرا جو مثلِ نقش قدم پائمال ہے

محبوب کے نقش قدم کو روئے زمین کے خال سے تشبیہہ دینا ندرت خیال کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ ولی کے یہاں عام اور پامال تشبیہیں نہیں ہیں ان کی تشبیہوں میں کیف حسن اور دلاویزی پائی جاتی ہے۔ تھوڑی سی جستجو سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

صنائع وبدائع

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم فرماتے ہیں "قابل عزت ہیں وہ تمام فضلا جنھوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلادی جائیں تو شعرا کا ذرا بھی نقصان نہیں" اور مہدی الافادی کا قول ہے "کسی نازنین کی زلف عنبریں جو شانوں پر بکھری ہوئی حسن انتشار کے ساتھ کمر سے نیچے جا پڑی ہو کیفیت سے خالی نہیں ہوتی لیکن گرہِ شب یعنی جوڑے کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے"، ڈاکٹر مرحوم جس چیز کے خلاف ہیں ہمارا انشا پرداز اُسے سرمایہ دلکشی تصور کرتا ہے اور ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ صنعتوں میں اگر شائبہ تکلف نہ پایا جائے۔ بے ساختگی اور آمد ہو تو لاریب وہ گرہ شب سے کم دلکش نہیں۔ صنائع وبدائع کو اصل مقصود سمجھ لینا اور ان کی خاطر مضامین کا خون کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دلہن کو زیورات کی کثرت سے اس طرح ڈھک دینا کہ حسن فطری روپوش ہو جائے لیکن یہی چیز اگر سلیقے سے استعمال ہوئی ہوتی تو فطری دلاویزی ودلکشی جو اصل مقصود ہے کہیں بڑھ جاتی۔ ولی نے صنعتوں سے ضرور کام لیا ہے لیکن آورد اور بدسلیقگی کے ساتھ نہیں۔ ایہام کا ان کے ہمعصر شعراء کے کلام میں زور ہے اور عجیب تر یہ کہ شعرائے مابعد بھی صنعت ایہام کے فریفتہ تھے درانحالیکہ وہ خود کو ولی کا متبع ومقلد بتلاتے تھے اور ولی کے یہاں یہ چیز ان کے ماحول کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز طور پر کم ہے۔ ولی نے چند گنی چنی صنعتیں استعمال کی ہیں اور اس طرح استعمال کی ہیں کہ ان سے مضمون کی وضاحت اور حسن کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے

حسن تعلیل ؎

اِس آب روح فزا کے کمال لطف کو دیکھ چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی

آب حیواں، زندگی جاوید بخشتا ہے اس وصفِ خاص میں اُس کا ہمسر کوئی نہیں لیکن باران رحمت نے دنیا کے ذرّے ذرّے کو اس طرح سیراب وشاداب کر دیا ہے کہ آب حیوان نادم ہو کر رہ گیا اس لئے کہ فیوض وبرکات میں وہ باران رحمت کا حریف نہیں بن سکا۔ چنانچہ احساس ندامت سے وہ پردۂ ظلمت میں روپوش ہے۔ ولی نے اس تعلیل میں واقعیت اور خیال آفرینی دونوں کو بکمال اُستادی برقرار رکھا ہے۔

تعلیل کی دوسری مثال ؎

آج تیری نگہ نے مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

نماز جب خشیت اور حضوری قلب کے ساتھ ادا کی جائے تو نمازی پر کیف ومحویت کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کے تصورات کا مرکز صرف ایک ذات ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ صحابہ کرام نماز میں اس درجہ محو ہو گئے کہ ہوا کے پرندے انہیں بے ضرر اور بے جان سمجھ کر اُن پر بیٹھ گئے ولی اس محویت کو ہوش کھو جانے سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ آج تو مسجد سے گذرا

اور تیر نظر کی کرشمہ سازیوں نے سارے نمازیوں کو بیخود و بیہوش بنا دیا۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر ہم یہاں نگاہ سے محبوب حقیقی کی نگاہ سے مراد لیں تو پھر کوئی تعلیل نہیں باقی رہتی لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اس صورت میں آج کا ٹکڑا بے کار ہوا جاتا ہے لہذا وہی پہلا مطلب درست ہوا محبوب حقیقی کے لئے آج کی کیا خصوصیت ہے اس کے جلوے تو ہر آن عارفوں کو مدہوش و بے خبر رکھتے ہیں۔

ایہام کی مقبولیت ولی کے زمانہ میں بہت بڑھی ہوئی تھی لیکن ولی نے اپنے کلام میں اس کا استعمال کم کیا ہے اور جہاں بھی کیا ہے سلیقے اور خوبی کے ساتھ۔ فرماتے ہیں

اگر اُس شمع روشن کی لگن ہے — خودی سے اولاً خالی ہو اے دل

لگن پر ایہام ہے لیکن یہ ایہام خوبصورت اور گوارا ہے صنعتوں کا اس طرح کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور پسندیدہ بھی ہے۔

مراعاۃ النظیر

محراب تجھ بھواں کی عجب ہے مقام خاص — ہر پنجگانہ اس میں دلوں کی نماز ہے

اس شعر میں، محراب، پنجگانہ، اور نماز میں رعایت لفظی ہے۔

حسن سے خضر نے کیا لبریز — آب حیواں سے جام تجھ لب کا

یہاں خضر اور آب حیواں میں رعایت لفظی ہے۔ مراعاۃ النظیر کی یہ مثالیں مستحسن تو نہیں کہی جا سکتیں ہاں گوارا ہیں۔

صنعت تجنیس۔

خیال اس خال کا جو دل نشیں ہے — سویدا کی نمط جاوے نہ ہرگز

خیال اور خال میں تجنیس ہے

صنعت رد الصدر علی العجز کی چند مثالیں کلیات ولی سے لے کر یہاں درج کی جاتی ہیں۔

نازنیں عالم میں ہوتے ہیں اکثر بے وفا — بے وفا گر تجھ کو بولوں ہے بجا اے نازنیں

ماہ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیز کم نما — کم نما ہے نوجواں میرا برنگ ماہ نو

یار کے دیدار بن دوجا عبث ہے مدعا — مدعائے عاشقاں ہر آن ہے دیدار یار

فارسی اشعار کے ترجمے

یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ کسی زبان سے ترجمہ کرنے کا کام سخت دشوار ہے اور نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے لیکن ولی نے اس خارزار میں بھی قدم رکھا ہے اور کامیابی و کامرانی کے ساتھ اس دشوار گھاٹی کو طے کیا ہے۔ جہاں اردو زبان نے ترجمے کی ساری خصوصیات قبول کرنے کے لئے عذر تنگ دامانی کیا ہے ولی نے وہاں جدید راہیں پیدا کی ہیں۔

ولی نے نظیری کے اس شعر کا

بچناں گرفتۂ جابمیانِ جان شیریں — نتواں تراز جاں ہم امتیاز کردن

جوں کا توں ترجمہ اُردو میں کر دیا ہے۔

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں — مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

اس ترجمے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب ولی سے قبل کے شعرا کے ترجمے پیش نظر ہوں اور باہم موازنہ و مقابلہ کیا ئے۔ حافظؔ کا مشہور شعر ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ صورت و سیرت ہر لحاظ سے شعر مسخ ہو کے رہ گیا ہے فرماتے ہیں۔

دنیا کا حکمت نہ بوجھیں ہرگز جکیاں علم سوں — گاؤ ترنا (ترانہ) عیش کا نس دن پیا کے نام پر

ولی کے ترجمے میں اصل شعر کی موسیقیت اور روح پوری طرح جلوہ گر ہے اس سے قطع نظر زبان بھی انھوں نے وہ اختیار کی ہے جو اُن کی تربیت، اضافہ اور اصلاح کے بعد سارے ہندوستان کی ادبی زبان ہونے والی تھی ترجمے کی یہ خصوصیات سلطان محمد قلی کے شعر میں نہیں ہیں بلکہ بحر اور طرز ادا کے لحاظ سے بھا کا ایک شعر ہو کے رہ گیا ہے۔

نظیری ہی کی غزل سامنے رکھ کر ولی نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہے ناز میں صنم کا زلفاں دراز کرنا — فتنہ کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا

لیکن اسلوب بیان اور مضمون ہر دو نقطۂ نظر سے اُردو میں یہ مستقل اضافہ تھا۔

امیر خسرو کا مشہور شعر ہے۔

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز — درد ہا دادی و درمانی ہنوز

ولی نے بھی انہیں بحر و قوافی میں شعر کہے ہیں اور فارسی کے انداز اور خیال کا چربہ اُردو میں اتارا ہے۔

تو ہے رشک ماہ کنعانی ہنوز — تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

اردو زبان کی وسعت و ترقی کے سلسلے میں ولی کی یہ خدمات ہمیشہ وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

خاتمہ اب جب کہ ولی کی شاعری کے تقریباً تمام پہلو سامنے آگئے یہ آسان ہے کہ ہم مجموعی حیثیت سے ان کے متعلق کوئی رائے قائم کریں ولی سے قبل کے دکنی ادب پر ایک نگاہ ڈالی جا چکی ہے اس کی نوعیت اور حیثیت سے بھی بحث ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہر شخص ولی کے شرف و امتیاز خصوصیت و انفرادیت کا اندازہ بآسانی کر سکتا ہے لیکن گذشتہ صفحات پر جو مباحث پھیلے ہوئے ہیں انھیں سمیٹنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں چند باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ کہنی ہے کہ جہاں تک زبان کی پاکیزگی لطافت اور وسعت کا تعلق ہے ولی کی جدت اس وقت تک

یاد رکھی جائیں گی جب تک اُردو شاعری کے قدردان اس دنیا میں موجود رہیں گے معلوم نہیں کتنے الفاظ۔ ترکیبیں۔ محاورے جو دکنی زبان میں عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے تھے، ولی نے اس لئے ترک کر دیے کہ ان میں زمانے کا ساتھ دینے کی اہلیت نہ تھی۔ یہ ایک بڑا ایثار تھا ایک زبردست قربانی تھی جو صرف اُردو شعر و ادب کی خدمت کے لئے کی گئی۔ دوسری طرف ان تھک مطالعہ، تفحص، جستجو، تحقیق اور کاوش کے ساتھ نہ صرف خالی جگہیں پُر کی گئیں بلکہ نئے الفاظ۔ جدید محاورے۔ چست ترکیبیں۔ شگفتہ بندشیں، شیریں اسالیب بیان اضافہ کئے گئے۔ اُردو کے چشمے کو پاکیزہ اور شیریں رکھنے کے لئے غلیظ و کثیف موریوں کا سلسلہ کاٹ دیا گیا اور پانی کی صاف و شفاف نہریں اس سے ملا دی گئیں۔ کیا زمانہ ولی کی ان عظیم الشان خدمات کو فراموش کر سکتا ہے؟ یہ تو تھے معنوی اضافے جو ولی نے اردو میں کئے۔

اُردو شاعری کے ظاہری سر و سامان کے سلسلہ میں ولی کے قبل صرف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کا نام لیا جاتا تھا نظم کی کل کائنات یہی تھی۔ فارسی بحور و اوزان قوافی و ردیف کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ شعرا اکثر و بیشتر ہندی بحروں میں اشعار کہتے لہٰذا عموماً ان کے نتائج فکر دوہرے کبت اور گیتوں کی شکل اختیار کر لیتے۔ ولی کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا فارسی اوزان بحر اور ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ کہا۔ ان کے مضامین عالیہ نگنائے عروض فارسی میں آکر ایک خاص موزونیت کشش زور اور تاثیر کے مالک بن گئے۔ شعرا کے افکار پہ ہندی بحروں کا لباس کچھ ڈھیلا ڈھالا اور غیر موزوں سا معلوم ہوتا تھا ولی نے اس نکتے کو سمجھا اور اپنے خیالات و تصورات کے لئے فارسی عروض کا چست لباس تجویز کیا مزید براں مروجہ اصناف سخن میں بھی اضافے کئے۔ غزل، قصیدہ، اور مثنوی کے علاوہ ان کے دیوان میں مستزاد، ترجیع بند، رباعیاں اور قطعات بھی موجود ہیں یہ ساری چیزیں شعرائے مابعد کے لئے شمع راہ بنیں اور انھیں کی بنیاد پر اُنھوں نے عالیشان عمارتیں کھڑی کر دیں۔

ولی کی غزلوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ دہلی و دکن کے متعدد شعرا ان کے اتباع میں شعر و سخن کی مشق کرنے لگے۔ مولانا آزاد ولی کے کلام کی مقبولیت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "غرض جب اُن کا دیوان دلّی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے، قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سُنانے لگے، جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا"

اس حیرت انگیز مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ زبان شُستہ رفتہ دلکش و دلاویز تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ جدید مضامین و خیالات جو اب تک نظم اُردو میں داخل نہیں ہوئے تھے خواہ مخواہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ غزلوں میں خصوصاً ولی نے ہر قسم کے مضامین لکھے ہیں، "آلام محبت"، "معشوق کی تعریف"، "واردات و کیفیات"، "فقر و تصوف"، "شاعرانہ تعلّی"، "زاہد ریا کا دیران سالوس" وغیرہ مختلف سُرخیوں کے تحت اُن کی غزلوں کے اشعار پیش کر دیے گئے ہیں ان سے ولی کی شاعری کی جامعیت اور وسعت کا

پتہ چلتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اردو شعر و شاعری پر مختلف دور گذر چکے ہیں اور ہر دور میں اردو شاعری برابر اپنا قالب بدلتی رہی ہے۔ پھر بھی مندرجہ بالا عنوانات کی اہمیت جوں کی توں قایم ہے تو ہمیں بے اختیار دلی کو اردو شاعری کا ابوالآبا تسلیم کر لینا ہوتا ہے قصیدہ اور مثنوی پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے ان اصناف میں بھی ولی نے اپنا رتبہ قایم رکھا ہے۔

اُردو شاعری میں وؔلی کا رُتبہ

از

جناب زین العابدین صاحب متعلم بی۔ اے آنرز مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

بیدؔل، میرؔ، مومنؔ، ناسخؔ، انیسؔ اور دبیرؔ وغیرہ کا رتبہ اردو ادب میں مقرر ہو چکا لیکن ہنوز چند ایسے شاعر ہیں، جن کے متعلق آرا میں اختلاف ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور غالبؔ کی حیثیت ہومر اور رودکی کی طرح متعین نہیں ہوئی بلکہ ان کا حال گیٹے (Goethe) کا سا ہے جو ہر زمانہ میں رنگ بدلتا رہتا ہے گو موجودہ زمانہ کے غیر جانب دار نقاد ادبی دنیا میں ان کی جگہ مقرر کر رہے ہیں لیکن بالاتفاق ان کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی حال ولی کا ہے، صاحب "مغل اور اُردو" نے ولی کو مشاہیر کی صف کے قابل ہی نہیں سمجھا، خود اُن کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں شمالی ہند کے بعض شعرا نے اُن کی مخالفت کی مثلاً

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق　　　اگر مطلع لکھیں ناصر علی کوں

اس کے علاوہ جا بجا ولی نے حاسدوں کا ذکر کیا ہے لیکن بعض ہمعصر تذکرہ نویسوں نے اُن کو مسلم الثبوت اُستاد بھی مانا ہے۔ مضمون ہذا میں ہم ولی کا صحیح رتبہ قایم کرنے کی کوشش کریں گے، اس کے لئے ہمیں اُن کا ماحول، شخصیت، تعلیم و تربیت، متقدمین اور معاصرین کے کلام کا مطالعہ ان کا اثر ولی کے کلام پر اور دیگر واقعات زندگی سے مدد لینی چاہئے۔

عام حالات زندگی

ولی کے متعلق تذکرہ نویسوں نے بہت اختصار سے کام لیا، اُن کی زندگی کے عام حالات اتنی وضاحت سے نہیں لکھے کہ ایک محقق ان سے بآسانی کوئی نتیجہ اخذ کر سکے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اُن کی شخصیت کی تشکیل کن عناصر سے ہوئی کسی تذکرے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ملتا کہ وہ ایک ولی کامل اور حقایق و معارف سے آگاہ اپنے زمانہ کے بڑے عالم اور جامع شریعت تھے، آزادانہ مشرب اور درویشانہ روش پر عامل تھے قناعت و توکل، صبر و رضا، تصوف اور مطالعہ کتب سے خاص دلچسپی تھی۔ احمد آباد، سورت اور دہلی کے سفر کے متعلق بھی مختصر معلومات ملتی ہیں۔ تعلیم و تربیت کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد

بیس برس کی عمر میں تحصیل علوم کے شوق نے ابھارا، اُس زمانہ میں احمد آباد دارالعلوم تھا خصوصاً مولانا وجیہہ الدین العلوی گجراتی المتوفی ۹۹۹ھ کا مدرسہ مشہور تھا یہاں ولی کئی سال تک علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں مشغول رہے اور پھر علوی خاندان کے سجادہ نشین سے طریقہ قادریہ شطاریہ کے مطابق بیعت کی اور اپنے اصل وطن اورنگ آباد واپس آئے، پیدائش ۱۶۸۶ء وفات ۱۷۴۴ء

(بحوالہ کلیات ولی، مرتبہ احسن مارہروی)

مندرجہ بالا حالات سے ہم یہ استنباط کرسکتے ہیں کہ ولی کی شخصیت تصوف میں رنگی تھی، اس زمانہ میں تصوف کا چرچا بھی عام تھا شعرا اور مشائخین میں اس کی خاص قدر تھی، اس کے علاوہ ولی کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جبکہ بادشاہان وقت علم و ہنر کے بڑے قدر دان تھے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کے حکمراں اپنی ادب نوازی کے لئے اُردو میں ہمیشہ ممتحن رہیں گے، ان کی قدردانی نے ابتدائی دور اُردو کو مختلف اصناف سخن سے مالا مال کردیا یہ مسلمہ ہے کہ ہر شاعر اپنے متقدمین اور ہمعصر شعراء سے ضرور متاثر ہوتا ہے، ان کی طرز نگارش جملوں کی ساخت یا خاص خاص محاورات و تراکیب کا تتبع قابل فخر ہوتا ہے لیکن قوت فیصلہ کی پختگی کے ساتھ ہر باکمال اس روش کو ترک کرکے اپنی شاہراہ الگ بناتا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ولی اپنے متقدمین اور ہمعصر شعراء کے کہاں تک ممنون ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اُن کے کلام کا مختصر جائزہ لینا ہے۔

ولی سے قبل دکنی شاعری

قدیم دکنی ادب میں زیادہ حصہ مثنوی کا ہے، اس زمانے میں یہ صنف اس لئے مرغوب تھی کہ شعرا عام طور پر عشقیہ مضامین زیادہ باندھتے تھے اس کے علاوہ ہر ادب کے ابتدائی دور میں کہانی اور قصہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اس لئے دکنی میں مثنوی کو فروغ ہوا جو مسلسل داستان کے لئے بہترین صنف ہے۔

اس زمانہ کی دکنی اس قدر پیچیدہ اور غیر مانوس ترکیبوں سے بھری ہے کہ موجودہ زمانہ کے دکنی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے، تغزل میں جو اسلوب اختیار کیا وہ بے حلاوت اور ناقابل فہم ہے خصوصاً شمالی ہندوالوں کے لئے یہ حصہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ البتہ اسی سے اُردو کے ابتدائی مدارج کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ شعراء کا قاعدہ تھا کہ اشعار میں ہندی الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے، بعض جگہ کلام میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فارسی کا جوڑ لگاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مصرع ہندی کا اور ایک فارسی کا،

ہندی کے اس قدر استعمال سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ دیسی زبان کے دلدادہ ہو چکے تھے، ان کی ازحد کوشش یہ تھی کہ فارسی سے قطع تعلق کرکے دیسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنالیا جائے۔ غرض اس زمانہ کی دکنی اُردو زبان کے زمانہ طفلی کی تصویر کے علاوہ کچھ نہیں اور تصویر بھی ایسی کہ اس سے استفادے کی اجازت بمشکل ملتی ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ المتوفی ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پہ نہ کر غیظ محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

محمد قطب شاہ کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ المتوفی ۱۰۸۳ھ جو فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اس کا دیوان بھی موجود ہے

اس کے اردو کلام کا ایک شعر یہ ہے ؎

تیری پیشانی پر ٹیکا چمکتا — تماشا ہے اُجالے میں اُجالا
جو کچھ از پردے میں ہیں غیب کے — سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکارا

اس مختصر نمونہ سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی شاعری دورِ حاضر کے قارئین کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، اس کے مطالعہ سے بجائے انبساط کے ضیق ہوتی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ تنقید میں اس زمانے کے معیار کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

ولی کے ہمعصر شعرا

ولی کے بعض ہمعصر شعرا نے دکن ہی نہیں بلکہ دہلی میں افتخار حاصل کیا، ان کے کلام نے ان کو طبقہ اول کے شعرا میں شمار کرایا۔ چنانچہ فقیر اللہ آزاد اور فراقی کے متعلق میر حسن اپنے تذکرے میں یہ لکھنے کے بعد کہ :-

"باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبان دکنی است"

نقیر اللہ آزاد کی شاعری کی تعریف میں یوں لکھتے ہیں :-

"ہمراہ فراقی دکنی در شاہجہان آباد آمدہ بود، طبع دردمند داشت و بسیار بہ صفا حرف می زند۔ خدا لیش بیامرزد۔"

ان کے علاوہ داؤد جو ایک صوفی مشرب شاعر اور عارفانہ رنگ کے دلدادہ تھے، ولی کے ہمعصروں میں کافی مشہور تھے، ان کے کلام میں تصوف بہت نمایاں ہے، صفائی اور سادگی بھی قابل تعریف ہے۔ ان کی غزلیں محفلوں میں قوال گاتے تھے، درویش صفت طبقہ میں ان کا کلام بہت مقبول تھا۔ اس زمانے کے بعض اور مشہور شاعر یہ تھے، عارف الدین عاجز، عبدالولی عزلت، یار، محرم، ایما، داغ، رنگین، ھدی، عزیز، صارم، قمر، پناہ، رضا، عراقی، قہاب، اشرافت، شہید وغیرہ۔

چونکہ تصوف کو اس زمانہ میں عام مقبولیت تھی اس لئے ولی اور ان کے ہمعصر شعرا میں خیالات کی کچھ نہ کچھ یکسانی ضرور ہے، ولی ان لوگوں کے کلام سے متاثر ہوے ہونگے اور یہ ولی کے کلام سے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے زمانہ کا باکمال تسلیم کر لیا جاتا ہے اسی سے زیادہ استفادہ کیا جاتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ دوسروں کی خوشہ چینی کرے، مرزا غالب کی مثال لیجئے، انگریزی میں شکسپیر کو دیکھئے دونوں نے ابتدا تقلید سے کی لیکن بہت جلد شاہراہ الگ قایم کر لی اور آیندہ نسلوں نے ان کے تتبع کو فخر سمجھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنے ہمعصروں میں ولی کی امتیازی شان کیا ہے، جن خصوصیات نے اُن کو معاصرین سے بلند کیا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ولی کے زمانہ میں شعرا صنعت ایہام کو شعر کی جان سمجھتے تھے، اس کا استعمال استادی کی دلیل تھی لیکن ولی نے اس صنعت سے ہمیشہ گریز کیا، انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس سے سوائے معنوی پیچیدگی کے کچھ حاصل نہیں اس لئے اُن کی جدت پسند طبع نے اس صنعت کو ہرگز گوارا نہیں کیا۔ یہی حال مرزا غالب کا تھا۔ مرزا کی جدت پسندی مرنے، جینے، کھانے پینے وغیرہ میں بھی اپنی مخصوص حیثیت رکھنا چاہتی تھی۔

(۲) معاصر شعرا کی غزلیات کو دیکھا جائے تو ان میں صرف چند اشعار چوٹی کے نکلتے ہیں، باقی اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

محض بھرتی کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن ولی کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔ اُن کی ہر غزل شروع سے آخر تک مرصّع اور دلپذیر ہے، کہیں قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ چند اشعار پڑھنے کے بعد چھوڑ دے بلکہ از اوّل تا آخر ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۳) فضول مبالغہ آمیزی سے اُن کو نفرت تھی اُن کے کلام میں تصنّع یا بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں۔ البتہ باکمال شعرا کی طرح شاعرانہ مبالغہ کہیں کہیں موجود ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جو بجائے خود عیب بھی نہیں۔

ولی کی شاعری کسی شاعر کی نسبت رائے قایم کرنے کے لئے اس کے کلام میں دو چیزیں خاص طور پر دیکھنی چاہئیں اول یہ کہ شعر کی ساخت کیسی ہے یعنی الفاظ کی موزونی ان کا برمحل استعمال فصیح محاورے اور مروّج تراکیب نادر تشبیہات استعارات استعمال کئے ہوں، نحوی، عروضی اور بیانی خصوصیات کا بھی خیال رکھیں، سننے یا پڑھنے میں ترنم ریز ہو، اس کی شکل کو دیکھ کر وجدانی کیفیت پیدا ہو۔ اگر شعر میں یہ خصوصیات ہوں تو اس کی ساخت اعلیٰ درجہ کی ہے، لیکن اگر شعر کی ظاہری صورت ایسی ہے کہ اس کے مطالعہ سے طبیعت منغّض ہو تو ایسے شعر کو بلند مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہوگا اس کے بعد شعر کے معنوی محاسن کو پرکھا جائے، خیالات کی نوعیت اور ان کا اصل سے تعلق۔ اگر فلسفہ یا حکمت نظم ہو تو وہ شاعر کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے یا دوسروں کے نظریوں کو نظم کر دیا ہے؟ اس کا فلسفہ کہاں تک زندگی سے قریب تر ہے؟ اس کے مطالعہ سے قاری زندگی کے متعلق کیا رائے قایم کرتا ہے؟ شعر کا تعلق شاعر کی ذات سے کیا ہے؟ اور اس کی ذات کہاں تک شعر میں جلوہ گر ہے۔

بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو غیر ملکی ادبیات سے واقف نہ ہوں اس لئے ہر شاعر کم و بیش غیر ملکی اسالیب بیان اور خیالات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے لہذا یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ غیر ملکی ادبیات کا کہاں تک ممنون ہے؟ اُردو شاعری تمام تر اسی قسم کی ہے، عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی اس کے زیادہ تر ماخذ ہیں۔ اب ہم ولی کے کلام پر اسی معیار سے تنقید کریں گے

ظاہری ساخت

صفائی و سادگی جہاں تک ظاہری شکل کا تعلق ہے ولی کا کلام متقدمین اور معاصروں پر فوقیت رکھتا ہے انھوں نے خیالات کا اظہار ایسے فصیح اور مترنم الفاظ میں کیا کہ ہر مسلم الثبوت استاد نے اُن کا لوہا مانا، فارسی تراکیب اور ہندی الفاظ کی برمحل دروبست سے کلام حسن کاری کا بہترین نمونہ ہو گیا، جس طرح اُن کے خیالات میں رنگینی اور شگفتگی ہے اسی طرح اشعار کا ہر ہر لفظ مسرت بخش ہے۔ اُن کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ ان پر موجودہ زمانے کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے ؎

گر ہوا ہے طالب آزادگی　　بند مت ہو سبحۂ زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہر ایک مہ رو کے ملنے کا نہیں شوق — سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

زندگی جامِ عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں

اثرِ بادۂ جوانی ہے — کر گیا ہوں سوال کچھ کا کچھ

باعثِ رسوائیِ عالم ولی — مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

یہ ریختہ ولی کا جاکر اُسے سنا دو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

لذتِ معنی نہیں کچھ لذتِ ظاہر سے کم — حرف بامعنی ہے جیسے بوسۂ خوبانِ عزیز

ولی منزلِ عاقبت میں تیرا — نہیں کوئی حسنِ عمل بن رفیق

اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو — دنیا کی رہگذر میں بزرگوں کی چال چل

تن کردہ جان گئی پھر آئی — عیش کی آن گئی پھر آئی

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے، کلیاتِ ولی میں اس قسم کے سیکڑوں اشعار ملیں گے جو فصاحت کی جان اور انسان کے لئے مسرت کا ایک وافر ذخیرہ اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں، آخری شعر کی سادگی اور مختصر بحر اس پر رنگینیِ خیال ایسی چیز ہے کہ اُردو ادب میں ہمیشہ باعثِ فخر رہے گی، دلکش طرزِ نگارش، جدتِ اسلوب، سلاستِ بیان غرض بیرونی نقطۂ نظر سے وہ تمام محاسن جو ادب کو ادب کہلانے کا مستحق کرتے ہیں ولی کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں، اُن کے کلام کا ترنم اور موسیقی سحر آمیز کیفیت پیدا کرتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شعر میں اگر موسیقیت نہ ہو تو تنِ بے جان کی مانند ہوگا چنانچہ کارلائل کا مشہور نظریہ ہے۔

"شعر میں موسیقیت ضرور ہونی چاہئے"

"جب سے انسان صحیح معنی میں انسان ہوا ہے شاعرانہ جذبات ہمیشہ مترنم پیرایہ میں بیان ہوئے ہیں" (رل)

"ادب کی ایک صنف میں اگر موسیقیت کا اضافہ کر دیا جائے تو بھی شعر ہو جائے گا" (ہیگل)

کون نہیں جانتا کہ موسیقیت ہی ایک معمولی خیال کو اعلیٰ درجہ بخشتی ہے۔ ولی کے کلام کی موسیقیت آج تک دلوں کو لبھاتی ہے اور جب تک اُردو شاعری کا وجود رہے گا اُن کا یہ وصف خراجِ تحسین حاصل کرے گا۔ اس کی یہ غزل

"تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا"

کے ہر ہر لفظ سے ترنم ٹپکتا ہے، تعجب ہے کہ ایسے الفاظ جو ہمارے کانوں کو بھلے نہیں لگتے ولی کے کلام میں وہی ایک خاص انبساط پیدا کرتے ہیں۔

تشبیہات ولی کو تشبیہات کا بلا مبالغہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے انھوں نے ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں، اُن کے ذہن کی رسائی پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک چیز کے لئے ہر موقع پر نئی تشبیہیں استعمال کی ہیں وہ بھی ایسی نادر گویا ہر بار آسمان سے تارے توڑ کر جڑ دیئے ہیں بعض تو عدیم النظیر ہیں۔ یہی حال استعاروں کا ہے تشبیہ اور استعارے کی یہ فراوانی یقین دلاتی ہے کہ اُن کا دماغ حسین الفاظ کا ایک بے پایاں ذخیرہ تھا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر چیز کی تشبیہہ کی مثال پیش کی جائے اس لئے صرف زلف اور خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ پیش کی جائینگی۔

زلف

زلف تیری ہے موج دریا کی
پاس تل اس کے جوں سناسی ہے

یہ سیاہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

پیستم کی زلف بیچ دسا مجھ سواد ہند
اس راہ مار پیچ میں اے دل سنبھال چل

کفار قسر نگ کوں دیا ہے
تجھ زلف نے درس کافری کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سے پیو کا
کرتا ہوں تب سے ورد الف لام میم کا

کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف آدمی
جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

یہاں یہ ممکن نہیں کہ تمام تشبیہات کی مثال کے لئے اشعار پیش کئے جائیں اس لئے اختصار کی صرف ان تشبیہوں کو لکھا جاتا ہے جو ولی نے مختلف مواقع میں زلف کے لئے استعمال کی ہیں......

دیجور کا تماشا، سنبل باسک (سانپوں کا بادشاہ) دود چراغ گل، کالا ناگ، کالے بھجنگ، تسلسل، ایک جگہ زلف کے دائرے کو اسلام کے "ل" پر فوقیت دی ہے، فتنہ، شب کا بحر ظلمات، ایک جگہ زلف کے خیال کو رشک مشک کہا ہے، دوسری جگہ زلف اور خال کو دغا دینے میں یک رنگ کہا ہے: زنجیر عاشقی ہند (کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دیوالی ہیں)، برہمن سلاسل، موج چشمہ خورشید ظل ہما، سحر بنگالہ ایک جگہ لٹکتی ہوئی زلف کو رغبت صیاد کہہ کر یاد کیا ہے، موج جمنا، پیاسی ناگن، پٹا، نستعلیق کا لام، ہمدوش مصرع قد وغیرہ،

زلف کو پیاسی ناگن تصور کرنا، یا باسک، قرار دینا، یا دود چراغ گل سمجھنا ایسی لطیف تشبیہات ہیں کہ لکھنو جہاں سراپا لکھنے میں ایڑی چوٹی کے زور لگائے گئے وہاں بھی اس قسم کی تشبیہات نہیں ملیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں سے بہت سے الفاظ مثلاً کالے بھجنگ، باسک دیجور کا تماشا وغیرہ ولی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے اس لئے یہ امتیاز ہمیشہ کے لئے ولی سے مخصوص ہو گیا۔

دہلی والوں نے جب دکنی زبان کی ادبی حیثیت دیکھی تو رشک کرنے لگے اور فارسی گوئی کو خیرباد کہہ کر اپنی بول چال کی زبان میں

شاعری کو فروغ دیا لیکن اپنی خودداری کو قایم رکھنے کے لئے دکنی زبان میں بہت سی کانٹ چھانٹ کی اور اس زبان کو خس و خاشاک سے صاف کر دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا جائے حالانکہ ولی کے کلام سے ظاہر ہے کہ دکنی زبان میں ٹھیٹ ہندی الفاظ زیادہ مستعمل تھے۔ دہلی والوں نے فارسی الفاظ سے رنگینی پیدا کی اس لئے اردو زبان ہندی کی نازک اور نادر تشبیہات سے محروم رہ گئی۔

اب خال کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ ملاحظہ ہوں ؎

وہ دل کہ تھا جو سوختۂ آتشِ فراق — پہنچا ہے جا کہ رُخ پہ صنم کے برنگ خال

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال — حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

یک نقطہ ترے صفحۂ رُخ پہ نہیں بیجا — اس مُکھ کو ترے صفحۂ قرآں سے کہوں گا

ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزنِ خوبی — یہ خال عنبریں تس پر بلال آ سا کھڑا دستا

نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جن نے دل — وہ دائرہ عشق میں ثابت قدم ہوا

زلف تیری ہے موج دریا کی — پاس تل اُس کے جوں سناسی ہے

ان کے علاوہ تل کو، سپند، جیم کا نقطہ، زنگی، بیت انتخابی کا نقطہ وغیرہ تشبیہوں سے یاد کیا ہے۔ دورِ حاضرہ کے ایک بلند پایہ شاعر نے خال کے مضمون کو نظم کیا ہے، اس مثال سے موازنہ مقصود نہیں کیونکہ آج زبان اور خیالات میں بہ نسبت اس زمانے کے بہت وسعت ہو گئی ہے ؎

ازل کے روز تیری شکل جب بنائی تھی — بنانے والے کو اتنی پسند آئی تھی

کہ دیر تک اُسے دیکھا کیا تھا حسرت سے — نظر جا لگی تھی رخسار پر محبت سے

نظر نے اپنا کیا کام ایک مرکز پر — سیاہ نشان بنایا نگاہ نے جم کر

خبر بھی ہے تجھے یہ رمز ہے نہاں ہے وہی

سمجھ رہا ہے جسے خال یہ نشاں ہے وہی

(جوش)

نظم میں بہ نسبت غزل کے ایک خیال کو ادا کرنا آسان ہے کیونکہ غزل میں ہر خیال کو دو مصرعوں میں ادا کرنا پڑتا ہے نظم میں شاعر جس قدر چاہے خیال کی وضاحت کر دیتا ہے۔

ولی نے غزلیات میں خال کی جو دلپذیر اور سحر آمیز تشبیہات استعمال کی ہیں وہ آج تک قابل رشک ہیں اُن کی بعض تشبیہیں

پامال بھی ہیں لیکن ان میں بھی ایسا لطف بیان ہے کہ قدامت میں بھی جدت کا رنگ جھلکتا ہے۔ دراصل اس قسم کی آسان اور نئی جدّت آور تشبیہات ہر شخص کے ذہن میں نہیں آسکتیں یہ صرف انہی کا حصہ ہوتا ہے جن کو قدرت بزم شاعری کی صدارت دینا چاہتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں ولی کی یکتائی مسلم ہے۔

ولی نے استعارے اور کنایے بھی ایسے بلیغ استعمال کئے ہیں کہ اردو زبان کو ان پر ہمیشہ ناز رہے گا وہ کسی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کے لئے اگر استعارہ درکار ہے تو طبع غواص بحر فکر سے ایسے جواہر نکال کر مصرعوں میں جڑتی ہے کہ قاری کے سامنے اس چیز کا بے حد حسین نقشہ آجاتا ہے۔ ولی کے ہاں بلاغت او استعارے کا یہ عالم ہے کہ قارئین کے تخیل بالکل اُن کے قابو میں ہو جاتے ہیں ناممکن ہے کہ قاری اس کیفیت کے علاوہ جو وہ محسوس کرانی چاہتے ہیں دوسری کا ذرا بھی خیال کرے۔ کسی شاعر کی عظمت قائم کرنے میں تشبیہ اور استعارے کی تنقید خاص طور پر کرنی چاہئے۔ ایک معمولی شاعر میں اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ وہ قارئین کے تخیل کو محاکات کے ذریعہ اپنے بس میں کرلے لیکن بلند پایہ شاعر میں یہ خوبی فطری ہوتی ہے۔ ولی نے اس میدان میں بھی غیر فانی گل افشانی کی۔

"معنوی محاسن"

تصوف | تصوف ہماری ادبیات کے علاوہ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہوگیا ہے اس کی ایسی گت بنائی کہ مسلمانوں کو غیر معلوم طریقہ پر زبردست نقصان پہنچا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا حصول صوفیائے کرام کا متبرک اصول تھا۔ صوفی شعرا نے اس کو سراہا لیکن عوام پر اس کا ایسا مضر اثر پڑا کہ آج تک اس کے صدمے سہنے پڑتے ہیں۔ امرد پرستی کو فروغ ایسی ہی شاعری سے ہوا۔ لازمی بات ہے کہ جب شعر پڑھتے وقت ایک گلچیر برہمن یا ترکی لڑکے کا تخیل دماغ میں ارتعاش پیدا کرے تو خواہش انسانی اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرور کوشش کرے گی چنانچہ یہی ہو رہا ہے لیکن جو لوگ حقیقی معنی میں صوفی تھے ان کی شاعری سے اُردو زبان کی بڑی خدمت ہوئی، ولی کی شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اعتراف کیا ہے کہ عشق حقیقی عشق مجازی کی بدولت حاصل ہوتا ہے، ہم آگے بیان کرچکے ہیں کہ ولی نے علوی خاندان میں بیعت کرلی تھی، اس کے علاوہ راہ حقیقت میں حصول کمال کے لئے عشق مجازی بھی کیا اس سلسلے میں ایک گجراتی سیدزادہ ابوالمعالی کا نام لیا جاتا ہے، ولی کو اس سے بے انتہا محبت تھی ہر وقت سایہ کی طرح ساتھ رہتا تھا۔ ابوالمعالی کے علاوہ بعض اور لوگوں سے محبت تھی۔ جن کے ذکر میں انھوں نے باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ولی کوئی نام نہاد صوفی نہیں تھے اس لئے اُن کی امرد پرستی قابل اعتراض نہیں پھر بھی ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ مسلمانوں کی مجموعی قوت کو جو نقصان پہونچا اس میں ولی کی شاعری کا بھی حصہ ہے۔

ولی فقیر دوست اور توکل پسند تھا۔ جب دہلی آئے تو سعداللہ گلشن تخلص مشایخ نقشبندیہ میں ایک بڑے بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیض باطنی حاصل کیا۔ انہی کے فرمانے سے ولی نے اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال کے مطابق کیا اور بہت سے

فارسی خیالات کو اُردو میں منتقل کیا یہی وجہ ہے کہ ولی کے قلمی نسخوں میں متعدد جگہ اختلاف ہے۔

ولی کے صوفی المشرب ہونے کی بڑی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ جب اُن کا ردیف وار مرتب دیوان دہلی پہونچا تو دہلی والوں نے اس کو کرامت سمجھا، اب ہم اس کے کلام سے چند صوفیانہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

پایا ہے جو کوئی دولت فقر ____ مشتاق نہیں سکندری کا

زلیخا مجھے بولیا کہ توں واقف نہیں عشق حقیقی سوں   تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

سُنیا ہوں جب سے یو نکتہ ولی شیریں سخن سیتی ____ گیا ہے تب سوں دل شیوہ وجی لو میرے عشق بازی کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا ____ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی خواہش ہو ____ قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

ہیں صلح کل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر ____ از بسکہ وسعت مشربی سوں دل میرا دریا ہوا

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں   جب بیخودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہوشیار ہو، ہوشیار ہو ____ کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو

نقش دنیا کا کھینچ مت دل پر   دشمنِ ہوش ہے محبتِ زر

عشق کی راہ میں قدم کوں دھر   دل سوں اپنے نکال وہم و خطر

راہ سیدھی ہے رہنما کی قسم

یہ تسلیم شدہ ہے کہ لٹریچر مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے ولی کی شاعری داخلی ہونے کے باعث اُن کی شخصیت کا نقش ثانی بن گئی ہے۔ اگر ہمیں ولی کے متعلق مطلق علم نہ ہو تب بھی ان اشعار سے ہم اُن کی زندگی کی ایک صحیح تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی قناعت پسند، دولت دنیا سے متنفر اور صوفی المشرب تھے۔ کائنات کے ہر ذرہ میں خدا کا وجود دیکھتے تھے، پانچویں شعر سے واضح ہے کہ وہ صلح کل کے حامی تھے، اُن کی نظر میں ہر مذہب و ملت کی یکساں وقعت تھی، تعصب سے قطعی بری اور ہر انسان کو خدا کا بندہ تصور کر کے مساوات پر قائل تھے، اُن کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں انسان کی پیدائش کا مقصد حرکت و عمل ہے اُن کی تلقین تھی کہ یہاں جمود و سکوت آفرینش انسانی کے منافی ہے۔

ولی کی صوفیانہ فطرت کا ثبوت اُس کی شاعری میں اکثر جگہ ملتا ہے، قدوۃ العارفین شاہ وجیہ الدین کی مدح میں ترجیع بند اور حضرت میراں محی الدین قدس سرہ کی مدح میں قصیدہ دونوں اُن کی عقیدتمندی ثابت کرتے ہیں بعض جگہ ولی کے کلام کی رنگینی سے سطحی نظر

والوں کو عام عشق کی جھلک دکھائی دیتی ہو لیکن ایک صاحب نظر کو اس مجازی پردے میں حقایق و معارف نظر آتے ہیں، تضحیک واعظ و محتسب، کیفیات حسن و عشق وغیرہ کا بیان کسی دنیاوی رغبت کے باعث نہیں بلکہ یہاں بھی مجازی الفاظ میں حقیقی معنی کا لطف مضمر ہے ملاحظہ ہو ؂

چھپا ہوں میں صدائے بانسلی میں — کہ تا جاؤں پری رو کی گلی میں

عاشقاں عاشقی کے دعوے پر — آہ و زاری کوں دو گواہ کرو

بالی میں نازنین کی رہتا ہے رات او زن — مدت ستی ولی کا ہو کر پران موتی

میں اپنی آنکھوں کو واللہ فرش خاک کروں — گذر جو میری طرف کوں وہ شہسوار کرے

خدا نے کہہ پہ تیرے باب حسن ناز کیا — قد بلند کوں تیرے تمام ناز کیا

ان اشعار کی رنگینی سے لکھنو کے رنگ کا دھوکا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ بہ امعان نظر دیکھنے سے زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لکھنو کی رنگینی میں ابتذال کا عنصر غالب تھا، واں کا معشوق ہرجائی، بیوفا، سنگدل، عربدہ جو اور اس پر ذلیل ترین اتہام لگانا طرۂ امتیاز تھا، برخلاف اس کے ولی نے جہاں بھی معشوق کا ذکر کیا ہے اس کے ہر لفظ سے محبت آمیز احترام اور پاس ادب ٹپکتا ہے، ابتذال و رکاکت تو کجا وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ اُن کے معشوق کو دوسرے دیکھ سکیں ؂

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا — طلب گار نگاہ باحیا ہوں

ظاہر ہے کہ جو شخص نرگس کے نظارے سے اس لئے پرہیز کرے کہ اس کی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے اور وہ ہر راہرو کو دیکھتی ہے کیونکر برداشت کرے گا کہ اس کے محبوب کا نظارہ عام ہو، اسی خودداری نے ولی کو عمومیت سے ممتاز کر کے دنیا کے خواص میں جگہ دلائی۔

کلام کی صفائی شاعر کی عظمت کے لئے لابدی ہے لیکن تنہا حسن الفاظ کبھی بقائے دوام کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا، ظفر کی محاورہ بندی اور داغ کی صفائی کا کون قائل نہیں لیکن ان کے کلام میں باطنی محاسن کا شائبہ بھی نہیں، اس میں ہر چیز سطحی نظر آئے گی، حسن خیال کی ان لوگوں نے کبھی پروا نہیں کی، برخلاف ان کے ہر باکمال شاعر ظاہری محاسن پر باطنی حسن کو ترجیح دیتا ہے، مرزا غالب کی مثال لیجئے، معترضین نے کیا کچھ نہ کہا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ سخن میر تقی کو بھی نہ چھوڑا ؂

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے

زبان میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے — مگر اپنا کہا تم آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یا رام پور میں مرزا کو "روغن گل اور بھینس کے انڈے" والا شعر سنایا گیا تھا، لیکن ان لوگوں نے کبھی مخالفین کی پروا نہیں کی بلکہ غالب تو تنگ آ کر چلا اٹھا ع

"گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

اس سے ثابت ہوا کہ معنوی حسن، حسن الفاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی بھی میر اور غالب ہی کی سی طبیعت رکھتے تھے، انھوں نے اپنے زمانہ کی عام فضا کی کبھی پروا نہیں کی بلکہ اقلیم سخن کی اس چوٹی پر اپنی نشست بنائی جہاں ہمعصروں کی کبھی رسائی نہیں ہوتی، انھوں نے ایک عالی دماغ شاعر کی طرح محسوس کر لیا کہ شعر کی جان معنوی خوبی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کئی جگہ اس کا اعتراف کیا ہے ؎

منطق و حکمت و معانی پر — مشتمل ہے کلام تجھ لب کا
گرچہ پابند لفظ ہوں لیکن — دل میرا عاشق معانی ہے
لذت معنی نہیں کچھ لذت ظاہر سے کم — حرف بامعنی ہے جیسے بوسۂ خوباں لذیذ

غالب عاجز ہو کر چلا اٹھا تھا ؎

گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

ولی بھی یہی شکوہ کرتے ہیں ؎

ولی تیرے سخن یاقوت سو رنگیں ہوئے لیکن — خریداران جہاں بہتر کہاں ہیں آج جوہر کے

ان چند مثالوں سے ولی کی زبردست عظمت تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں رہتا معنوی حسن کے اس احساس نے اُن کو اردو شاعری کی اولین صف میں جگہ دلا دی، انگریزی ادب میں شیکسپیر کی غیر فانی عظمت معنوی محاسن کے باعث ہمیشہ کیلئے مستند ہو گئی۔ اب ہم چند مثالوں کے ذریعہ ولی نے طرفگی خیال سے جو لطافت معنوی پیدا کی ہے دکھائیں گے ؎

حسن تخیل:۔

منزل گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
ہر تار میں زلف کے میں تری سیر جا کروں — باد صبا کوں ساتھ لیا ہوں چمن میں جا
ابرو کی کشتی مت چھپا اُس وقت لے دریائے حسن — تجھ نین کی گردش ستی عالم منے طوفاں ہوا
عجب نہیں جو فلک پہ خط شعاعی دیکھ — اگر ورق پہ سورج کے تیری لکھیں تعریف
اے شمع رو روشن کیا جب انجمن گل — اپنے گل مقصود کوں پایا چمن گل
تیرے وصل میں اس قدر ہے نشاط — کہ مجھ کوں راحت سوں آتی ہے نیند خواب
عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اُس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

تخیل انسانی قوتوں کی مجبوریوں کا کفارہ ہے، اس کی مدد سے انسان فضائے بسیط کے ان حصوں کی سیر کرتا ہے، جہاں قوتیں اس کو نہیں پہونچا سکتے، اس عطیہ کا استعمال شاعر کی فطرت پر منحصر ہے، اگر فطرت جذباتی محبت پر مائل ہے تو کلام میں مومن اور جرأت

کی سی رنگینی ہو گی، اگر ذہنی محبت کی پرستار ہے تو ولی ، درد ، میر اور غالب کی سی شگفتگی ہو گی۔ حسن تخیل کی تنقید میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ شاعر کا تخیل اس کی قوت ممیزہ کے بس میں ہے یا نہیں، اگر قوت ممیزہ کا محکوم ہے تو حسن استدلال قایم رہے گا ورنہ نہیں ، اب ولی کے پہلے شعر کو لیجئے۔ اس میں نزاکت تخیل کے ساتھ زبردست فلسفہ بھی ہے ، آگے عرض کیا جا چکا ہے کہ ولی جمود و سکوت کو انسانی زندگی کے لئے سم قاتل تصور کرتے ہیں ، اس فلسفہ کو ولی نے ندرت تخیل سے اس قدر دلکش بنا دیا ہے کہ اُردو شاعری اس شعر پر ہمیشہ ناز کرے گی ، اس میں ایسا فلسفہ نظم ہے جو انسانی زندگی پر منطبق ہو سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لئے ایک اچھوتی ترکیب سوچی ہے ، رسائی کا بہترین ذریعہ ہوا ہو سکتی ہے کوئی معشوق اتنا بدگمان نہیں ہو گا کہ ہوا سے گریز کرے اس لئے شاعر کے دماغ میں یہ بات پیدا ہوئی کہ معشوق کی زلفوں کی سیر کرنے کے لئے ہوا کو ساتھی بنانا چاہئے۔ نزاکت تخیل اس سے اور بھی بڑھ گئی کہ ہوا کے چلنے سے زلف کا ہترار الگ ہو گا ، اسی طرح آخری شعر معرکۃ الآرا چیز ہے اس میں تخیل کی مدد سے ایک حقیقت نظم کی ہے ۔ غرض ولی نے تخیل کی مدد سے اپنے کلام میں وہ نزاکتیں پیدا کی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہی ہیں اور لطف یہ کہ اُن کا تخیل کبھی ابتذال کی طرف مائل نہیں ہوا۔ پورے کلیات میں ایک ایسا شعر نہیں ملے گا جس سے ذوق سلیم مجروح ہو۔

اختراع و ایجاد

جدت پسند طبائع کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کی مکمل ادائی کے لئے نئے الفاظ اور تراکیب ضرور ڈھالتی ہیں۔ ان کے زمانہ کی زبان میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ حسب منشا اظہار خیال ہو سکے ، اُردو میں مومن ، غالب وغیرہ نے نئی تراکیب ایجاد کیں ، ولی کی طبیعت بھی جدت پسندی میں رنگی ہوئی تھی ، اس پر فکر ایسی گہری کہ فلسفہ کی گہرائیوں کی سیر ان کو خاص طور پر مرغوب تھی اس لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اپنے زمانہ کی بے بضاعت زبان پر اکتفا کرتا ۔ لہذا اصول مقررہ کے مطابق ادائی خیالات کے لئے نئی تراکیب ایجاد کیں ان میں سے چند ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

،، رحم بے جا ، موج بے تابی دل ، حرف دانا پسند ، دیدہ حیراں ، جنت احباب ، وفا دشمن ، سکوت بے معنی ، منزل شبنم ، کوہسار خاموشی ، برگ یاقوت ، دل بے دل وغیرہ ،

ولی کی یہ تراکیب ان کے بعد رائج نہیں رہیں۔ یہی حال ہر شاعر کی تراکیب کا ہوا ، انگریزی میں ورڈسورتھ (wordsworth) کی مثال دیکھئے اُردو میں مومن کی ،

ولی کے متعلق بعض اعتراضات

ولی کے متعلق اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیا ہے۔ مثلاً کوی کو (کئی) نین کو (نیَن) فکر کو (فکَر) رین کو (ریَن) زلف کو (زلَف)

وہ وزن شعر میں بعض حروف کو گرا دیتے ہیں مثلاً گئی کی جگہ (گی) ، ہوئی کی جگہ (ئی) اے کی جگہ (آ) انکھیاں کی جگہ (انکھاں) صفحہ کی جگہ (صفا) ، اس طرح کی چیزوں کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ولی کے زمانے میں یہ جس طرح بولے جاتے تھے ، انھیں اسی طرح لکھا ہے زبان کی ترقی کے ساتھ بعض الفاظ کے بولنے اور لکھنے کا طرز بدلتا گیا۔

اس قسم کی چیزیں ان کے بعد تک کے زمانہ میں عام تھیں چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو جن کی علمی قابلیت کا ہر شخص قائل تھا ان کے ہاں بھی اس قسم کی اغلاط موجود ہیں ؎

وعدے مجھے سب خلاف جو اس لب ہائے نے — کیا لعل قیمتی دکھو جھوٹا نکل گیا

شاہ حاتم جن کی استادی کا سکہ بیٹھا تھا جنھوں نے اردو زبان کی فصاحت کو دلپذیر بنانا چاہا ان کا شعر ملاحظہ ہو ؎

لگن میں تجھ ستمگر کی عجب مجلس میں غم گذرا — شمع رو رو کے ساری رات ستر پا کھڑی جلیاں

مومن اور آتش کا زمانہ دیکھئے اور یہ مصرع ملاحظہ ہو ؎

"محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا"

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ولی کی عروضی معلومات کم تھیں ان کے اشعار کی طرفگی خیال، تازگی مضامین اور لطافت تخیل کو دیکھ کر خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معمولی بساط کا شاعر ایسی لطیف تشبیہات، نادر استعارے اور بلیغ کنائے ذہن میں رکھتا ہوگا؟ کیا جذبات کی ایسی موثر نقاشی کوئی معمولی استعداد کا آدمی کر سکتا ہے؟ زندگی اور کائنات کے ایسے باریک نکات کسی معمولی شاعر کی زبان سے نکل سکتے ہیں؟ غرض ولی کی یہ اغلاط ثابت کرتی ہیں کہ ولی دنیا کے ان معزز مصنفین میں سے ہیں جن کی اغلاط زبان کی کم مایگی یا لطافت معنوی کے خیال سے ہو جاتی ہیں۔

شاعرانہ تعلّی

شاعرانہ اظہار فخر اردو شعرا کا عام وتیرہ رہا ہے، بہت سے تو مسلم الثبوت استادوں کو بھی نظر میں نہیں لاتے بعض اپنے درجے کو پہچانتے ہوئے مشاہیر کی عظمت کا بھی اعتراف کرتے ہیں، اول الذکر میں مومن کو لیجئے جو سعدیؒ کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ انشا کی تعلّی دیکھئے جو افلاطون اور ارسطو کو کچھ نہیں سمجھتے ؎

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے — کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مسرت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

موخر الذکر گروہ میں سنجیدہ لوگ ہیں جنھوں نے دوسروں کے کمال کو سراہا، غالب کی تعلّی دیکھئے ؎

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا نے اپنے رقیبوں تک کے کمال کو سراہا، ذوق اور مومن کے اس شعر پر سر دھنتے تھے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اثر کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

تم ہی نہیں ہو میر اثر اس دیار کے   راسخ بھی میر وقت کبھی تھے بہار کے

ولی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے ، کئی جگہ اپنے موجد ہونے کے احساس اور شاعرانہ عظمت کو فخریہ ظاہر کیا ہے ؎

یو شعر تیرے اے ولی مشہور ہیں آفاق میں   مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

یہ ریختہ ولی کا جا کر اُسے سُناؤ   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

ہم پاس بات آ کے نظیری کی مت کہو   رکھتے نہیں نظیر ایس کے سخن کی ہم

تیرے اشعار ایسے نہیں عراقی   کہ جس پہ رشک آوے گا ولی کوں

ولی ایران و توران میں ہے مشہور   اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ان اشعار کے علاوہ کلیات ولی صفحہ ۲۹۳ کی غزل میں ولی نے انوری ، جامی ، فردوسی ، غزالی ، صائب ، بیدل وغیرہ کی تمام صفات کو خود میں بتایا ہے ، مندرجہ بالا اشعار کے پہلے دو اشعار میں انھوں نے متقدمین کا اعتراف کیا ہے لیکن تیسرے اور چوتھے اشعار میں عامیانہ تعلی ہے ۔

ولی کا سفر

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بیس برس کی عمر میں جب ولی کو اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کا شوق ہوا تو احمد آباد آئے ۔ جہاں مولانا وجیہہ الدین کا مدرسہ تمام ہندوستان میں مشہور تھا ۔ یہاں چند سال ولی ظاہری و باطنی فیض حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد آ گئے دوسری مرتبہ پھر احمد آباد اور سورت گئے ، اس مرتبہ اپنا ترتیب وار دیوان بھی ہمراہ لائے ، لوگ اس دیوان کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے اور ولی کو باکمال شاعر تسلیم کر لیا ، چونکہ ولی صوفی المشرب تھے ۔ اس لئے بعض تو اس ترتیب کو کرامت سمجھنے لگے ، اس دفعہ دہلی کا بھی رخ کیا جہاں اردو شاعری کا اس قدر چرچا نہ تھا ۔ فارسی گو شعراء محض تفنن طبع کے لئے اُردو شعر کہا کرتے تھے ، ولی نے دہلی ، سورت ، اور احمد آباد کی تعریف میں جو شعر موزوں کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب نظر شاعر تھے ۔ دوسرے شہروں کی معاشرت اور ماحول نے انھیں متاثر کیا چنانچہ انھوں نے ان کے خوب نقشے دکھائے ہیں ۔

اس سفر کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود ولی اور شمالی ہندوستان پر ایک دوسرے کا اثر ضرور پڑا ہوگا ، دوسرے شہروں کی معاشرت جدا ، وہاں کی صحبتیں مختلف ، آداب و اطوار دوسرے علمی مذاق میں بھی تفریق تھی ، شاعر چونکہ سب سے زیادہ تعال اور زود حس ہوتا ہے اس لئے ولی کے کلام پر بھی اس سفر کا اثر پڑنا لابدی تھا ، ولی کو دہلی اس قدر پسند آئی کہ تین دفعہ سفر کیا لیکن طبیعت نہ بھری بالآخر شاعرانہ شکوہ کر کے دل بہلایا ؎

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں[۱]

---

[۱] یہ شعر مضمون کا ہے تذکرہ ولی کا دیکھو گلشن گفتار مرتبہ سید محمد

ولی کے کلام میں دہلی کی اس آمد و رفت سے بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ سید سعد اللہ شاہ گلشن مشائخ نقشبندیہ میں سے ایک بڑے بزرگ تھے، ولی کو جب ان کی حضوری میں شرف باریابی حاصل ہوا تو انھوں نے ولی سے کہا کہ اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال میں نظم کرو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی صوفی المشرب تھے۔ اس لئے سید صاحب نے اس تبدیلی کی فرمائش کی تھی کیونکہ صوفی شعرا اپنے خیالات کو روزمرہ کی زبان میں ادا کرتے تھے اس لئے ولی کو بھی یہی چاہئے کہ وہ بھی سادہ اور آسان زبان میں اظہار خیال کرے۔

یہ قاعدہ ہے کہ اگر ہم کسی غیر قوم کے دوست سے ملتے ہیں تو اس کی زبان اور آداب کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوست کی تفریح طبع کا باعث ہو اسی طرح دہلی کی مجلسوں میں ولی کی جو دھوم تھی انھیں ضرور اس طرف تأمل کیا ہوگا کہ وہ کچھ نہ کچھ دہلی والوں کے مذاق کو مدنظر رکھیں، وہاں کے الفاظ و محاورات بھی استعمال کریں۔ اس پر شخصی حکومت کا زمانہ جہاں بادشاہ کی مرضی، رسم و رواج اور عوام کا مذاق تو کجا مذہبی روایات پر بھی غالب آجاتی ہے اس لئے اُس کے زمانے میں دہلی کے سفر نے ان کے کلام پر ضرور دہلی کا رنگ چڑھایا ہوگا، اب مناسب یہ ہے کہ دہلی میں اُردو شاعری کی جو حالت تھی اس پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ ولی کے کلام کی عظمت اور فصاحت آشکارا ہو جائے۔

عہد ولی اور دہلی میں اُردو شاعری

شمالی ہندوستان میں اورنگ زیب کے زمانہ سے گو اردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن دراصل یہاں کے شعرا فارسی گوئی ہی کو معراج کمال سمجھتے تھے، اردو میں جو کچھ اشعار اس زمانہ میں کہے گئے ہیں وہ محض تفریح طبع کا نتیجہ ہیں خود غالب و مومن کے زمانے تک فارسی میں جوہر طبع دکھلانا باعث فخر تھا، غالب و مومن دونوں کا فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ غالب نے کہہ دیا تھا ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعۂ ہندی کہ بے رنگ من است

ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اُردو شاعری، یہاں جلد فروغ پاتی، اورنگ زیب کے زمانے میں چند ایسے شعرا گذرے ہیں جنھوں نے اُردو میں شعر کہے، ان میں سے بعض اس قدر مغلق اور پیچیدہ ہیں کہ تذکرہ نویس انھیں شاعری میں شمار نہیں کرتے ذیل کی مثالیں اس زمانہ کی اُردو شاعری پر کافی روشنی ڈالیں گی ؎

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ ہوں ہی   غصہ کیا دگالی دیا و دگر لری   (قزلباش خاں اُمید)

از زلف سیاہ تو بدل دم پڑی ہے   در خانہ آئینہ کتا جوم پڑی ہے   (موسوی خاں فطرت)

یہ شعرا فارسی گو تھے اُردو صرف تفریح کا مشغلہ تھا، جعفر زٹلی کے نام سے کون واقف نہیں، یہ اورنگ زیب ہی کے زمانے میں ہوئے لیکن ان کا کلام زیادہ تر فحش ہے پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے ؎

ولی کے کلام میں دہلی کی اس آمد و رفت سے بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ سید سعد اللہ شاہ گلشن مشائخ نقشبندیہ میں سے ایک بڑے بزرگ تھے۔ ولی کو جب ان کی حضوری میں شرف باریابی حاصل ہوا تو انھوں نے ولی سے کہا کہ اپنے کلام کو روزمرہ کی بول چال میں نظم کرو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی صوفی المشرب تھے۔ اس لئے سید صاحب نے اس تبدیلی کی فرمائش کی تھی کیونکہ صوفی شعرا اپنے خیالات کو روزمرہ کی زبان میں ادا کرتے تھے اس لئے ولی کو بھی یہی چاہئے کہ وہ بھی سادہ اور آسان زبان میں اظہار خیال کرے۔

یہ قاعدہ ہے کہ اگر ہم کسی غیر قوم کے دوست سے ملتے ہیں تو اس کی زبان اور آداب کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوست کی تفریح طبع کا باعث ہو اسی طرح دہلی کی مجلسوں میں ولی کی جو دھوم تھی انھیں ضرور اس طرف مائل کیا ہوگا کہ وہ کچھ نہ کچھ دہلی والوں کے مذاق کو مد نظر رکھیں وہاں کے الفاظ و محاورات بھی استعمال کریں۔ اس پر شخصی حکومت کا زمانہ جہاں بادشاہ کی مرضی رسم و رواج اور عوام کا مذاق تو کجا مذہبی روایات پر بھی غالب آجاتی ہے اس لئے اس کے زمانے میں دہلی کے سفر نے ان کے کلام پر ضرور دہلی کا رنگ چڑھایا ہوگا، اب مناسب یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کی جو حالت تھی اس پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ ولی کے کلام کی عظمت اور فصاحت آشکارا ہو جائے۔

عہد ولی اور دہلی میں اردو شاعری

شمالی ہندوستان میں اورنگ زیب کے زمانہ سے گو اردو شاعری کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہاں کے شعرا فارسی گوئی ہی کو معراج کمال سمجھتے تھے، اردو میں جو کچھ اشعار اس زمانہ میں کہے گئے ہیں وہ محض تفریح طبع کا نتیجہ ہیں خود غالب و مومن کے زمانے تک فارسی میں جوہر طبع دکھلانا باعث فخر تھا، غالب و مومن دونوں کا فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ غالب نے کہہ دیا تھا ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعۂ ہندی کہ بے رنگ من است

ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اردو شاعری یہاں جلد فروغ پاتی، اورنگ زیب کے زمانے میں چند ایسے شعرا گذرے ہیں جنھوں نے اردو میں شعر کہے، ان میں سے بعض اس قدر مغلق اور پیچیدہ ہیں کہ تذکرہ نویس انھیں شاعری میں شمار نہیں کرتے ذیل کی مثالیں اس زمانہ کی اردو شاعری پر کافی روشنی ڈالیں گی ؎

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ نوں پڑی غصہ کیا و گالی دیا و دگر لڑی (قزلباش خاں اُمید)

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے در خانہ آئینہ گتا جوم پڑی ہے (موسوی خاں فطرت)

یہ شعرا فارسی گو تھے اردو صرف تفریح کا مشغلہ تھا، جعفر زٹلی کے نام سے کون واقف نہیں، یہ اورنگ زیب ہی کے زمانے میں ہوئے لیکن ان کا کلام زیادہ تر فحش ہے پھر بھی بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں اورنگ زیب کی مدح میں لکھا ہے ؎

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی — دراقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سالی وضعف بدن — مچادی دہا چوکڑی دردکھن
نہے شاہ شاہاں کہ گاہ دغاے — نہ ہلد نہ ٹلد نہ جنبد ز جاے
ہما سوزے جو دھا بلی بے بدل — چو البرز قائم چو پربت اٹل

اورنگ زیب کی وفات کا مرثیہ ؎

اکل بے کل ہوا سنسار سارا — بخون تیار شد مریخ تارا
کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل وکامل دل آگاہ
صدائے توپ بندق است ہرسو — چھٹا چھٹ دھپا دھپ است ہر سو
بہر سو مار ماردھاڑ است — اجھل چال وتیر خنجر گذار است

(از رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۹ء)

شمالی ہند میں اردو شاعری کا یہ حال تھا دکن اس کے مقابلہ میں کہیں آگے تھا، اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی کی شاعری کا شمالی ہند کے شعرا پر کیا اثر پڑا۔

ولی کا اثر شمالی ہند پر اس اثر کا پتہ لگانے سے قبل شمالی ہند میں جو ادبی فضا تھی اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا یہاں از حد ضروری ہے، یہ واضح ہوگیا کہ فارسی گوئی یہاں طرۂ امتیاز تھا لیکن اورنگ زیب کا زمانہ شمالی ہند میں فارسی کے خلاف بغاوت کا زمانہ کہا جاسکتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

شعرا نے محسوس کیا کہ خیالات کا ہو بہو اظہار بول چال ہی کی زبان میں ہوسکتا ہے۔ فارسی غیر ملکی زبان تھی جس پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں تھا، اس پر دوسری مشکل یہ تھی کہ اہل ایران ہندوستانیوں کی فارسی دانی کے قائل نہیں تھے۔ سوائے چند کے یہاں کا کوئی باکمال ان کی نظر میں نہیں سماتا تھا، حقیقت بھی یہ ہے کہ ہر زبان کا مخزن اس کا ملک ہوتا ہے ادب پر ماحول اور روایات کا بہت اثر پڑتا ہے انگریزی میں اگر ہم ایڑی اور چوٹی کا بھی زور لگائیں تب بھی زبان کی اصلی نزاکتوں سے مکمل واقفیت حاصل نہیں کرسکتے۔ غرض شمالی ہندوؤں کو ایرانیوں کا یہ رویہ ناگوار گذرا انھوں نے روزمرہ کی زبان کی طرف رغبت کی اور خصوصاً جب یہ دیکھا کہ اہل دکن نے اس کم مایہ زبان میں اپنے گلہائے شگفتہ کھلائے ہیں تو ان کی آتش رشک بھڑکی اور اس زبان کو جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی سر آنکھوں پہ رکھا اور اپنے دماغی جواہر سے اس کو آراستہ و پیراستہ کیا۔

اورنگ زیب کے بعد کوئی ایسا طاقتور حکمراں نہیں ہوا جو عنان حکومت کو سختی سے قابو میں رکھتا، ملک میں بدامنی اور بغاوت کا دور

دور ہوا اس لئے علمی مجالس کے شیرازے بکھرنے سے پہلے شاہان وقت نے فارسی کی قدردانی کم کردی، اورنگ زیب خود صوفی المشرب انسان تھے، انھیں فنونِ لطیفہ خصوصاً شاعری سے زیادہ لگاؤ نہ تھا اس لئے ان کی اس روش نے بھی فارسی کے تسلط کی بنیاد کمزور کردی امرا ورؤسا کا بھی یہی حال ہوا۔

اورنگ زیب کی فتح دکن سے شمال اور دکن میں آمد و رفت کا سلسلہ بڑھ گیا۔ ہر فن کے ماہر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے شمالی ہند کے شعرا نے جب یہ دیکھا کہ دکنی شعرا بول چال کی زبان میں کس خوبی سے خیال ادا کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کو جوش آیا اور فارسی جس سے پہلے ہی سے بددلی شروع ہو چکی تھی اس کو ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ میر اور سودا کے زمانہ میں ریختہ گوئی باعث کمال سمجھی جانے لگی۔ دکنی شعرا کی اس آمد و رفت کا ذکر تذکرہ سراج الدولہ سرور، اور تذکرہ مصحفی میں ہے، انھوں نے جو تعداد شعرا کی لکھی ہے وہ قابل اعتبار نہیں لیکن پھر بھی لوگوں کی نقل و حرکت کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔

دکنی زبان کی بہت سی کتابیں دہلی آئیں جہاں ان کی نقل ہوئی لوگوں نے جب کتابوں کو پڑھا تو روزمرہ کی وقعت معلوم ہوئی فارسی کی معزولی اور دکنی کی مقبولیت کے اسباب ظاہر ہو گئے۔

ولی کے دہلی آنے سے قبل شمالی ہند میں یہ فضا تیار ہو چکی تھی لیکن ولی کی آمد اس شوق پہ تازیانہ ہوئی۔ دہلی کی مجالس ان کے نغموں سے گونجنے لگیں، ہر جگہ قدر و منزلت کے فرش بچھے یہاں تک کہ ان کے واپس جانے کے بعد مشاعروں میں شعرا ولی کی غزل کا مصرع طرح کے لئے مقرر کرتے اور اس پر غزل کہنا باعث فخر سمجھتے، گو اس زمانہ کے شعرا کا کلام زیادہ تر ضائع ہو گیا۔ لیکن دیوان زادہ حاتم سے (جو اس زمانہ کی تنہا یادگار ہے اور جس کا ایک نفیس اور اصلی نسخہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے) اس کی شہادت ملتی ہے، خود دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انہی کی طرز پر لکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بعض اشعار میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے"

تذکرہ مجموعۂ نغز مولفہ میر قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرع اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے لکھا ہے:-

پیرخاں کمترین کہ خدا لیش بیامرزد بہ موقع و بجا گفتہ کہ " ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں"

اس زمانے کے تذکرہ بے جگر، جس کا مخطوطہ انڈیا آفس میں ہے ولی کی نسبت لکھا ہے:-

درحقیقت کسے کہ اسپ درمیدان ہندی دوانید آں بود و فی الواقع تشخصے آب رفتہ باز در جوے ایں زبان ہندی رسانید، ہماں بود چوں در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بدہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر و معانی تلاشان ہمعصر مثل حاتم و آبرو، و فغاں و غیرہ تتبع زبانش پیرو ہمزباں شدند"

مصحفی نے اپنے تذکرے میں خود حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا کلام دہلی میں بے حد مقبول ہو چکا تھا وہ کہتے ہیں:۔

روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرام گاہ دیوان ولی، در شاہجہاں آباد آمدہ، و اشعارش بر زبان خرد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بایہام نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضامین تازہ می دادیم"

(بحوالہ اردو، اپریل سنہ ۲۹ء)

ان اقتباسات سے ولی کا اثر شعرائے شمالی ہند پر ظاہر ہو گیا، مضامین، طرز بیان زبان وغیرہ میں ولی کا تتبع فخر سمجھا جاتا تھا گویا شمالی ہند کی ابتدائی شاعری کی تشکیل ولی ہی کے ہاتھوں ہوئی زبان اردو اور خصوصاً شمالی ہند کی شاعری پر ان کا جو احسان ہے وہ قیامت تک نہیں اتر سکتا، یہ ولی ہی کی ذات ہے جس نے شمالی ہند کے شعرا کی فارسی شاعری کے خلاف بغاوت میں رہنمائی کی لیکن دکنی زبان کی بھی جلد ہی مخالفت شروع ہو گئی کیونکہ یہ بھی ادائے خیال کے لئے مغلق اور پیچیدہ معلوم ہوئی اس لئے جلد کاٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا اس کی ابتدا مظہر سے ہوئی، میر، سودا اور ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ریختہ کی صورت عام ہو گئی تھی دکنی کو غیر فصیح سمجھنے لگے تھے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔۔۔ ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی ۔۔۔ گفتہ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

ولی کی عظمت کا راز

ولی کے متعلق "تذکرہ نویسوں کی آرا سے ثابت ہو چکا کہ وہ ایک مسلم الثبوت استاد تھے، ان کے تخیل نے اردو جیسی زبان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا، اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ اس عظمت کا راز کیا ہے؟

میر، غالب اور اقبال اردو شاعری میں محض نفس شعر کے لحاظ سے دقیع نہیں بلکہ وہ بلند شخصیت کے مالک بھی ہیں ان کا کلام ان کی شخصیت کا پرتو ہے، ولی کے کلام میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے، ہر شعر ان کی فطرت اور ظاہری شخصیت کا آئینہ دار ہے، شخصیت سے مراد جذبات و احساسات اور خیالات و ادراک وغیرہ ہیں جو شاعر زیادہ سے زیادہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرے گا اتنی ہی اس کی شخصیت نمایاں ہو گی ذوق، آتش اور ناسخ وغیرہ نے اپنی شخصیت کی تصویر کشی نہیں کی بلکہ خارجی اثرات کے دکھانے میں کمال حاصل کرنا چاہا، اس لئے ان کے کلام سے نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا، برخلاف ان کے ولی نے غالب وغیرہ کی طرح اپنے ذاتی مشاہدات کو شاعرانہ پیرایہ میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا چونکہ ان کی شاعری وہبی تھی اس لئے تخیل کی بلند آفرینیوں نے تمام شعری محاسن کو قایم رکھا غرض ولی کا درجہ مقرر کرنے میں ان کی شخصیت کے مطالعہ سے بہت مدد ملتی ہے۔

صوفی المشرب، آزاد منش، اور قانع ہونے کے باعث ان کی شخصیت سے نفس شعر میں بڑی ترقی ہوئی۔ ولی پہلے شاعر تھے جنھوں نے رنگین مضامین باندھے لیکن اس پردے میں انھوں نے اصلی روحانی واردات کو قلمبند کیا ہے، فلسفہ زندگی سے ان کو خاص لگاؤ تھا

اس لئے زندگی کے باریک حقایق اور رموز کی خوب تشریح کی لیکن کمال یہ ہے کہ فلسفی شعرا کی طرح ان کے کلام میں بے لطفی نہیں، ہر حکیمانہ خیال ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اس سے نفس شعر کے علاوہ معلومات عامہ میں بھی کافی اضافہ ہوتا ہے۔

فلسفہ اور شعر کی آمیزش کے خلاف ہمیشہ یہ اعتراض رہا کہ اس قسم کی شاعری میں شعریت نہیں رہتی، فلسفہ کی خشکی حسن شعر زائل کر دیتی ہے، اس کے متعلق دو گروہ ہیں ایک کا یہ عقیدہ ہے کہ شعر آرٹ ہے اس کا منشا مسرت و انبساط کے سوا کچھ اور نہیں، برخلاف اس کے دوسرا گروہ مصر ہے کہ فلسفہ شعر کی جان ہے، اس کا خیال ہے کہ شعر تفسیر زندگی ہونے کے سبب زندگی ہی کی ملکیت ہے اس لئے شعر کی عظمت مسائل زندگی کے پُرجوش اور دلپذیر پیرایہ بیان میں ہے، اس سے یہ حل ہو جائے کہ زندگی کس طرح گذاری جائے، وہ شعر جس میں اخلاق و نیکی کی مخالفت ہو زندگی کا مخالف ہوگا۔ کالرج کا مقولہ ہے "عظمت کے لئے فلسفیانہ دماغ ضروری ہے" ایمرسن (Emerson) کا نظریہ ہے "ایک شاعر کی عظمت مقرر کرنے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا کلام دماغ میں کس قسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے" لینڈر (Landor) کہتا ہے "شاعر کی عظمت زندگی کے عمیق مسائل بیان کرنے میں ہے" براؤننگ (Browning) کے نزدیک "اول فلسفہ دوم شاعری" لاویل (Lowell) کا فتویٰ ہے "میرے دل میں کسی شعر کی وقعت نہیں ہوتی جب تک اس میں کسی قسم کی نفسیاتی باریکی نہ ہو" ان مقولوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شعر کا مقصد فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانا ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ شعر کے تمام محاسن کو قایم رکھتے ہوئے جس قدر بھی فلسفہ ہوگا شعر کی حدود میں اضافہ ہوگا۔

اب ہم چند مثالوں سے یہ ثابت کریں گے کہ ولی نے فلسفہ زندگی کو حسن کاری سے مزین کر کے قالب شعر میں کس خوبی سے منتقل کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ولی نے غالب کی طرح اپنی فلسفیانہ شخصیت کو ہو بہو پیش کر دیا ہے۔ غالب کی طرح ولی کو بھی تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" کے مسائل بیان کرنے میں خاص دلچسپی ہے ؎

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر ۔۔۔ مشتاق نہیں سکندری کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی ۔۔۔ بند مت ہو سُبحہ زنار کا

اسی مضمون کو غالب نے بیان کیا ہے ؎

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ۔۔۔ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے نقاب اس کا ۔۔۔ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

غالب کا شعر ملاحظہ ہو ؎

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہیں صلح کل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر ۔۔۔ ازبسکہ وسعت مشربی سوں دل میرا دریا ہوا

اس شعر سے اگلے صوفیا کی راست بازی کا پتہ چلتا ہے، ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق ہونا چاہئے۔ اسی مسلک کا شعر غالب نے بھی کہا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۔۔۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یو بات عارفاں کی سنو دل سے سالکاں ۔۔۔ دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گماں محض

غالب کا شعر سنئے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد ۔۔۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہو بہو یہی خیال ملٹن (Milton) کا ہے ؎

"Life is a dream, World is a delusion

عمر جو یاد میں گذرے سو غنیمت سمجھو ۔۔۔ سو گیا عیش میں پھر اس کا جگانا مشکل

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد ۔۔۔ طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ولی زندگی کو شوپنہار یا میر کی طرح مشیت کا ستم نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے خیال میں ایک جام عیش ہے جس کی مختصر میعاد بھی حکمت سے خالی نہیں ؎

زندگی جام عیش ہے لیکن ۔۔۔ فائدہ کیا اگر مدام نہیں

ولی گوئٹے (Goethe) کی طرح دنیا کا صرف تماشا ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ اس کے آلام کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں ؎

کر مختصر جہان میں دنیا کی آرزو ۔۔۔ اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو

ولی نظیر اکبر آبادی کی طرح روز مرہ کے معمولی واقعات میں حصہ لے کر ایک حقیقی شاعر کی طرح جو کچھ دل پر گذرتی ہے اس کو نظم کر دیتے ہیں جس طرح نظیر خواص و عوام کے شاعر ہیں اسی طرح ولی بھی، سورت اور احمد آباد کی ثنویوں کے علاوہ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

باعث رسوائی عالم ولی　　　مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی
مرد کا اعتبار کھوتی ہے　　　مفلسی سب بہار کھوتی ہے

نظیر نے پیسہ اور مفلسی پر باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں ؎

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے　　　پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

عام حقیقت کا بیان اور اس قدر سادگی سے معمولی شعرا کا حصہ نہیں۔

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی نے میر، نظیر، غالب، اور اقبال کی طرح فلسفہ جیسی خشک چیز کو نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا فلسفہ کس نوعیت کا ہے، اگر اس میں خامیاں ہیں تو شاعر کا درجہ بلند نہیں، اوپر کے اشعار سے عیاں ہے کہ ولی کی شاعری میں ایسے مضامین ہیں جو عقل کے دائرے سے خارج نہیں بلکہ انسانی فطرت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ انسانی زندگی کے لئے ہمیشہ مستحسن رہیں گے۔

ولی کے فلسفہ اور تصوف سے معلوم ہو گیا کہ وہ دنیا کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر باکمال شاعر کا کوئی نقطۂ نظر ضرور ہوتا ہے۔ میر، غالب، جوش اور اقبال کو لیجئے۔ ان میں سے ہر ایک دنیا کو کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے ضرور دیکھتا ہے۔ ولی کا نقطۂ نظر یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو اشعار مثال کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے۔

زبان

ولی نے اپنے خیالات کے اظہار میں تمثیلی (Symbolic) زبان استعمال کی ہے جس کے ذریعہ ہر قاری پر وہی کیفیت ہوتی ہے جو شاعر پر شعر موزوں کرتے وقت گذری ہے انھوں نے اپنے لامحدود تخیل کو زبان جیسی محدود چیز میں اس لطافت سے بیان کیا ہے کہ ان کی قدرت زبان پر تعجب ہوتا ہے۔

شاعرانہ صداقت

ولی کی شاعرانہ صداقت ان کی عظمت میں خاص طور پر معاون ہے۔ انھوں نے کہیں زبان قلم کو غیر ضروری مبالغہ یا ہجو سے آلودہ نہیں کیا۔ لیوس (Lewis) کہتا ہے "لٹریچر کی قدر اس کی صداقت پر ہے" اس نظریہ کے مطابق ولی کے کلام کا درجہ واقعی ادب کی اعلیٰ صف میں ہونا چاہئے، ولی نے جو حقایق بیان کئے ہیں ان کو مبالغہ آمیزی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، ان تمام محاسن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ولی اقلیم سخن میں ایک قابل فخر ہستی ہیں۔ جن کے دم سے اردو میں فلسفہ اور ادب کی بے مثال گل افشانیاں ہوئیں ان کی جگہ میر، غالب اور نظیر کی صف میں ہے۔

اردو شاعری میں ولی کا رتبہ

از

جناب سید کوثر رضا صاحب متعلم بی۔اے فائنل ہندو کالج دہلی

حضرت ولی اللہ عارف باللہ کا رتبہ اُن کے نام کی طرح "ہنوز ایک راز ہے،، ذمہ داری کے خیال نے مورخین کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی ہے اور شعرار کی تحقیق زیادہ تر حسن تعلیل کے نمونے پیش کر رہی ہے۔ جناب احسن مارہروی جن کی تحقیقات اس سلسلے میں احسن سمجھی گئی ہیں۔ اور درحقیقت ہیں بھی۔ کم و بیش سات نام لکھ کر فرماتے ہیں کہ "یہ سب نام ایک مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور چونکہ شعرا عام طور پر اپنے نام اور اُس کی مناسبت سے تخلص کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے نام میں لفظ ولی شامل ہو اور ولی الدین، ولی محمد اور ولی اللہ زیادہ قرین قیاس ہے،،

مگر ہمیں ان کے نام سے کام نہیں البتہ کام سے بحث ہے۔ ولی اردو کے اولین صاحب دیوان شاعر کہلاتے ہیں اور اردو کی دنیائے شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائے دنیا اور حضرت آدم کے متعلق بحث الٰہیات کا وظیفہ ہے اور ابتدائے شاعری و آدم الشعرار کی تحقیق اردو ادبیات کا جزو لاینفک۔ ہماری شاعری کی ابتدا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ اگر عام روایات کو در خور اعتنا سمجھ لیا جائے تو اردو شاعری کی ابتدا اُس زمانے میں ہوئی جب اورنگ زیب نے دکن پر فوج کشی کی اور افواج عالمگیر نے دکن میں قیام کیا۔ اُسی وقت میں اس لشکر (اردو) کی بہترین صنف (یعنی شاعری) نے بھی پہلے پہل مظاہرہ کیا اور ولی اس کے جلوس میں نظر آئے۔

مولوی محمد حسین آزاد جو سر سید، نذیر احمد، حالی و شبلی کی طرح اردو ادبیات کے عناصر خمسہ میں سے ہیں اُن کے نزدیک اردو کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اُس زمانے کی نثر کا کوئی نشان نہیں ملتا اور نظم موجود ہے **آب حیات** میں ولی کو نہ صرف جام عالی تفویض ہوا ہے بلکہ اُن کو پہلا ساقی سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ تذکرہ مذکور میں احمد گجراتی۔ سعدی دکنی، خسرو۔ سیوا۔ اور نواز کا ذکر بھی موجود ہے جو ولی پر تقدم زمانی رکھتے ہیں مگر آزاد کا معیار تقدم بالشرف تھا۔ اسی لئے اُنھوں نے ان شعرار کا کلام علمیت۔ طرز اور ترتیب سے معرا دیکھا

تو خارج از آہنگ سمجھا اور ولی ہی کو پہلا شاعر مانا۔ جیسا کہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ولی کو ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو۔

دیگر محققین کے نزدیک اُردو شاعری کی ابتداء ولی سے ایک مدت پہلے ہو چکی تھی۔ اور متعدد شعرا گذر چکے تھے اور یہ ولی کا محض تفوق تھا جس نے انھیں ممتاز کیا اور اردو شاعری کا موجد مشہور کر دیا۔ چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں اپنی کتاب "گلشن بے خار" میں لکھتے ہیں :-

"اختلاف است دریں کہ اول کسیکہ بریختہ سخن کردہ است (یعنی ولی) یا پیشتر ہم فکر دریں زبان شائع بود بتحقیق تقدیم ثانی بر اول است وتوثیق آنست کہ تا زمانش دیگرے برتبۂ او نرسیدہ و موجد گفتش را علت ہمیں باشد"

صاحب جلوۂ خضر یعنی صفیر بلگرامی بھی اس خصوص میں نواب مصطفےٰ خاں کے ہمنوا ہیں۔ صفیر صاحب کی رائے ہے اور یقیناً صائب ہے کہ اردو زبان مدت سے دکن میں موجود تھی اس لئے لازمی طور پر پہلے نثر ہی نے جلوہ دکھایا ہوگا اور پھر نظم کا نمبر آیا ہوگا۔ ان کے قول کے مطابق پہلے امیر خسرو کی گنگا جمنی غزلوں کی ضرور نقل ہوئی ہوگی اور پہیلیوں نے پہلے پہل بہت لوگوں کو تک بند بنا دیا ہوگا اور چونکہ ولی کا کلام صاف و شستہ بھی ہے اس لئے ہرگز ابتدائی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ہے۔ صفیر صاحب کے بیان کی تصدیق اُن دکنی شعراء کے کلام سے ہو جاتی ہے جن میں ولی کی سی صفائی و شستگی نہیں بلکہ امیر خسرو کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔

مگر صاحب جلوۂ خضر کی یہ تحقیق شاعرانہ منطق کی ایک دلیل کا مصرع اولیٰ ثابت ہوئی یعنی ان سرگرم حالات میں جب اُردو شاعری کے اصل موجد کا سراغ نہ لگا تو انھوں نے ایجاد و اولیت کی دستار سعدی دکنی کے سر پر رکھ دی اور اس شرف ارزانی میں سعدی دکنی ہی کے ایک شعر کو اُس کے اول اُردو شاعر ہونے کی سند تصور کیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہی ہم گیت ہی

صفیر صاحب نے اس شعر سے یہ معنی پیدا کئے ہیں کہ یہ شعر دکنی زبان میں ہونے کی وجہ سے گیت کہا گیا اور فارسی بحر میں ہونے کے سبب شعر "شیر و شکر آمیختہ"، دکنی اور ایرانی زبان کے ملنے اور ایک نئی زبان بن کر ریختہ کہلانے پر دلالت کرتا ہے۔ اور "سعدی غزل انگیختہ" سعدی کے موجد غزل ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شعر کون سی آفات ارضی وسماوی سے اس طرح منقلب ہو گیا۔ حالانکہ اکثر کتب میں اس کی صورت یہ دیکھنے میں آئی ہے ؎

سعدی بہ گفتار ریختہ در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

اور اگر فی الامر محال اس شعر کا کوئی رکن "سعدی غزل انگیختہ" ہو بھی تو کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اس میں شاعرانہ تعلی کا احتمال نہیں ہے

اور پھر شاعرانہ تعلی نہ بھی ہو تو اس سے صرف غزل کے موجد کا کچھ سراغ لگتا ہے باقی اصناف سخن کی ایجاد پھر بھی سر درگم رہے گی۔ صفیر صاحب نے اپنی تحقیق سے مذہبی اور عاشقانہ ہر دو اصناف شعر کی ابتدا قطب شاہیوں کے عہد حکومت میں ثابت کی ہے۔ اور اس کے بعد میر کی کتاب "نکات الشعراء" کے حوالے سے اس دور کا آغاز دکھایا ہے جس میں فراقی۔ احمد گجراتی۔ سراج۔ ضیائی وغیرہ ولی کے معاصرین ہوتے ہیں۔ اب اگرچہ یہ حوالہ بھی پادر ہوا ہے تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ ولی کے زمانہ میں شاعروں کا ایک گروہ موجود تھا۔ صاحب سحر الہند نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور سب سے بڑا ثبوت ولی کے وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے اُس عہد کے شاعروں پر چوٹیں کی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی — کہ جس پہ رشک آویگا ولی کو

لگتے ہیں حاسدوں کے یوں دل میں بیت میرے — سینے میں دشمناں کے جیوں ذوالفقار آوے

ایسے اشعار بھی ہیں جو فخریہ کہے گئے ہیں۔ اور ارباب خبر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے مضامین صرف نوک جھونک کی غرض سے باندھے جاتے ہیں۔ اور نوک جھونک ہمیشہ معاصرین ہی سے ہوا کرتی ہے۔ ولی کے ہاں فخریہ شعر موجود ہیں مثلاً

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی — باہر ہے تیری فکر رسا حد بشر سے

ہے سخن جگ منے عدیم المثال — جز سخن نئیں دوجا جواب سخن

عرفی و انوری و خاقانی — مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

مندرجہ بالا بیانات، اقتباسات و دلائل سے ولی کے دکنی ہمعصر شعرا کا وجود ثابت ہے پھر دہلی میں بھی ان کے ورود سے قبل شعرا کا پایا جانا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ چنانچہ میر حسن نے بھی ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا ہے جو ولی سے پہلے دہلی میں تھا اور اس کا تخلص خاکی تھا۔ میر حسن لکھتے ہیں۔

"مردے بود درویش از شاہجہاں آباد در عہد جہانگیر احوالش معلوم نیست۔ از یک مرد پیرے یک شعرش بگوش خورد ؎

ٹھانی ہے اپنے من میں اب بھی تجھ سجن — تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

اس نقطۂ نظر سے تو ولی یقیناً نہ اول شاعر ہیں اور نہ اول صاحب دیوان۔ مگر اس روکھی پھیکی بے معنی ولایت یعنی صرف نام کی "اردو شاعری" سے قطع نظر جو نہ پڑھی جائے اور نہ سمجھ میں آئے۔ اصل اردو (وہ اردو جو آج ہم بولتے ہیں) اس کی ولایت تمام تر ولی ہی کے زیر نگین نظر آتی ہے اور وہی اس کے موجد معلوم ہوتے ہیں۔ دہلی میں بھی صرف انہیں کے دم سے یہ گہما گہمی ہوئی اور دکن میں بھی سر برآرائے شعر و سخن رہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

جیوں گُلِ شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم　　　جیوں شمع سربلند ہیں ہر انجمن میں ہم

اپنے معاصرین میں صرف اُنھی کا کلام ہے جو ہر صنفِ سخن میں موجود ہے۔ اُن کی خصوصیات اور انوکھی طرزِ نگارش نے انھیں ایسا ممتاز کیا کہ وہی اُردو شاعری کے موجد سمجھے گئے اور درحقیقت موجودہ رنگِ تغزل اس ندرت و اہتمام کے ساتھ کہ قافیہ بھی ہے اور ردیف بھی، قصیدہ بھی مع تشبیب و گریز و خاتمہ۔ مثنوی ہر طرح مکمل اور کیا نہیں؟ رباعی، قطعہ، مستزاد، مخمس، سب (سوائے واسوخت کہ یہ میر کے لیے چھوڑ گئے تھے) تمام و کمال ولی کا مرہونِ منت ہے۔ اور ان معنوں میں یقیناً ان کی ایجاد اور وہ موجودہ اُردو شاعری کے قائدِ اعظم بلکہ آدم الشعراء۔

امیر خسرو اور دوسرے متقدمین کا کلام جو طبع ہوا یا نہ ہو سکا بھاشا اور فارسی کی انمل بے جوڑ ترکیب کی بدولت نامطبوع رہا۔ آج اس کا پڑھنا اور سمجھنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں۔ ذیل میں ایسے شعرا کا کلام مشتے از خروارے پیش کیا جاتا ہے تاکہ ولی کے کلام سے مقابلہ کیا جا سکے اور زمین و آسمان کا فرق واضح ہو جائے۔

(خسرو)　زحالِ مسکیں مکن تغافل دُورائے نیناں بنائے بتیاں　　　کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

سعدی دکنی　تشفتہ چو دیدم بر رُخت گفتم کہ یہ کا دیت ہے　　　گفتا کہ دُرہو باورے اس شہر کی یہ ریت ہے

حامد　عزم سفر چوں کردی ساجن ہمنوں نیند نہ آوے جی　　　قدرِ وصالت نہ دانستم تم بن برہ ستاوے جی

اُمید۔ یہ ایرانی تھے مگر اردو بھی کہہ لیتے تھے۔ مگر ایسی ؎

بامن کی میتی آج مری آنکھوں پری　　　غصہ کیا دگالی دیا اور دگر لری

گو ولی کے دیوان میں بھی چند غزلیں ٹھیٹ دکنی زبان میں نظر سے گذریں مگر ترکیب و التزام قافیہ کی بدولت وہ بھی کچھ ایسی بدرنگ نہیں معلوم ہوئیں۔ ولی کے معاصرین یا متقدمین کے کلام "آں دفتر را گاؤ خورد"، کی سچائی پر دلالت کر رہے ہیں اور ولی کا کلام آج بھی مقبولیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بعض اشعار میں تو ایسی زبان صرف کی گئی ہے کہ دو سو سال بعد بھی محاورے میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جہاں تک تمام کلام کا تعلق ہے۔ الفاظ کا تلفظ بدل جائے۔ محاورے بدلا کریں مگر وہ طرز جس کی بنیاد ولی ڈال گئے ہیں اَمٹ اور امر معلوم ہوتی ہے۔ چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

شاخِ گُل ہی یا نہال راز ہے　　　سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

جب نقش اُس صنم کا نقاش کھینچتا ہے　　　بازو کے کھینچنے میں وہ ہاتھ کھینچتا ہے

تا چند لکھوں بات تری خوش شکلی کی　　　اے شوخ ترے غمزوں نے جو کی سو بھلی کی

مذہبِ عشق میں تیری صورت　　　دیکھنا ہم کو فرضِ عین ہوا

صنم کے لعل پر وقتِ تکلم　　　رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے — دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں
سن تو دل کیوں توڑا اس بت عیار کے ہاتھ — کوئی آتا ہے بھلا ایسے ستمگار کے ہاتھ
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
لام نستعلیق کا ہے اُس صنمِ خوشخط کی زلف — ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ظاہر ہے کہ یہ زبان نہایت فصیح ہے۔

ولی کا رتبہ سمجھنے کے لئے اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ آب حیات اور دیگر کتب میں ولی کو اعلیٰ علم اور فن عروض سے نابلد کہا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ معترضین ولی کے اشعار کی تقطیع کرتے وقت موجودہ تلفظ کرتے ہیں اور شعر بحر سے گر جاتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے۔ ولی کی نہیں بلکہ معترضین کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ اور اِس زمانہ کے تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے مثلاً اُس وقت نہیں کا تلفظ "نیں" تھا۔ ولی نے جہاں کہیں "نہیں" باندھا ہے اکثر "نیں" ہی تلفظ کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع سے ثابت ہوتا ہے۔

چار دن کے	حسن پر مت	کر غرور	
حسن کو دا	ئم بقا نہیں[1]	الغیاث	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	(یہ بحر رمل مسدس مقصور ہے اور شعر بالکل درست)

اسی طرح اِس شعر میں نہیں کا تلفظ "نیں" ہی ہے۔ "نہیں" پڑھنا شعر کو ناموزوں کر دے گا۔

جو کہ تجھ پر نگاہ کرتا نہیں — وہ اپس کی خودی بسرتا نہیں

علم کے متعلق یہ ہے کہ ولی کا کلام تو یہی بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں

زلف و رخ ہے ترا جو لیل و نہار — مجکو واللیل والضحیٰ کی قسم
مضطرب عشق سے ہوں مجکو ملامت گرد — تپش دل نے دیا رشتۂ سیاب مجھے
جس نے پکڑا اگوشۂ آزادگی — اس کو موجِ بوریا شمشیر ہے
تمام پات تسبیح بحمدہٖ کے بہ حکم — زبانِ حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی
حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالب عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

---

[1] اس نہیں کو "نیں" پڑھئے جب "تن" کے موافق ہوگا۔ اور یہی سمجھ کر ولی نے باندھا ہے۔

وحدۃ الوجود صوفیہ کے عقاید سے ہے اور اسی سے واقفیت ولی کی اعلیٰ قابلیت پر دال۔

ولی کا رتبہ دکھانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام کی خصوصیات، اصناف سخن کے نمونے اور مبحث کلام کی توضیح کی جائے

اصنافِ سُخن اور ولی

ولی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مستزاد، مثنوی، رباعیات، قطعات، مخمس، ترجیع بند اور مفردات غرض سب قسم کے نمونے موجود ہیں۔ یہاں ایک ایک صنف کا تفصیل وار ذکر کیا جاتا ہے تاکہ کلام کی نوعیت مبحث کلام کا درجہ اور مبحثِ کلام سے مراد وہ افکار ہیں جو شاعر کے ذہن میں آئے اور کسی نہ کسی صورت میں سلسلۂ نظم سے منسلک ہو گئے

غزل

شروع شروع کی غزلیں نہایت سادہ ہیں اور شاید افہام و تفہیم کی سہولت کے خیال سے ردیف کا التزام نہیں کیا۔ اور اگرچہ غزل میں عاشقانہ مضامین ہی بیان کرنے چاہیں اور ولی نے زیادہ تر ایسا ہی کیا بھی ہے لیکن بعض غزلوں میں متفرق مضامین پر مشتمل اشعار بھی ہیں اور یہی تنوع اور رنگارنگی شعراء دورِ حاضرہ کی غزلوں میں بھی کارفرما ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مُسلسل غزل جو زمانۂ موجودہ کی ایجاد سمجھی جاتی ہے اور جس پر سیماب اکبرآبادی، ڈاکٹر اقبال اور خصوصاً جوش ملیح آبادی بہت زور دیتے ہیں، ولی کے دیوان میں بھی موجود ہے مسلسل غزل کے تمام اشعار ایک ہی مضمون کی کڑیاں ہوتے ہیں کہ اگر ایک شعر بھی نکال دیں تو غزل کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ حالانکہ عام غزلوں میں یہ نہیں ہوتا کیونکہ اُن کا ہر شعر بجائے خود ایک پورا مفہوم رکھتا ہے۔ ذیل میں ایک غزل۔ ایک مسلسل غزل۔ اور مبحث کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے غزلوں کے مختلف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل

پڑی جو نظر چشم دلبر طرف — ہوا ہوش یکبارگی بر طرف
اگر آبرو تجھ کو درکار ہے — نہ جا خوبرویاں کے کشور طرف
کُھلے دیکھ تجھ لب کوں آب حیات — کرے یک نظر گر تو شکر طرف
زبس تجھ ملاحت کا مشتاق ہوں — پڑا شور تجھ حُسن کا ہر طرف
ولی کو نہیں مال کی آرزو — خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

مُسلسل غزل

لامکاں پر بنا احمد جو بنا بٹھلایا — تب ملایک نے وہیں صلوا علیکم گایا
حور و غلماں نے ترانے سوں وہ نغمے بولے — قاب قوسین کا نوشہ ہے تو سب کو بھایا
تھے براتی وہاں آدم سوں لگا تا عیسےٰ — اور جبرئیل امین گوندھ کے سہرا لایا

حق نے لولاک لما حق میں محمدؐ کے کہا ‏ ‏ اُن سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

مغفرت تیری وؔلی سہل بلا ریب ہے کیوں

نام احمد کا جو ہر دم ترے لب پر آیا

یہاں کیوں کی ترکیب بھی غور طلب ہے یہ چیزیں غالب کا حصہ سمجھی جاتی ہیں اور میں بھی۔

کہتے ہیں ؎ ‏ ‏ کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول ‏ ‏ آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

یا یہ شعر ؎ ۔

لو کاٹا ہے اُلٹا شہ بیکس کے گلے کو ‏ ‏ یہ ظلم تو دیکھو

مشکل سے ہوئی ہوگی سرِ تن میں جدائی ‏ ‏ کیوں؟ کند تھا خنجر

مگر وؔلی کا کلام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ زمانہ اور یہ اسالیبِ نگارش!

متفرق اشعار و بحث کلام

جسے عشق کا تیر کاری لگے ‏ ‏ اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے ‏ ‏ (زار نالی)

ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو ‏ ‏ رکھتے نہیں نظیر اپس کی سخن میں ہم ‏ ‏ (فخریہ)

موج دریا کی دیکھنے مت جا ‏ ‏ دیکھ اُس زلفِ عنبری کی ادا ‏ ‏ (عاشقانہ)

وؔلی رکھتا ہوں سینے میں ہزاروں گوہرِ معنی ‏ ‏ دکھاؤں اپنے جوہر کو اگر کوئی جوہری ہووے

(شکوۂ ناقدریٔ ابنائے زماں)

عجب نہیں جو حقیقت پہ آفریں بولے ‏ ‏ وؔلی جو کوئی سنے اس وضع کی تصنیف ‏ ‏ (موجد ہونے کا احساس)

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب ‏ ‏ بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی ‏ ‏ (عاشقانہ)

یہ وہی رعبِ حسن کا مضمون ہے جو طرح طرح سے بندھتا چلا آتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے ‏ ‏ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے —— بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گُل ‏ ‏ (تخیل)

کیا بات ہے۔ ایسے مضامین تو آجکل بھی کم سننے میں آتے ہیں۔

کچھ بھلا نہیں رقیب کو لگتا ‏ ‏ ایک پاپوش خوب لگتی ہے ‏ ‏ (رندانہ)

سیہ روئی نہ لے جا حشر میں دنیائے فانی سوں ‏ ‏ ‏ سیہ نامہ کو دھولے بے خبر انجھواں کے پانی سوں

مصحفِ مکھ ترا ہے سورت فجر ‏ ‏ ‏ مجکوں اَلنّجم اور ہوا کی قسم

مصحف مکھ کی اضافت پر نہ ہنسنا چاہیئے یہ آج سے دو سو سال قبل کی زبان ہے مضمون کو دیکھئے اور شاعر کے مذاق اور بلند پروازی کی داد دیجئے۔

او سیدا سے یاراں میرا سلام کہنا ‏ ‏ ‏ ہوں یاد میں تمہاری میں صبح و شام کہنا

اور مجھ پاس کیا ہے دینے لوں ‏ ‏ ‏ دیکھ کر تجھ کو روئے دیتا ہوں

اس شعر پر بےساختہ غالب یاد آجاتے ہیں اُن کے شعر بھی ملاحظہ ہوں۔ صاحبانِ نظر ہر دو جواہر کو آنک لیں مگر زمانہ کا خیال رہے۔ ولی دو سو سال پہلے کے شاعر تھے۔

غالب کہتے ہیں ؎

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے ‏ ‏ ‏ بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ ‏ ‏ ‏ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

(ولی) کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اُس کوں ——— کھایا ہے جو کئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا (عشق حقیقی)

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا ‏ ‏ ‏ مفت ہے دیکھنا سرِ جن کا (مطالعۂ نفس)

اشارہ ہے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی طرف

مت مار ولی کو میاں اتنا تو کہا کر ‏ ‏ ‏ یو ناز ترا جگ میں اٹھا کون سکے گا (مجاز) (عاشقانہ)

شیخ یاں بات تری پیش نہ جائیگی کبھی ‏ ‏ ‏ زُہد کو چھوڑ کے مت مجلس رنداں میں آ

نہ کر سکوں ترے اک تار زلف کی تعریف ‏ ‏ ‏ کروں ہزار کتب تجھ ثنا میں گر تصنیف (عجز)

قسمت تری ہے حق پہ نہ ہو نا امید یہاں ‏ ‏ ‏ نہیں اِس قفل کوں غیر توکل کلید یہاں (پند۔ توکلت علی اللہ)

طمع مال کی سر بسر عیب ہے ‏ ‏ ‏ خیالاتِ گنج جہاں سر سے ٹال (موعظہ)

مستزاد مستزاد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ غزل کے ہر مصرع پر ایک فقرۂ نثر بڑھایا جائے جس کا مفہوم مصرع سے چسپاں ہو جائے۔ اور دو لخت نہ معلوم ہو۔ ایسے مستزاد فارسی میں اکثر دیکھنے میں آئے ہیں اُردو میں نہیں۔ دوسری قسم کے مستزاد ایسے ہوتے ہیں کہ بجائے فقرۂ نثر کے دو رکن ہر مصرع پر بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کہ مضمون مصرع سے مل جائے اور یہ رکن پھر الگ کے الگ رہیں یعنی غزل کے مصرع اور بڑھائے ہوئے ٹکڑے میں وہی تعلق ہو جو ہر دو متصل مصرعوں میں ہوتا ہے

انشاء و مصحفی کے مستزاد مشہور ہیں۔ ولی کے مستزاد کا نمونہ لکھا جاتا ہے۔

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کو بدن میں گُل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں رنگیں دہناں کا

لاگی ہے لگن تم سوں چھڑا کون سکے گا ہے کس میں یہ قدرت
اب مجکوں وطن اپنے لیا کون سکے گا کر دل سوں رفاقت
مت مار ولی کوں میں یہ کہتا ہوں "کہا" کر سن بات ہماری
اس ہجر کے طومار کو پا کون سکے گا بن غمزہ ظرافت

قصیدہ ولی نے اپنی عمر میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح نہیں کی اس لئے قدرتی طور پر قصائد جو درباروں اور سرکاروں کی زینت ہیں ولی کے یہاں نہ ہونے چاہئے تھے۔ مگر ولی اپنے نام کے ولی تھے۔ حمد خداوندی، نعت رسول مقبول و مدح بزرگان دین میں قصیدے لکھے اور خوب لکھے۔ یہ قصیدے ہر طرح مکمل ہیں تشبیب و گریز و خاتمہ سب کچھ ہے مگر محاورات زیادہ تر دکنی ہیں۔ بہر طور شوکت الفاظ و رفعت تخیل جس میں قصیدہ کی برتری کا راز مضمر ہے۔ ولی کے ہاں موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

لے زباں پر تو اول آول نام پاک خدائے عز و جل
لایق حمد نہیں ہے اُس بن اور اِس اُپر متفق ہیں اہلِ ملل

اس قصیدے میں قطعہ بند بھی ہیں اور درمیان میں غزل بھی شروع ہوتی ہے کہتے ہیں ؎

دیکھ تیری یہ چشم رشک غزل مدح تیری میں یہ کہا ہوں غزل
اے یہ تیرے نین ہیں دو چنچل دیکھنے جن کو خلق آوے چل

قصیدہ در نعتِ رسُول مقبُول صلی اللہ علیہ وسلم

عشق میں لازم ہی اول ذات کو فانی کرے ہو فنا فی اللہ دایم یاد یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دو نین کر ابر بہار پیچ کھا سینے میں دل کو سنبلستانی کرے
مرتبہ خُلت پناہی کا وہ پاوے گا جو کئی مثل اسمٰعیل اول جی کو قربانی کرے

ترجیع بند ترجیع بند میں غزل کی طرح ایک مطلع اور چند اشعار رکھ کر ایک بیت کی جس کا قافیہ لازمی طور پر پہلے اشعار سے مختلف ہو۔ گرہ لگائی جاتی ہے۔ یہ بیت بدستور قایم رہتی ہے اور اس طرح کہ ہر بند کے آخر میں آتی ہے۔ وَلی کا ایک ترجیع بند لکھا جاتا ہے۔

بزور نزاکت بزور ادا — صف گلرخاں کا ہے تو مقتدا
مددگار تھا جب تلک بخت سعد — نہ رہتا تھا اک آن تجھ سوں جدا
یکایک ترے ہجر نے اے صنم — کیا محو سب عشرت ابتدا
کروں تجھ سے کیوں آرزوئے جواب — سدا کوہ تمکین ہے بے صدا
ترے غم سوں پھٹتی ہے چھاتی مری — ہوئے اشک سوں دو نین نربدا
بجا ہے سنو گر مرا التفات — کہ سنتے ہیں شہ عرض حال گدا
تغافل کو مت کام فرما سجن — مری بات سُن کر برائے خدا

شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں

مُخمّس کسی شعر پر تین مصرع لگانا اس طرح کہ یہ تینوں مصرعے شعر کے پہلے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ ہوں اور معنی کے اعتبار سے مربوط۔ یہی تخمیس لکھنا کہلاتا ہے مخمس دوسروں کے اشعار پر بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور فارسی اشعار پر بھی اردو کے مصرعے لگا لیتے ہیں۔ مگر ولی نے صرف اپنے ہی اشعار پر مخمس کہے ہیں معلوم ہوتا ہے فارسی اشعار کو اس لئے تخمیس نہیں کیا کیونکہ اُن کی توجہ تمام تر اردو کو بنانے اور ترقی دینے میں مصروف تھی اور وہ صرف اسی میں کوشاں تھے۔ اور دوسرے اُردو شاعروں کے اشعار پر اس لئے کوئی مخمس نہیں لکھا کیونکہ ولی انھیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُن کے کلام کو اُردو ہی نہ سمجھتے تھے اور وہ ایسا سمجھنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ ولی کے مخمس کا رنگ حسب ذیل ہے

(۱) عشق کے درس کا ہوں میں استاد — طفل مکتب ہے مجھ آگے فرہاد
بندہ تیرا ہوں گرچہ ہوں آزاد — بسکہ رکھتا ہوں تجھ قدم کی یاد
دل ہوا خوں مرا حنا کی قسم

(۲) نیرنگی ترے لب کی مسیحا پہ لکھا ہوں — افسوں ہے جنوں نسخۂ ایما پہ لکھا ہوں
ہر چند کہ غم کوں دل رسوا پہ لکھا ہوں — تصویر تری جان مصفا پہ لکھا ہوں
یو نقش پری پردۂ مینا پہ لکھا ہوں

قطعہ | غزل یا قصیدے کا ٹکڑا جو کسی پورے اور مسلسل معنی کا حامل ہو قطعہ کہلاتا ہے۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر ہوتے ہیں ایک شعر پر قطعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس میں مطلع ضروری نہیں اور اکثر نہیں ہوا کرتا۔ اس میں ولی کا رنگ حسب ذیل ہے۔

قطعہ

حسنِ دلبر کا خواب میں دیکھا　　نورِ حق تھا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں حق کا　　یہ تماشا حباب میں دیکھا

اس قطعہ سے بھی ولی کا ترفع خیال و مذاق تصوف ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی | مجمع الصنائع میں ہے کہ رباعی منسوب بہ رُباع ہے۔ چونکہ رُباعی میں چار مصرع ہوتے ہیں اس لئے اس کو رُباعی کہتے ہیں اور اسی لئے اس کا نام چار مصرعی اور دو بیتی بھی ہے۔ مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ صرف چار مصرعوں سے رباعی نہیں ہوتی اس کے اوزان مقرر ہیں جو چوبیس[۲۴] بتائے جاتے ہیں اور رُباعی ہمیشہ بحر ہزج میں آتی ہے۔ رُباعی کا مشہور وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ ہے۔ ولی کی بعض رُباعیاں اس وزن پر پوری نہیں اُترتیں اس لئے انھیں قطعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر رباعی کے چاروں مصرعوں میں قافیہ ہو تو وہ مُصرّع کہلاتی ہے ورنہ خصی۔ ولی کی تمام رُباعیوں میں تیسرا مصرع بغیر قافیہ ہے۔ اس لئے انھیں خصی کہنا چاہئے لیکن آج کل یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ عام رواج یہی ہو گیا ہے کہ تین ہی مصرعوں میں قافیہ ہو۔ مثال کے طور پر ولی کی ایک رباعی لکھی جاتی ہے

دیوانِ ازل بیچ خدائے بیچوں　　یہ حکم کیا عام کہ ہاں کُن فیکوں
افرادِ دو عالم کا بندھا شیرازہ　　اِس دفترِ کونین پہ فہرست ہی توں

مثنوی | یہ نہایت مفید صنف نظم ہے۔ اس میں اوّل سے آخر تک ابیات ہی ابیات ہوتے ہیں جن کا قافیہ اور اگر کسی بیت میں ردیف ہو تو ردیف بھی، ہر بیت کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس میں رزم و بزم دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ ولی نے ایک نہایت مختصر مثنوی شہر سورت کے متعلق کہی ہے۔ جس میں محاکات کی شان جلوہ گر ہے۔ یعنی بالکل تصویر کھینچ دی ہے

اب ولی کے کلام کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

خصوصیات | مزاج میں شوخی ہے (جیسا کہ اس شعر سے بھی ظاہر ہے:

ایک پاپوش خوب لگتی ہے　　کچھ بھلا نہیں رقیب کو لگتا

مگر استخفاف انبیاء و اولیاء سے پرہیز کرتے ہیں تضحیکِ واعظ و ناصح میں چند شعر کہے ہیں لیکن ان میں بھی ایسی تذلیل و تحقیر نہیں کی

جیسی بعد کے شعرا نے کی ہے۔ مقابلہ کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
تضحیک واعظ اور زاہد۔

شیخ صاحب برائیاں سے کی! | اور جو کوئی چپت کی آ جائے ؟

استخفاف انبیاء اور غالب۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر | نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اس کے برعکس ولی کے یہاں متانت ہے کہتے ہیں۔

سمجھ کر بات کر اے مرد ناصح | نصیحت عاشقوں کو ہے تحکّم

ہوا ہے صورت دیوار زاہد کنج عزلت میں | یہی اس حسن حیرت بخش کی ظاہر کرامت ہے

آلودہ کیوں نہ ہووے دامانِ پاک زاہد | جب دستِ نازنیں میں جام شراب آوے

ولی کے مندرجہ بالا اشعار میں مزاح ہے لیکن بداخلاقی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک نصیحت کا پہلو لئے ہوئے۔
کلام میں زیادہ تر سادگی و بے ساختگی ہے۔ کہتے ہیں:۔

کیا تری زلف کیا ترے ابرو | ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہے

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر | جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر

ہے جدائی میں زندگی مشکل | آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر

توجہ زیادہ تر معنی کی طرف ہے۔ لفظی رعایتوں کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

گرچہ پابندِ لفظ ہوں لیکن | دل مرا عاشقِ معانی ہے

کلام میں درد پایا جاتا ہے۔ اور خود کہتے ہیں ؎

شعر مرا سراسر ہے درد | خط و خال کی بات ہے خال خال

نئے مضامین کثرت سے پیدا کئے ہیں لیکن ان کے متاخرین نے انہیں مضامین کو بار بار باندھ کر پھیکا کر دیا ہے۔ تاہم ایسے اشعار دکھائے جا سکتے ہیں جن میں ندرت موجود ہے۔

جس نے پکڑا گوشۂ آزادگی | اُس کو موجِ بوریا شمشیر ہے

ایسے شعر پہلے بہت گذر چکے ہیں اور اسی مضمون میں آگے آئیں گے۔
اُن کی شاعری مُخرب اخلاق نہیں ہے۔ بلکہ بیشتر موعظہ و اخلاق پر مشتمل ہے اس کی مثالیں غزل کے متفرق اشعار میں گزریں۔

ولی کے ہر شعر سے ایک مسلمان کا کلام ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہر حالت میں مذہب مدنظر رہتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے اور نہیں کہہ سکتے
ولی کسی بادشاہ یا وزیر کا قصیدہ نہیں کہتے خود ہی بادشاہ ہیں۔ روپے کی خاطر جھوٹی سچی مدح پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں۔

ولی کو نہیں مال کی آرزو　　　　خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

ولی کسی کی ہجو نہیں کرتے حالانکہ آزاد لوگ بھی اس معصیت سے ملوث ہو جاتے ہیں۔ مگر ولی مبرا ہیں۔ ان کا کلام ہجو سے پاک ہے۔
ولی کے یہاں حقیقت و مجاز دونوں ہیں۔ اور انھوں نے خود بھی صاف صاف کہہ دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

درد ادی حقیقت جس نے قدم رکھا ہو　　　　اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

طریقت صوفیہ کے مطابق جب کسی سے دلی تعلق ہو جاتا ہے تو صاف دل اور پاک باطن ہونے کی وجہ سے نام بھی ظاہر کر دیتے ہیں جو
بھلا معلوم ہوا اسی کی تعریف کر دی۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے　　　　جیوں مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

ہے بسکہ آب و رنگ حیا کھیم داس میں　　　　آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

خصوصیات کلام کے بعد صنائع لفظی و معنوی جو ولی کے کلام میں موجود ہیں ان کا نہایت مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے (یہ وہ صنعتیں ہیں
جن کا اب تک اس مضمون میں کسی طرح ذکر نہیں آیا)

تشبیہ | جب دو چیزیں کسی خصوص مشترک کی وجہ سے ایک دوسرے جیسی بتائی جاتی ہیں تو اسے تشبیہ دینا بولتے ہیں تشبیہ کی ضرورت
تشبیہ کے فوائد۔ تشبیہ کے اقسام پر روشنی ڈالنے کا یہ محل نہیں صرف ان صنعتوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو ولی کے کلام میں بدرجہ
اتم پائی جاتی ہیں۔ ولی کہتے ہیں ؎

لخت دل پر خط لکھا ہوں یار کو　　　　داغ دل مہر سر مکتوب ہے

دل کو خط سے محبت کو مضمون سے (یہ نہایت لطیف کنایہ ہے) اور داغ دل کو اس مہر سے تشبیہ دی ہے جو لفافے یا خط کے اوپر لگائی جاتی ہے
نہایت اعلیٰ تشبیہ ہے اور رازداری کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

موج دریا کی دیکھنے مت جا　　　　دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

اس تشبیہ کو تشبیہ اضمار کہتے ہیں۔ اس شعر میں زلف کو موج دریا سے تشبیہ دی ہے لیکن ظاہر یہ کیا ہے کہ گویا تشبیہ دینی مقصود نہیں ہے۔
اسی طرح اور بہت سی عمدہ تشبیہات ولی کے کلام میں دکھائی جا سکتی ہیں۔

استعارہ | جب کوئی لفظ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ کسی مناسبت کی وجہ سے کسی دوسرے معنی میں یعنی معنی مستعار

میں استعمال کیا جاتا ہے تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ ولی کے یہاں استعارہ ہے لیکن بہت کم اور نہایت سریع الفہم۔ مثلاً کہتے ہیں ع

کیا ہے ابر نے رحمت سے گوہر افشانی

یہاں بارش کی بجائے گوہر افشانی کہا گیا ہے۔

تجنیس | جب دو لفظ اپنے تلفظ اور حروف میں (یا محض حروف میں یا اکثر حروف میں) ایک دوسرے جیسے ہوں اور یا میں ہم اُن کے معنی ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اُن کے درمیان صنعت تجنیس ہوتی ہے۔ تجنیس کی بہت قسمیں ہیں یہاں صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو ولی کے کلام میں خاص طور پر جاذب نظر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اے ستمگر عاشقوں پر یوں نہ کر جور و ستم | خیر اور شر کی حقیقت میں ہے اک مثقال قال

مثقال قال میں تجنیس مکرر ہے یعنی ہم جنس الفاظ متصل واقع ہوئے ہیں۔

ترے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن کشن کی مانند | اپس کی مکھ اُپر رکھ کر گنگا کی بانسلی انکھیاں

بن = بغیر۔ بَن = جنگل۔ بن اور بَن میں تجنیس محرّف ہے یعنی حرکت کے سوا جو ایک میں زبر اور دوسرے میں زیر ہے حروف دونوں کے ایک ہی ہیں اور معنی مختلف۔

تلمیح | تلمیح یعنی لطیف پیرایہ میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا۔ مندرجہ بالا شعر میں اس کی مثال موجود ہے۔

ایہام | جب کلام میں قصداً کوئی ذومعنی لفظ رکھا جاتا ہے۔ اور اُس سے بجائے قریب الفہم بعید الفہم معنی متصور ہوتے ہیں تو اسے صنعت ایہام یا توریہ کہتے ہیں۔ ولی کہتے ہیں ؎

مذہب عشق میں تیری صورت | دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا

عین کے معنی آنکھ اور دوسرے معنی بالکل یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا | اُس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

یہاں پہاڑ سے کوہ طور کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ یہاں پہاڑ سے مراد نہایت مشکل کام ہے۔

حسن طلب | نہایت خوبصورتی سے سوال کرنا۔ یہ بھی بڑی صنعت ہے۔ ولی کہتے ہیں ؎

لب تمہارے ہیں شفا بخش، ولی ہے بیمار | حیف صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

تجاہل عارفانہ | جب کوئی شخص کسی شے کو اچھی طرح جاننے کے باوجود انجان پن ظاہر کرے تو اسے تجاہل عارفانہ کہتے ہیں۔

ولی اپنے محبوب کے متعلق کہتے ہیں ؎

شاخِ گل ہے یا نہال راز ہے   سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

عکس | اس صنعت کے لئے یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ بجائے پورے شعر یعنی دو مصرعے بنانے کے ایک مصرع بنایا جائے اور اس کے دو ایسے برابر کے ٹکڑے ہوں کہ دوسرا ٹکڑا پہلے اور پہلا ٹکڑا بعد میں کر دینے سے بھی معنی پیدا ہوں اور یہی منقلب مصرع شعر کا مصرعِ ثانی سمجھا جائے مثلاً حافظ کا یہ شعر ؎

دلبر جانان من. بُرد دل وجان من   بُرد دل وجان من دلبر جانان من

ولی کہتے ہیں ؎

مجھ کو ہے دار الامن پیو کا نقش چرن   پیو کا نقش چرن مجھ کو ہے دار الامن

ردالعجز علی الصدر | جب ایک جملہ کا آخر اور دوسرے جملے کا شروع ایک ہی لفظ کی تکرار سے ہو تو صنعت ردالعجز علی الصدر رونما ہوتی ہے { اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ صدر پہلے مصرع کے اوّل رکن کا نام ہے اور عجز دوسرے مصرع کے آخری رکن کا کسی شعر کے ارکان کے یہ نام ہوتے ہیں

صدر ———— عروض
حشو
مبدار ———— عجز

ولی نے اس صنعت کے ساتھ ایک اور اہتمام بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ جہاں پہلے مصرع کا شروع وہی ہے جو دوسرے مصرع کا آخر ہے وہاں دوسرے مصرع کا شروع بھی وہ ہے جو پہلے مصرع کا آخر ہو لکھتے ہیں:-

دلربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا   خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہے دُوجا دلربا

پوری غزل ایسی ہی ہے۔

قول بالموجب | جب کہنے والا ایک بات کہتا ہے اور سننے والا اُسے سن کر دوسرے معنی میں توڑ مروڑ لیتا ہے تو اُسے قول بالموجب کہا جاتا ہے۔ ولی کہتے ہیں:

میں کہا تیرے بدن پر کیا بھلی لگتی ہی راکھ   ہنس کہا جوگی بسر کو خاک لگتی ہے بھلی

ایرادالمثل | اور اسی کو ضرب المثل اور ارسال المثل بھی کہتے ہیں۔ جب کوئی بات کہی جائے اور پھر اُس پر کوئی مثل بھی بیان کر دی جائے تو اُس کے یقین کرنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اور بات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ولی کہتے ہیں

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے   بجھتا نہیں ہے باد صبا سے چراغ گل

پہلا مصرع ایک دعویٰ بلا دلیل تھا اُسے دوسرے مصرع سے گویا ثابت کر دیا ہے۔

کیونکہ سیری ہو سخن سے تیرے   دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نہیں

یہاں حسن کو دھوپ اور سیری نیت کو سیری شکم سے تعبیر کر کے ولی نے اپنے محبوب کو برابر دیکھے جانے کی ایسی وجہ بیان کی ہے کہ اب وہ ولی کو دیکھنے سے منع نہیں کر سکتا (یہ ہے مثل بیان کرنے کا فائدہ)

مندرجہ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ولی کے کلام میں بہت صنعتیں ہیں امر واقعہ یہ ہے کہ شعراء دورِ حاضرہ کے کلام سے بہت کم ہیں لیکن ہیں ضرور۔ اور اس کمی پر بھی تمام صنعتوں کا استیعاب اس مقام پر نہیں کیا جا سکتا۔ صرف وہ صنعتیں بیان کی گئیں جو ولی کے کلام میں خواہ مخواہ اپنی طرف توجہ منعطف کر لیتی ہیں

بیساختگی۔ صفائی بیان۔ سلاست ترنم خیال اور سوز و گداز میں کہیں کہیں ولی کا کلام میر سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں بھی اصناف سخن کے تحت میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ولی جنھوں نے شاعری میں کسی کے آگے زانوئے ادب تہ نہیں کیا بلکہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن کا پورا پورا ثبوت دیا اُن کا کلام موجودہ اردو شاعری کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے۔ اردو کے شاعروں نے تقریباً انھیں اصناف سخن میں ترقی کی ہے جن کی ولی آج سے دو سو سال قبل طرح ڈال گئے تھے۔

چاسرِ ہند

(۱)

سید عباس حسین صاحب نقوی امید متعلم بی اے (عثمانیہ)

ولی جس پہ ہے ناز اہل دکن کو
دکن کیا بلکہ خود ملک سخن کو

وہ خاکِ خطۂ اورنگ آباد
دلاتی ہے جو عالمگیر کی یاد

وہ بھومی ہے ولی خوش بیاں کی
بنی تربت شہ ہندوستاں کی

ولی کا ہے وہی اردو میں رتبہ
جو انگریزی میں چاسر کا ہے درجہ

وہی نسبت ہے انکی شاعری کی
جو کچھ ہے فارسی میں رودکی کی

نہ مانیں کیسے اہل ہند احسان
تن اردو میں جس نے ڈالدی جان

ولی ہی سے ہے آبِ آبرو بھی
انہیں کا خوشہ چین ہے آرزو بھی

کھلا سن سے ولادت کے نیا حال
ہزار اور اسپہ ستر پہ تھے نو سال

وطن سے علم کے لے کر خزانے
گئے گجرات میں تعلیم پانے

جبھی تو ان کو گجراتی سمجھکر
ہے سب گجراتیوں کو ناز اُن پر

جو پلٹے آپ وہاں سے بن کے کامل
ہوی شعر و سخن پر طبع مائل

ہیں اصنافِ سخن جتنے جہاں میں
کیے سب جمع اردو کی زباں میں

شمالی ہند میں دو بار جا کر
بٹھایا اپنا سکہ سب کے دل پر

جو تھے اشعار ان کے ریختے میں
پڑھے جانے لگے ہر ہر گلی میں

کلام ان کا جو تھا ہر اک کو مرغوب
جہاں میں ان کی شہرت ہوگئی خوب

جو ستھرا تھا مذاقِ طبع اُن کا
بجا ہندوستاں میں اُن کا ڈنکا

جو تھا صحبت کا انکی شوق سب کو … ہوا شعر و سخن کا ذوق سب کو
طبیعت دار جو ذرو آشنا تھے … وہ دل سے نام پر اُن کے فدا تھے
نہیں دیکھا کہیں ان کو اکیلا … لگا رہتا تھا ان کے ساتھ میلا
ہوی جب چار جانب انکی شہرت … ہر اک کی خود ہوی مائل طبیعت
ولی کا جو بجا عالم میں ڈنکا … ہوا شیدا ہر اک شعر و سخن کا
پڑا ہر اک کو چسکہ شاعری کا … ہوا یوں بول بالا شاعری کا
ولی اللہ ان کا نام نامی … غزل گوئی میں تھا انداز جامی
تعصب سے بری تھی ذات اُنکی … سراپا شعر تھی بات اُنکی
ہیں اُردو شاعری کے جتنے اضاف … جھلکتے ہیں ولی کے اُن میں اوصاف
قدامت معترف انکی زباں کی … ہے دلچسپی مقرِ حسنِ بیاں کی
ترنم، سادگی، حسن سلاست … فصاحت وہ، فدا جس پر بلاغت
تکلف طبع میں ان کے کہاں ہے … ہے آمد یا کوئی دریا رواں ہے
تھے علمی قابلیت میں بھی یکتا … جبھی ہے مستند ہر قول اُن کا
ہیں اہلِ ہند پر احساں ولی کے … مجدد ہیں یہ اُردو شاعری کے
ادب کی ہند میں بنیاد یہ ہیں … حقیقت میں "جہاں استاد" یہ ہیں
ہمارے درسگاہوں کی یہ تعمیر … ولی کے خواب کی یکسر ہے تعبیر
لگائی تھی جو شاخ اُس مقتدا نے … کیا سرسبز اس کو جامعہ نے

حقیقت میں ہیں قدرت کے عجب کام
وہ اِک آغاز تھا اور یہ ہے انجام

دکھنی شعرا کا سفرِ شمالی ہند

از

جناب خلیق احمد صاحب نعمانی (عثمانیہ)

شاعر شعر کہنے سے زیادہ سنانے کا شائق ہوتا ہے، لکھنے سنانے اور پھر متکیف ہونے میں وہ زندگی کی بے شمار مسرتیں پنہاں سمجھتا ہے۔ اُس کو اِس کا موقع بادشاہوں کے درباروں اور امیروں کی بارگاہوں میں ملتا ہے۔ شعر و شاعری کی گرم بازاری، شخصی حکومت کے سایہ میں ہوا کی ہے، نہ کہ جمہوریت کے نقار خانہ میں، کہ واں شخصی امتیاز، و ذاتی برتری نفس اجتماعی کے تابع رہتی ہے۔ شخصی حکمرانوں کے لیے شاعری ایک دلچسپ مشغلہ رہی ہے۔ جس سے خوش ہونے اور ذاتی وقار کا پرچار کرنے کا سامان فراہم ہوجاتا ہے۔ شاعر بقائے نام اور اظہارِ مفاخرت کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے فتح و کامرانی کے ساتھ باکمال شعرا بھی دربار میں طلب کیے جاتے تھے۔ اور انہیں اعلی رتبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ سلطان محمود نے خوارزم سے جن ارباب علم و فضل کو غزنی میں بلا بھیجا تھا اُن میں ابو الخیر خمار ابو ریحان بیرونی کے علاوہ عراقی بھی تھا۔ جب ایران میں ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں کی فیاضیوں، اور نکتہ سنجیوں کی صدائیں پہنچیں، تو وہاں کے باکمال شاعروں نے اس طرف کا رُخ کیا۔ اور بڑے بڑے خطابات سے سرفراز اور انعام و اکرام سے نہال ہوئے سلطان محمد تغلق نے بدر چاچی کو "فخر زمان" کا خطاب عطا کیا۔ اکبر نے غزالی مشہدی کو ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جہانگیر نے طالب آملی، اور شاہجہاں نے کلیم ہمدانی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ شمالی ہند میں شاہجہانی دور تک فارسی شعر و شاعری کی قدر افزائی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن عالمگیر کی تخت نشینی سے فارسی شاعری کو نا معلوم دھکا لگا۔ صوفی سرمدؒ کے قتل اور احکام شریعت کی پابندی اور احتساب نے فارسی شاعری کی بے لگام مبالغہ آرائیوں کو روکا۔ بزم شعر و شاعری کی بجائے رزم کی بساط بچھی، اور پیادہ گردی شروع ہوگئی۔ عالمگیر دکن کی فتح میں محو ہوگیا۔ دکھنی ہندوستانی کی اس قدر افزائی نے عالمگیری اُمرا کو بھی اُس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی فارسی شاعری کی شمع عالمگیر کے چند ایک جانشینوں تک جھلملاتی رہی۔ اور بیدل کے ساتھ فارسی شاعر کا جنازہ نکلا۔ بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ)

کی یاد میں تاریخ وفات کے دن چراغاں ہوتے اور تلامذۂ بیدل جمع ہوکر شعر کیا پڑھتے، گرم گرم آنسو بہاتے کہ فارسی شعر کہنے کا زمانہ نہ رہا۔ ناصر علی، شیخ علی حزیں اور مرزا جان جاناں مظہر، سراج الدین علی خاں آرزو کی چشمکیں زمانہ کی ناساز گاری کے طعنے تھے۔

جب گجرات سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا تو وہاں کے ارباب علم وفضل اور شعراء بجائے دہلی جانے کے بیجاپور چلے آئے، جہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بے نظیر فیاضی دکھائی۔ ہندوستانی کی سرپرستی اور بادشاہ کی فیاضی کا شہرہ سن کر عبدل بھی اسی کے عہد میں بیجاپور آیا اور "ابراہیم نامہ" تصنیف کیا۔ اگرچہ عالمگیر نے نصرتی کی بڑی قدر افزائی اور خطاب سے سرفراز کیا۔ لیکن اس نے شمالی ہند کا سفر نہ کیا۔ ولی ہی پہلا دکھنی شاعر ہے جس نے شمالی ہند کا سفر کیا۔

دورِ اوّل
سنہ ۱۰۹۰ تا ۱۱۳۰ھ

"دکھنی شعراء کا سفر شمالی ہند" کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور سنہ ۱۰۹۰ ہجری سے سنہ ۱۱۳۰ ہجری تک ہوگا۔ اس دور کو سنہ ۱۰۹۰ ہجری سے شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ولی نے دہلی کا سفر اس سنہ کے بعد کیا۔ جب کہ شاہ گلشن دہلی میں موجود تھے اور پھر دوسرا سفر عالمگیر ہی کے زمانہ سنہ ۱۱۱۲ھ میں کیا۔ اشرف نے اپنی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" میں فرخ سیر کو مخاطب کیا ہے۔ جو سنہ ۱۱۳۰ ہجری میں تخت دہلی پر متمکن تھا۔ اسی سنہ میں ولی کا مرتبہ دیوان دلی پہنچا، اور حاتم نے اس کا تتبع کیا۔ جس سے باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس لیے فطری طور پر یہ دور سنہ ۱۱۳۰ ہجری تک قرار دیا جانا چاہیے۔

اس دور کا نصف اول عالمگیر کے عہد حکومت سے تعلق رکھتا ہے اس زمانہ میں ولی۔ آزاد فراقی۔ بیجادہ۔ دہلی گئے۔

یہ زمانہ اُن لوگوں کے لیے جو گولکنڈہ اور بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے، نہایت پر آشوب تھا۔ اہل دہلی عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب عادل شاہی اور قطب شاہی خزانوں سے کئی کروڑ نقد اور کروڑوں روپئے کے جواہرات اور طلائی ظروف ہاتھ آئے تو عالمگیری سپاہ، اور اُمرا پر انعامات واکرامات کی بارش ہوئی۔ مغلوں کے تمول میں اضافہ ہوا۔

ولی اور اُن کے دکھنی معاصرین نے دہلی کے خوش حال ماحول میں "مرغ زرین" کی مداح سرائی نہیں کی بلکہ ان شاعروں نے اپنے شاعرانہ کمال کی داد چاہی اگرچہ فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی کو ولی کے "اعجاز سخن" کا قائل

ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے اپنے تخلص — ولی — کی مناسبت سے ولی پر اپنی فضیلت جتلائی۔

اِن کا کلام اُن کے دہلی جانے سے قبل ہاتھوں ہاتھ "عزیزوں کی بیاض" کے ذریعہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن "جواہر" کو پرکھ کر "معدن" سے مطلب رکھنے والوں کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب ولی نے پیہم اصرار پر شاہجہاں آباد کا دوسرا سفر سنہ ۱۱۱۳ھ میں اختیار کیا۔ اور دکھنی "شرابِ تازہ" کے رنگین جام لنڈھائے گئے جب آزاد اور فراقی بھی شریک کار ہوگئے، نوساقی گری کا ایک دور قایم ہوگیا۔ ولی کے دہلی جانے سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ فارسی گو شعرا نے ولی کی شہرت اور قدر و منزلت سے متاثر ہوکر "دکھنی ہندوستانی" میں شعر کہنا شروع کیا۔ خواہ وہ "بیمن تفول" ہی کیوں نہ ہی، چنانچہ موسوی خاں فطرت (متوفی سنہ ۱۱۰۱ھ) بیدل (سنہ ۱۱۳۳ھ) اور عبدالغنی قبول (سنہ ۱۱۳۹ھ) کے شعر تذکروں میں ملتے ہیں۔ فارسی شاعری سے بیزاری کا یہ اعلان "ہندوستانی" کی ترویج کا باعث ہوا۔ تاریخ ادبیات میں اس طرح کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں جب کہ ایک ملک کے شعرا نے دوسرے ملک کا سفر کرکے وہاں علم و ادب اور شعر و سخن کا بیج بویا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں یونان قبل مسیح کے واقعات سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ایتھنز کے نامور مصنفین اور شعرا نے سیراکیوز کا سفر معزز و محترم مہمانوں کی حیثیت سے کیا۔ ہیرو اول کے عہد حکومت میں سیراکیوز کو ایسکلیس، پنڈار، سائمنڈیس، اور باکلیڈس نے، اور ڈائنی سیس دوم کے دور حکمرانی میں افلاطون نے اپنے قدوم سے شرف بخشا۔

اِن کی آمد کے سو سال بعد نہ صرف نادر روزگار مہندس اور انجنیر آرشمیدس نے بلکہ تھیوکریٹس جیسے مطربِ خوش نوا، اور دہقانی شاعری کے موجد نے سیراکیوز میں جنم لیا۔

اس دکھنی "خوشہ پروین" نے جو ولی، آزاد، فراقی، بیچارہ، اور اشرف پر مشتمل تھا، بچھم کے افق پر نمودار ہوکر شعر نور کی بارش کی، جس کے سو سال بعد دہلی سے مرزا غالب کی ضو فشانی نے دنیائے اُردو کو خیرہ کردیا۔

اس دور کے نصف آخر میں پایہ تخت پر تباہی و بربادی کی بدلیاں چھانے لگیں۔ جہاندار شاہ کا قتل، فرخ سیر اور سادات بارہہ میں کشیدگی، فرخ سیر کے قتل کے بعد سیدوں کا غلبہ مرہٹوں کی ستم رانیاں، اور بادشاہ گردی نے اہل دہلی کے امن چین میں خلل ڈال دیا۔ اِس دور اختلال میں اُردو شاعری کا آغاز کیسے ہوتا؟ مگر اشرف اور طالب اُس وقت دہلی میں موجود تھے۔ ایک نے مثنوی کہی، اور دوسرے نے کئی ایسے دکھنی شعراء کے کلام سے روشناس کرایا جنہوں نے دہلی کا سفر نہیں کیا تھا۔ اِس دور کی ایک دکھنی یادگار "بیاضِ طالب" کا ذکر مخزنِ نکات میں کیا گیا ہے۔

ولی بحیثیت سیّاح

ولی کی شخصیت پر اُس کی شاعرانہ شہرت نے پردہ ڈال دیا۔ تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی کہیے، "باکمال شہرت" کی برکت، کہ اُن کی تمام تر زندگی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پہلے شاعر کے کلام کو محض کلام کی خاطر دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہ رہا۔ حیات شاعر کی روشنی میں شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ولی کے کلام کی برتری نے ارباب اردو کو اُن کی حیات گم شدہ کی تلاش میں سرگرداں کر رکھا ہے۔

میر پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ولی کو اورنگ آبادی لکھا۔ لیکن گردیزی نے "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" لکھ کر بحث کی طرح ڈالی۔ اگر تذکرۂ ریختہ گویاں (گردیزی) اور نکات الشعراء (میر) کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گردیزی نے ولی کے کلام کا میر کے تذکرے سے انتخاب کیا، لیکن چونکہ اسے میر سے بیر تھا، اس لیے یہ چھپانے کے لیے کہ اُس کے پیشِ نظر میر کا تذکرہ نہیں تھا، ولی کے حالات میں مذبذب تحقیق کا ایک شاخسانہ لگا دیا۔ اور "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ" کہہ کر گریز کیا۔

ولی کے بارے میں قائم کا ایقان "ولی" کے دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، انہوں نے ٹھوکر پر ٹھوکر کھائی۔ شاہ وجیہ الدین سے والہانہ شیفتگی کو پڑھ کر ولی کو اُن کا فرزند لکھ مارا۔ اور پھر حضرت شاہ صاحب کے گجراتی ہونے کی وجہ سے ولی کو بھی گجراتی سمجھا۔ "فراق گجرات" والے قطعہ سے ان کے خیال کو اور بھی تقویت ہوئی۔ مابعد تذکروں کے یہی تین ماخذات ہیں۔ سرور اور قاسم نے گردیزی کے بیان پر اکتفا کر کے ولی کو باشندہ دکن لکھا۔ اور خاموش ہو رہے۔ علی ابراہیم، فائق اور آزاد نے قائم کا اتباع کیا۔ میر صاحب کے پر زور مؤیدین میں شفیق اور عبدالجبار خاں ملکاپوری - اصل اختلاف قائم اور میر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ قائم کا بیان قیاسی اور صرف دیوان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اُن کے بیان پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اوّل تو یہ کہ میر صاحب نہایت محتاط تذکرہ نویس تھے۔ انہوں نے شک کو اپنے تذکرہ میں بہت کم جگہ دی ہے۔ دوسرے یہ کہ دکھنی شعراء کے بارے میں "بیاض عزلت" میر صاحب کا واحد ماخذ تھا اور عزلت خود سورتی تھے۔ اگر ولی کا مولد گجرات ہوتا تو وہ کیسے خاموش رہتے۔ اگر میر نے غلط بیانی کی ہوتی تو گردیزی کو موقع تھا کہ وہ اسے غلط محض بتاتا۔ کیونکہ اس نے بھی بیاض عزلت سے استفادہ کیا تھا۔ پس عزلت اور میر سے زیادہ ثقہ روایت کس کی ہوسکتی ہے؟ ولی خود کہتے ہیں ؎

دکھنی زبان میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں اے ولی۔ لیکن نہیں بولا ہے کئی اک شعر خ

علاوہ ازیں جس قطعہ کو سند میں پیش کیا جاتا ہے اس میں بعض ایسے کھلے اشارے ہیں جن سے اس دعوے کی تکذیب ہوتی ہے ؎

ہجرت سے دوستاں کی ہوا جی مرا گداز — عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں — اس میکدہ سوں اٹھ کے چلا سد ھ بسار دل

دوستوں کی یاد اور اُن کی مفارقت کو بیان کرنا اور عزیز و اقربا کی طرف اشارہ تک نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس گاہ وطن گجرات نہیں تھا۔ بلکہ "فراق گجرات" احباب کی یاد سے بیتاب ہوجانیکی صدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "قطعہ در فراق گجرات" درد بھرے دل سے نکلا ہے۔ لیکن یہ آتش بیانی دراصل نتیجہ ہے اپنے مرشد نورالدین صدیقی سہروردی دادا پیر حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ اور سید ابوالمعالی سے تعلق خاطری کا۔ اسی قطعہ کے ایک شعر ؎

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا — آخر کو اس فراق میں کھینچا خمار دل

سے گجرات میں بطور سیر و سیاحت آنے کی تصدیق ہوتی ہے۔ وطن جائے قیام ہے نہ کہ سیرگاہ، نیز احسن مارہروی صاحب کا قیاس ہے کہ "شہر گجرات کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے۔ جبکہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبہ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے" ہماری رائے اس کے خلاف ہے، ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی کا پہلا سفر جوانی کے زمانہ میں کیا ؎

اوّل سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں — جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی۔ ولی نے زمانۂ شیب میں ایک دور دراز سفر حجاز مقدس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ ولی سے رہا نہ گیا، بے اختیار رو دیئے اور فراق گجرات میں مرثیہ پڑھا۔ لیکن حج کی برکت اور "فیض حق" سے اُنھیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے ؎

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں — پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

ولی گجرات حصولِ علم کی خاطر اُس زمانہ میں گئے، جبکہ وہ سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے۔ حُسنِ گجرات اور اُس کی دلکشی کو دیکھ کر وہیں پڑے رہے۔ ابوالمعالی سے محبت ہوگئی۔ اور اُن ہی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ واپسی پر گجرات آئے، اور پھر اپنے وطن اورنگ آباد لوٹ گئے۔ اور یہیں سے دہلی کا دوسرا سفر کیا۔ اس زمانہ میں اُن کے اشعار قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے دہلی جانے سے پہلے ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا ؎

سخن صاحب سخن کا سُن کے ملنے کی ہوس مت کر — جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب

[illegible] کا سفر مادی ترغیبات کی خاطر نہیں کیا۔ بلکہ وہ "سخن آشنا سوں آشنا" تھے ؎

سخن فہم تجھ کو پاؤں گا — حال دل کا تجھے سناؤں گا

اور اپنے کمال کا پرچار اُن کا مقصدِ زندگی ہے

آیا تری طرف[1] جو ولی تو عجب نہیں
آتا نہیں تجھ گلی منیں صاحب کمال چل

اس صاحب کمال کی دہلی میں جو قدر افزائی کی گئی وہ محض لطف سخن کی نمائش تھی۔ ولی کی وارفتہ مزاجی کا کام تو اس قدر تھا کہ
کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں؟

ہے سبزہ زارِ حُسن سراپا سوادِ ہند
خوبان بانمک سوں بھرا ہے بلادِ ہند

عشاق باصفا کے ہے سینہ میں یادِ ہند
ہیئم کی زلف پیچ و ساجھ سوادِ ہند

اس راہ مار پیچ ہے اے دل سنبھال چل

غرض یہ کہ وہ دہلی میں خاموش نہیں رہے، جبتک رہے شعر و سخن کے چرچوں میں گھرے رہے۔ مگر وطن کی یاد نے اُنھیں بے چین کردیا۔ اور دہلی کے قدر دانوں سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس
ولی پرداغی کرتا تری ملک دکن بہتیر

اس ایقان کے ساتھ کہ

ہے شمع کی نمن تو ہر اک چمن منیں
گلزار نو بہار ہے بیشک دکن منیں

آزاد | فقیر اللہ نام ہے، لیکن بعض تذکرہ نویس[2] محمد فاضل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولد و منشاء حیدرآباد دکن ہے، بچپن میں یتیم ہوگئے۔ شروع سے طبیعت لااُبالی تھی۔ عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ انکی یہ افتادِ طبیعت جوانی میں رنگ لائی فراقی سے بہت ربط ضبط تھا۔ دونوں ایک ساتھ دہلی گئے۔

اس زمانہ میں ولی کا طوطی بول رہا تھا، شاہ جہاں آباد کی صحبتوں میں جہاں "شراب تازہ" (دکھنی کلام) کے رنگین جام لنڈھائے جارہے تھے، آزاد کا وجود شب و شینہ کی سرمستیوں میں اضافہ کا باعث ہوا۔ ولی کو ایک اور ساتھی ملا۔ اب تو ساقی گری کا ایک دور ہی قائم ہوگیا۔ غزل کے جواب میں غزل کہی گئی۔ محفل مشاعرہ میں طرحی غزلیں پڑھی گئیں، معاصرین کے مصرعوں پر گرہ، اور اشعار پر تضمین کی گئی۔ چنانچہ ولی نے آزاد کے مصرعہ پر ایک گرہ لگائی ہے۔

آزاد سے سنیا ہوں یہ مصرعہ منا
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ گرہ شاہجہاں آباد میں ہی لگائی گئی۔ آزاد "بھاگ نگر" کے رہنے والے اور ولی

---

[1] "تیری طرف" سے مراد دہلی ہے جس کا اُنھوں نے ایک مخمس میں ذکر کیا ہے۔ اسی مخمس کے ایک بند کو ہم نے اس مضمون میں درج بھی کیا ہے۔
[2] گردیزی، شفیق، اور کریم الدین یا فیلن۔

"خجستہ بنیاد" کو بیس برس کی عمر میں چھوڑ، احمد آباد میں رہنے لگے تھے۔ اور وہیں سے دہلی کی راہ لی۔ گئے آئے، اور پھر گئے، آزاد سے وہیں ملاقات ہوئی ہو گی، معاصرانہ چشمک[۵۱] سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔

تمام تذکرے آزاد کو ولی کا ہمعصر بتلاتے ہیں لیکن شفیق شاگرد سمجھتا ہے اور لکھتا ہے کہ آزاد "خود را یکے از شاگردان او می پنداشت" غالباً یہ رائے ولی کے اس شعر کی بنا پر قائم کی گئی ہے۔ جس میں آزاد کے "مصرعہ مناسب" کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس سے آزاد کا ہمعصر، اور ہم پلہ شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کریم الدین یا فیلن نے انکی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے کہ

"ایک کتاب بنام ظفر نامہ تصنیف کی ہے جس میں بیان کیا ہے اون فتوحات کا جو کہ محمد حنیف ابن حنیفہ نے کیئے۔[۵۲]

اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نمونہ کلام بھی درج نہیں کیا۔ ظفر نامہ جس کا موضوع وہی "محمد حنیف کی جنگوں کے حالات"[۵۳] ہے، غلام علی خاں لطیف کی بھی تصنیف ہے۔ جو عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کا شاعر تھا۔ اسی موضوع پر ایک اور مثنوی "جنگ نامہ" ملتی ہے۔ اس کا مصنف سیوک ہے۔ یہ بھی اسی عہد کی پیداوار ہے۔ افسوس کہ آزاد کا یہ ظفر نامہ ابتک دستیاب نہیں ہوا۔

ان کی وہ مشہور غزل تک دستیاب نہیں ہوئی، جس کے ایک مصرعہ پر ولی نے گرہ لگائی ہے۔ قدیم تذکروں میں "مصرعہ مناسب" والا شعر ملتا ہے۔ جدید تحقیقات نے بھی اسوقت تک آزاد کا کلام پیش نہیں کیا۔ چنانچہ "دکن میں اردو" "اردو شہ پارے" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ آزاد کی نسبت میر جیسے نقاد سخن نے یہ رائے لکھی ہے "بسیار بصفا حرف می زد" میر حسن بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آزاد کا شعر یہ ہے۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں ۔۔۔ پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

فراقی

فراقی کے متعلق شمال و دکن کے تذکرے خاموش ہیں۔ تعجب ہے کہ میر نے آزاد کا ذکر رو ا رکھا اور نہ یاد کیا تو فراقی کو! حالانکہ اس کے تین چار سال بعد ۱۱۶۸ھ میں قائم اپنے تذکرہ میں آزاد کے ساتھ فراقی کے ذکر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہر دو باتفاق برائے دیدن شے (محمد یار خاں صوبہ دار دہلی) بدار الخلافت آمدند چوں ... باکثرت صحبت خاطر نشین اینہا گردید۔ تتبع او گشتند چنانچہ از رویہ اشعار ایں ہر دو بزرگوار پیدا ست۔"

قائم کے بعد قاسم اور میر حسن نے فراقی کا تذکرہ کیا ہے۔ قاسم نے خاص اہتمام سے فراقی کے اشعار پر بحث بھی کی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ "فراقی تخلص از مردم دکھن بود ہمراہ فقیر اللہ آزاد بہ ہند آمدہ بود" اس زمانہ میں محمد یار خاں دہلی کے صوبہ دار تھے۔ شاہجہاں آباد ولی اور آزاد کی دکھنی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا تھا۔

فراقی شاعر ہے لیکن ولی کی ٹکر کا نہیں۔ فراقی نے گو اس کا یہ ہی ثبوت نہیں ملتا، کوس لمن الملکی بجایا ہو گا تب ہی تو

---

۵۱ دیکھو ثبوت میں فراقی کا ذکر۔ ۵۲ طبقات شعراء ہند۔ ۵۳ بلوم پارٹ

ولی کھرا کھرا جواب بناتے ہیں ے

ترے اشعار ایسے نیں فراقی　　　　کہ جس پر رشک آویگا ولی کوں

باوجود اس کے کہ ولی نے اظہار یگانگت اور اعتراف سخن کی بنا پر فراقی کے ایک مصرعہ پر گرہ لگائی ہے کہتا ہے ے

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم　　　　کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

فراقی کا شعر یہ ہے ے

فراقی کشتہ ہوں اُس آن کا جس دم کہ وہ ظالم　　　　کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

"مجموعۂ نغز" میں ایک اور غزل کا مطلع بھی مندرج ہے جسے قاسم نے کسی قدیم بیاض سے نقل کیا ہے ے

ہمنا کے دل کو جس دم تم نے چلے پیارے　　　　مونھ تکتے رہ گئے یہ ہمدم سبھی بچارے

فراقی خوش قسمت ہے کہ اس کی دو غزلیں بحر گمنامی میں غرق ہونے سے محفوظ رہیں جو ہاشمی صاحب کی تلاش سے ان کی تصنیفات میں طبع ہوگئی ہیں۔ ایک غزل وہ ہے جو محمد تقی ولد ابو المعالی کے مملوکہ اور مکتوبہ دیوان ولی سے نقل کی گئی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :- ے

باغ ہے سیر ہے نظارا ہے　　　　سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے

کان میں یار کے دُر بالی　　　　مہر ہے ماہ ہے ستارا ہے

نگہ شوخ، قاتل خونخوار　　　　سیف ہے بانک ہے دو دھارا ہے

آتو آغوش میں حجاب نہ کر　　　　گوشہ ہے رات ہے اندھارا ہے

ملک دل کے خراب کرنے کوں　　　　شاہ ہے فوج ہے نقارا ہے

مجکوں ہر دم فراق میں گذری　　　　آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے

مضمون کی شوخی اور بیان کی صفائی اس غزل کے جوہر ہیں۔

فراقی کے منتشر کلام کو جو اب تک دستیاب ہو سکا۔ یکجا کرنے کے خیال سے ایک اور غزل درج ذیل کیجاتی ہے۔ اس سے شاعر کے کلام، انداز بیان، اور رجحانات کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے ے

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا!　　　　محمدؐ کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا!

عبث خوباں کی گلیوں میں عمر توں صرف کرتا دل　　　　مدینے کی زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا!

سلہ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ بحوالۂ دیوان دکنی ع ۱۰۱۵ آکسفورڈ لائبریری۔

اَرے مجنوں ہوا بدنام توں لیلیٰ کو دل دیکر ۔۔۔ اگر میرے نبیؐ کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا!
ازل کی دین ہیں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں ۔۔۔ نبیؐ کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا!
منجہ اس مکتب مجازی ہیں جو عشق استاد نہ ہوتا ۔۔۔ تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نا ہوتا
نظر ہے علم منطق ہور معانی ہیں فراقیؔ کوں ۔۔۔ اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا![۵]

بیچارہ گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ ہاشمی صاحب کے بیان کے بموجب دہلی بھی گئے تھے۔ ان کا ایک شعر میرؔ اور میر حسنؔ کے تذکروں میں مندرج ہے[۵]

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا کا یوں اتھا ۔۔۔ جز صبر اب چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا[۵۲]

اشرف سید اشرف نام اور اشرفؔ تخلص سنت الجماعت اور اہل بیت کرام سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ یہ عالمگیر کے زمانہ کے شاعر تھے۔ اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ مقبول شاعر اور اُستاد فن تھے۔ ولیؔ کے ہمعصر شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اس زمانہ میں ولیؔ دہلی میں موجود تھے جہاں انھوں نے اشرفؔ کے مصرعہ پر آزادؔ اور فراقیؔ کی طرح گرہ لگائی ہے[۵]

اشرفؔ کا یو مصرع ولیؔ مجکوں ہے دلچسپ ۔۔۔ ”الفت ہے دل و جاں کوں میرے سیم نگر سوں“

اس کی تصدیق کہ اشرفؔ دہلی گئے تھے ان ہی کے بیان سے ہوتی ہے جس کی طرف ”جنگ نامہ حیدر“ میں اشارہ کیا ہے مضمون کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا، اگر ہاشمی صاحب ان اشعار کو بجنسہ نقل کر لیتے جن کے مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے:۔

ڈاکٹر زور صاحب کا بیان ہے کہ اس نے اپنی مثنوی میں ہمعصر بادشاہوں، بہادر شاہ، جہاندار شاہ اور فرخ سیر کا ذکر کیا ہے۔

جنگ نامہ حیدر ۱۱۲۵ھ کی تصنیف ہے۔

کیا شعر غریب کری طور میں ؛ سو فرخ سیر کے کیا دور میں[۵]

”جنگ نامہ حیدر“ آٹھ سو تریسٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ کوئی فارسی جنگ نامہ کا منظوم دکھنی ترجمہ ہے۔ نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

مدینے تے مغرب طرف یک شہر ۔۔۔ کیتے دور ہی بہوت اس کا سفر
برس ایک پر چھ مہینے کی راہ ۔۔۔ اتھا روم کے ملک میں بادشاہ
بڑے شہر کتے کہستان میں ۔۔۔ نہ ایسا کتیں ملک اسمان میں
عجب نام اس کا حصار کتے ۔۔۔ او کافر ملک ہر نگار اس کتے
لکھے نام اس بادشاہ کا فضل ۔۔۔ اتھی ایک دختر اُسے خوش شکل

---

۵۱ بحوالہ دکن میں اردو ۔ ۵۲ نکات الشعراء

انھا نام اس کا سجل دختری — او شیر خدا کی انھی استری
عجب خوبصورت تھی وہ خوش نگار — جو قربان تھے اس پو پریاں ہزار[50]

اڈنبرا کی بیاض میں اشرف کے تیرہ مرثیے شامل ہیں جن میں (۱۴۰) اشعار ہیں۔ اشرف کے مرثیوں کا اسلوب بیان نہایت اثر آفریں اور درد انگیز ہے چنانچہ

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں — سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کو بناتی گل بدن — وہ پھول کھاں بر میں اب میں تباؤں کس کے تئیں
سوتا تھا وہ جب نیند بھر پینے دودھ کوں — بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکراتا وہ بچا میں شادی ہوتی دل منے — بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو غمگیں دیکھتی لیجا کے دیتی گود میں — سو یا کفن وہ اوڑھ کر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں
جاتے تھے شہ جب رن منے اصغر کو میں چھاتی لگا — دکھ میں بہولاتی اس کہلا اب میں کھلاؤں کس کے تئیں[50]

اصغر معصوم کی شہادت جس پر آنسو بہائے گئے ہیں وہ ایک نہ بھولنے والی واردات ہے!
اشرف نے مخزینہ کے صرف ایک پہلو "اصغر کی زندگی" پر آنسو بہا کر اور دوسرے پہلو "ظالموں کی شقاوت" کو پس پردہ رکھکر اثر و کیف کا ایک درد انگیز عالم بپا کر دیا" اور خصوصاً حضرت علیؑ پر جو مرثیہ لکھا گیا نہایت ہی لاجواب ہے"[51] ہمیں گو اس کا علم نہیں لیکن اشرف کے ہم آہنگ ہو کر ماننا پڑتا ہے

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا — ہوا مشتاق ہر یک شاعر ملک دکھن میرا

اور یہ قبولیت در اصل نتیجہ ہے اس کی اہل بیت کرامؓ سے بے انتہا وفاداری کا۔!

ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل — محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا

قدیم تذکروں میں اشرف نامی شاعر کے یہ دو شعر ملتے ہیں ممکن ہے کہ یہ اشرف دکھنی ہی ہو!

پیا بن میرے تئیں بیراگ بھایا ہی جو ہونی ہو سو ہو جاوے[52] — بھبوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہی جو ہونی ہو سو ہو جاوے

توں شاہ ہے سب شہوں کا بندے ہیں تیرے سب شاہ — میں بھی اس کو بندہ تیرا نہ کہوں تو کیا کہوں؟

کچھ دن ہوئے کہ رسالہ اردو میں شیخ چاند صاحب مرحوم نے اشرف پر ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں اشرف کی سات غزلیں

۵۲ اردو شہ پارے۔

جو انجمن ترقی اردو کے نسخے سے لی گئی ہیں درج ہوئی ہیں۔

شیخ چاند صاحب مرحوم نے ان کے کلام پر جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ "اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا۔ کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے۔ اپنے زمانہ میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔"

خواجہ خان حمید نے لکھا ہے "طبع رنگینے داشت۔ شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و دیوان لطیف تصنیف نمودہ"[1]

ذیل میں دو غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ۵

جب سجن مکھ اُپر نقاب کیا — چشم عاشق کوں جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب — نقل خاطر جگر کباب کیا
تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں — جوش دریائے خون آب کیا

اے ہوش رُبا سندر مجھ پاس ٹک آتے جا — رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا
یوں دل منے ہے خواہش تجھ گھر کی طرف آؤں — ٹک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا
لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھ کوں — دو نیم کے انچھر سوں ان پاس چھڑاتے جا
اے کان ادا سندر! اشرف ہے ترا طالب — ٹک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

طالب

مرزا ابو طالب کا تخلص طالب تھا۔ میر حسن کا بیان ہے کہ وہ گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ لیکن قایم جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھا کہتا ہے کہ قصبہ بلنڈہ (؟) نواح اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ اول نے اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کی جو دکن کا صوبہ دار تھا سرکوبی کیلئے حیدرآباد پر چڑھائی کی۔ اور ۱۱۲۱ھ میں کامیاب مراجعت عمل میں آئی۔ مرزا رفیع سودا کے چچا سے جو اس لشکر کے ایک سپاہی تھے۔ طالب کی دوستی ہوگئی وہ ان کے ساتھ ستر سال کی عمر میں اپنی جاگیر کے معاملہ کو طے کرنے کے لئے دہلی گئے جبتک رہنا ہوا ان ہی کے مکان پر فروکش رہے۔

سخن گو سے زیادہ "سخن شناس" ہونیکی بنا پر ان کے تذکرے کو اس صحبت میں نہیں بھلایا جاسکتا۔ دکھنی شعراء کے جو نام شمالی ہند کے تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں کے شعر دوستی کا نتیجہ ہیں۔ عزلت کی بیاض سے میر اور گردیزی نے استفادہ کیا تو قایم نے بیاض طالب سے!

---

[1] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد صاحب ایم۔ اے۔ عثمانیہ۔

قایم نے محقق کے تذکرے میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ "ایں یک شعر بنام او بر پشت بیاض کہنہ کہ ملکیت ابو طالب مرحوم بود در ذیل شاعراں دکھنی نوشتہ دیدہ" لیکن اکثر دکھنی شعراء کے تذکرے کو مرزا رفیع کے توسط سے طالب کی زبانی خاص اہتمام سے درج کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ "بعضے ازیں احوال اشعار کہ سابق مرقوم شدہ زبانی مرزا ابو طالب مسطور بہ مرزا صاحب رسیدہ بود و ازیشاں علی سبیل ذکر مذکور بہ فقیر معلوم گردید"

ان کا وہی ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس کو قائم نے مخزن نکات میں درج کیا ہے۔ جدید تحقیقات اس بارے میں بھی خاموش ہیں۔

ہمنا کے خون چشم سے آلودہ کب کرے　　　وہ پک[۱] جسے گرانی ہے رنگِ حنا ستی

دورِ دوم
۱۳۰ا م تا ۱۷۵ا م

دکھنی شعراء کے سفر شمالی ہند کا دوسرا دور ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۷۵ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اور یہ دور فطری طور پر دو ذیلی زمانوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس دور کا تقریباً نصف اول ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۵۱ھ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے اور نصف آخر نادر گردی کے بعد سے ۱۱۷۵ھ تک کے زمانہ پر۔ محمد شاہ رنگیلے کی بزم عیش میں اربابِ نشاط پرے جمائے رہتے تھے۔ ایسے ایسے مطربانِ خوش نوا کہ نادر شاہ جیسے اجڈ جرنیل نے نور بائی کو ہم جلیس بنانے کی تمنا ظاہر کی۔ بسنت کی رنگ رلیاں، عرس خلد منزل کی بزم رزدانہ، کسل پورہ اور ناگل کے میلہ کی رنگینیاں جذبات میں ہیجان بپا کرتی اور شعر و سخن کا شوق پیدا کرتی تھیں۔ الغرض شاہ جہاں آباد کے چپہ چپہ سے شرابِ شعر کی مستی ٹپکتی تھی۔ اگر ولی کی زندگی وفا کرتی اور اسے محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ نصیب ہوتا تو وہ باوجود کمال استغنا کے

نہیں منصب و جاگیر نہیں روز وظیفہ　　　کہتا ہوں حرفِ راست اگرچہ ادب نہیں

دہلی جاتا اور محمد شاہ کا ملک الشعراء بنتا اور شاہجہاں آباد کی رنگین محفلوں کے لطف کو دوبالا کرتا۔

سراج ولی کے سچے جانشین کی حیثیت سے دکھنی شاعروں کی دہلی میں نمائندگی کر سکتے تھے لیکن وہ گوشۂ بیخودی میں چور تھے اور وہ حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ کا آستانہ چھوڑ کر کہیں جانے والے بھی نہ تھے۔

اس سازگار ماحول میں ممکن ہے بعض دکھنی شعراء دہلی میں موجود ہوں لیکن ان کا وجود مبہم ہے۔ کلام ولی کے آگے جھلملاتے تاروں سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ ولی کا مرتبہ کلام ۱۱۲۹ھ میں دہلی پہنچا۔ جہاں اسے قدردانی کے ہاتھوں لے لیا اور سر آنکھوں پر رکھا دیوان ولی کی چند ہی سال کے عرصہ میں کئی نقلیں کی گئیں جس کی وجہ سے شمال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دکھنی شاعری کا آوازہ گونجنے لگا۔ حاتم، آبرو، احسن، یکرنگ اور ناجی جیسے پرگو شاعروں نے استاذ الاساتذہ ولی کا تتبع کیا۔ حاتم نے

---

[۱] پک (ن مخزن نکات)

اسی عرصہ میں ۱۱۲۹ھ سے ۱۱۶۹ھ تک ایک ضخیم دیوان مرتب کیا جو ولی کے کلام کے باقاعدہ تتبع کا نتیجہ تھا۔ وہ خود "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں ولی کی استادی کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ "حاتم در ریختہ ولی را استادی داند" اس میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ کہنا پڑا "زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد"[1] حاتم، آبرو، مضمون اور ولی کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان دہلوی شاعروں نے اپنے استاد کے طرز کی کہاں تک تقلید کی۔ حاتم نے اپنے اس مختصر سے انتخاب "دیوان زادہ" میں تیرہ غزلوں پر صراحت کردی ہے کہ یہ ولی کی طرز اور تقلید میں لکھی گئی ہیں[2]۔ غرضکہ ولی کا کلام درجہ استناد حاصل کرچکا تھا۔ اس طرز کے مخالفین کو آبرو نے کہا تھا کہ "جو جو حرف میر از رف ہے"۔ ورنہ اُس کے ریختہ میں حرف ہے جو اس سے روگرداں ہوگا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں ولی کے کلام نے قبولیت پائی!

اس دور کا نصف آخر نادرگردی کے بعد ۱۱۵۱ھ سے شروع ہوتا اور کم و بیش ۱۱۷۵ھ پر ختم ہوتا ہے۔ نادر شاہ نے شاہ جہاں آباد کو قزلباشوں سے لٹوا کر اور نہتے بے بس شہریوں کو قتل و غارت کر کے سلطنت کی تباہی کا سامان بہم پہنچایا۔ اس رستخیز نے اہل دہلی پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ پنپ نہ سکے۔ اردو شاعری میں اس کے اثرات نمایاں ہیں اور خصوصاً میر کی قنوطیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

دو دکھنی نوجوان شاعروں نے نادرگردی کو بچشم خود دیکھا۔ درد مند اور درگاہ۔ دونوں کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ درد مند کو دہلی میں بستے ہوئے پندرہ برس ہوچکے تھے اسوقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور مظہر جان جاناں انھیں چاہتے تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں حضرت آصف جاہ بہادر کے ہمراہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے۔ جہاں چار سال تک رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں وہ شاہ جہاں آباد کی رنگین بزموں اور بے تکلف صحبتوں میں شریک رہے اور مشاعروں اور مسالموں میں داد سخن دی۔ ان اثرات و کیفیات کی ایک یادداشت خانِ دوراں درگاہ نے مرتب کی جو حال ہی میں "مرقع دہلی" کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوچکا تھا۔

مرثیہ گوئی دہلی میں عروج پر تھی۔ یہ ترقی و گیرائی دراصل دکھنی مرثیوں کا نتیجہ تھی۔ جیسے عالمگیر کے بعد دہلی میں شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شاہ قلی خاں شاہی کے مرثیوں کو شمال میں ۱۱۲۰ھ کے بعد سے فروغ نصیب ہوا۔ یہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ قادر، روحی، اور مرزا کے مرثیوں سے بھی دہلی والے ناآشنا نہ رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ نکات الشعراء سے اس صنف کلام پر روشنی نہیں پڑتی۔ گردیزی نے ایک دو مرثیہ گویوں اور قایم (۱۱۶۸ھ) نے پانچ چھ مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اس سے مرثیوں کی قبولیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرہ بحوالہ شعر الہند [2] تاریخ لسانیات

دکھنی مرثیوں کی اس قبولیت نے دہلی والوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ ندیم، حزیں، مسکین، غمگین اور عاشق نے اس طرف توجہ کی چنانچہ "مسکین، حزین، و غمگین ہر سہ برادر اند و وے بزبان ریختہ مرثیہ گفتن چہارتے تمام دارند، در ہمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد و در واقع ہر سہ کس بسیار خوب مرثیہ میگویند و الفاظ الم آور بمضامین حسرت انگیں ایجاد می کنند"[۵۱] اس میں ان لوگوں نے اس قدر کمال حاصل کیا تھا کہ درگاہ نے ندیم کے ذکر میں صراحت کی ہے کہ "مضامینے در ریختہ می آرد کہ فارسیان مضمار فارسی زبین گیر می شوند"[۵۲] اور طرفہ یہ کہ حزین و ندیم کے مرثیوں کو پڑھنے کے لئے میر عبداللہ جیسا مرثیہ خوان نصیب ہوا کہ "استادان موسیقی متفق اللفظ اند کہ بایں خوبی مرثیہ خوانی بعالم ایجاد نگذاشتہ و بایں مواد تشدید و بایں سامان آہنگ سرے از کارخانہ تکوین بیروں نکشید"[۵۳] دکھنی مرثیہ گوئی کا زبان و بیان سے سودا کے زمانہ تک تتبع کیا گیا۔ چنانچہ سودا کے مراثی کی زبان "دکھنی آمیز" رہی۔

نادر گردی کے بعد سے اردو شاعری کو بیجا فروغ ہوا۔ فارسی گو شاعروں نے اس طرف خاص توجہ کی۔ بقول صاحب نکات الشعراء سراج الدین علیخاں آرزو نے "برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ"[۵۴] اور شاہ ولی اللہ اشتیاق "گاہے فکر ریختہ میکرد"[۵۵]۔ قزلباش خان امید نے اس پر فخر کیا کہ "من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام"[۵۶] اور مرزا گرامی جو "باوصف مولویت" فارسی شعر کہتے اور اپنے اس کمال کو ہر مشاعرہ میں جتلاتے پھرتے وہ بھی "چوں دید کہ ہنگامۂ ریختہ گرم شدہ خودش نیز شعر ریختہ گفت"[۵۷]۔

الغرض اس زمانہ میں دہلی میں شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ، امیر سے لیکر غریب، اور بادشاہ سے لیکر ایک پیشہ ور۔ حجام کو بھی دعوے سخن دانی تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسکی سرپرستی کو فخر جانا اور فرنگیوں نے بھی اسے منہ لگایا!

اس زمانہ میں دہلی میں میر، سودا، قایم، درد، اثر، تاباں، سجاد، بقا، سوز، یقین، داد سخنوری دیدہے تھے۔ عزلت بھی (سنہ ۱۱۶۴ھ) اس بزم میں شریک ہوگئے یہ دور اخذ و ترک کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میر صاحب کو عزلت کے کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ عزلت کا تعلق گجرات سے تھا لیکن انھیں دکھنی شعراء کی نمایندگی کا فخر حاصل تھا۔ میر صاحب نے بھی انھیں دکھنی شعرا کی ذیل میں شمار کیا ہے۔ جب گجرات فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو گجرات کے ارباب علم اور شعراء گولکنڈہ اور بیجاپور کی طرف متوجہ ہوے جسکی وجہ سے گوجری اور دکنی کو ملاپ کا موقع ملا۔ دکنی کی وجہ سے دکنی کو گجرات میں جو فروغ نصیب ہوا وہ کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ "پنجاب میں اردو" کے قابل مؤلف کا بیان ہے کہ "محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر سنہ ۱۱۰۹ھ میں نظم کی ہے۔ باوجودیکہ وہ صاف دکنی اردو میں لکھ رہا ہے مگر وہ اس کو گوجری کے نام سے یاد کرتا ہے ع لکھی گوجری میں نے یوسف زلیخا" اس لحاظ سے دکنی اور گوجری سنہ ۱۱۰۹ھ کے بعد سے دو جداگانہ زبانیں نہیں رہی تھیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب بیان بھی اس بات کا شاہد ہے! اور پھر عزلت کی زندگی کا آخری زمانہ دکن میں گذرا

---

۵۱ تا ۵۳ مرقع دہلی ۵۴ تا ۵۷ مخزن نکات

میں گذرا اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی اور ان کی شاعری کی قدر و منزلت دکن ہی میں ہوئی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں دکنی شعرا کے نمایندوں میں شمار نہ کریں؟

نادر گردی کے بعد دہلی کی مرکزیت رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا اور ایک دربار کی بجائے کئی دربار قائم ہوگئے اور کئی سرپرستوں نے بے سہارا شاعروں کو دامانِ عاطفت میں لیا۔ فرخ آباد، رامپور، لکھنؤ، مرشدآباد، عظیم آباد شاعری کے مرکز قرار پائے۔ "دریں ایام کہ رشتہ سلاکِ انتظام مردم بادشاہی بصدمۂ انقلاب سلطنت از ہم گسیخت و ہر یکے چوں لآلی آبدار برخاک مذلت افتادہ رُو بہر سو نہادند[1]" فغان (۱۱۶۴ھ سے پہلے) نے "بپاس آبروئے خویش" اور غریب (۱۱۶۴ھ سے پہلے) نے "بہ سبب پریشانی روزگار" بنگال کی راہ لی۔ دکنی شعرا، عزلت اور درد مند بھی عظیم آباد اور مرشدآباد چلے گئے۔ عبدالوہاب بیکل نے بھی خجستہ بنیاد سے مرشدآباد کی راہ لی۔ چندے قیام کیا۔ پھر عزلت اور وہ دکن آگئے۔ درد مند نے وہیں گذران کی اور وہیں انتقال کیا۔ ؎

ہزار حیف کہ دہلی سا شہر ویراں کر   کیا ہے یاروں نے آباد مُلک پورب کو   (ہدایت)

اکثر شاعروں نے دکھن کا رُخ کیا جہاں پہلے سے شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ قطب شاہیوں کی تباہی کے بعد حیدرآباد میں شعر و سخن کی رفتار کو دھیمی ہوگئی لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا اور چند سال تک اورنگ آباد اور برہانپور شاعری کے مرکز بنے رہے اور عاجز جب دہلی سے نکلے تو برہانپور ہی میں ٹھہرے۔ سلطنت آصفیہ کے قیام (۱۱۳۶ھ) کے بعد سے حیدرآباد میں شعر و سخن کی پھر وہی گرم بازاری شروع ہوگئی اور فرخندہ بنیاد شمالی شعراء کا ماویٰ و ملجا قرار پایا۔

درد مند محمد فقیہ متخلص بہ درد مند۔ اودگیر ضلع بیدر کے نجباء سے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۳۶ھ میں اودگیر میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں (۱۱۴۱ھ) اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی ان پر بہت نظرِ عنایت رکھتے تھے۔ بعد میں وہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے ظلِ عاطفت میں چلے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کی صحبت کے اثرات درد مند پر مترتب ہوئے۔ شاہ اشتیاق کے فیضِ صحبت سے درد مند فارسی میں شعر کہنے لگے اور مظہر جان جاناں کی تحریک سے ریختہ گوئی شروع کی۔ چنانچہ درد مند نے "ساقی نامہ" میں مظہر کی محبت اور مہربانی کو اصل وجہ تحریک گردانا ہے ؎

کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال   ہوا واجب ایک امر امتثال
محبت نے مجکوں کیا لاجواب   وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

اگر آزاد بلگرامی کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ وہ ۱۱۶۶ھ میں بنگال گئے تو اس حساب سے ان کا قیام دہلی میں بیس سال تک رہا۔

---

[1] مخزن نکات۔

جبتک یہ مرزا مظہر کے حلقۂ ارادت سے قدم باہر نہ نکالا۔ مرزا بھی انھیں بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور شعر دردمند کے بارے میں آزاد نے سروِ آزاد میں لکھا ہے ؎

مظہر مباش غافل از احوالِ دردمند   لعلے ست ایں کہ درکرۂ روزگار نیست

دہلی کے درباروں میں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اکثر امیروں مثلاً نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام اور نواب محمد علیخاں (جن کی اپنی مثنوی میں تعریف و توصیف کی ہے) سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نادر گردی (۱۱۵۱ھ) کے بعد ۱۱۶۶ھ میں بنگال گئے اور "چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذران معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلی گئے اور چند مدت وہاں رہے پھر نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بلانے ہوئے شاہ جہاں آباد سے مرشد آباد میں آئے اور طور بود و باش کا وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک فاہ حال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ میں بلدہ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔[51]

دردمند خوش اختلاط، یار باش انسان تھے۔ علی ابراہیم خاں اور امیر حسین خان سے دوستانہ روابط تھے۔ آزاد بلگرامی سے غائبانہ اخلاص تھا۔ چنانچہ "فی مابین فقیر و مشار الیہ غائبانہ اخلاص و ائی است و ہمیشہ طریق مراسلت مسلوک"۔ ان کے کلام کے متعلق آزاد بلگرامی کی رائے ہے کہ "شعر فارسی و ریختہ ہر دو خوب میگوید" اس زمانہ کے اساتذہ نے ان کے فارسی کلام پر بہت عمدہ رائیں دی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فارسی کلام مقبول اور مشہور تھا"[52]

دردمند ریختہ کی طرف کم مائل تھے۔ قدیم تذکروں میں چند متفرق اشعار اور ایک دو رباعیاں ملتی ہیں ؎

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد   اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر   سنگ آیا ولیکن سخت آیا فرہاد

قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دور آشیانے سے   عجب ساعت میں بچھڑے تھے ہم انکے آستانے سے

الٰہی مت کسی کو پیش رنج و انتظار آوے   ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جبتک بہار آوے

دردمند کا "ساقی نامہ" اردو زبان کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے اس لحاظ سے کہ یہ پہلا ساقی نامہ ہے اور اس نے

---

۵۱ گلشن ہند   ۵۲ شیخ چاند مرحوم ام اے ال ال بی عثمانیہ

بحث اور تنقید کے لئے ایک میدان فراہم کر دیا۔ چنانچہ عزلت نے ۱۱۷۴ھ میں "بیان ظہور" کے نام سے ایک ساقی نامہ قیام دکن کے زمانہ میں درد مند کے جواب میں نظم کیا۔ فتوت نے اس سلسلے میں ایک مثنوی لکھی ہے[۱]۔ "ساقی نامہ" کی شہرت کا اندازہ عزلت اور فتوت کے تتبع کے علاوہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ تمام تذکرے متفق اللفظ ہو کر اس کی داد دیتے ہیں۔ آزاد بلگرامی :۔ "ساقی نامہ ریختہ او مشہور است کہ مقبول طبائع گردیدہ"۔ شفیق :۔ "ساقی نامہ ریختہ او شہرت آفاق" قاسم :۔ "ایں ساقی نامہ خیلے مشہور و برزبان خلق جاری است"۔ ساقی نامہ کے ابیات تقریباً ایک سو نوے ہیں۔

اسیر قفس کے خیالات نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں ؎

کہ ایام اسیری کے کیا خوب تھے
خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے

پھنسے تھے سبھی ہم نفس ایک بار
ہمیں داغ لگتا تھا باغ و بہار

عجب تھا مزا درد و اندوہ کا
عجب جشن تھا مرگِ انبوہ کا

توجہ تھی ہم ساتھ صیاد کو
پہونچتا تھا ہر وقت فریاد کو

موافق تھی دام و قفس کی ہوا
سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا

نہ تھے آشنا داد و بیداد کے
کہ تھے سب اسیر ایک صیاد کے

پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق
کہ جاتے رہے سب وہ اہل وفاق

چمن کی ہوا مجھ پہ اب تنگ ہے
مری زندگی موت کا رنگ ہے

نہ لگتا ہے جی صحبتِ غیر میں
نہ کھلتا ہے دل باغ کی سیر میں

نہ کچھ ذوق ہے آب و دانہ ستی
بھڑکتا ہے جی آشیانہ ستی

مجھے گل کی صورت لگے ہے زبوں
چمن ہے نظر میں مری حوضِ خوں

اکیلے کو کب خوب لگتا ہے باغ
بلا ہے رفیقوں کی دوری کا داغ[۲]

سیر شب ماہتاب اور اس کے اثرات ملاحظہ ہوں :۔ ؎

پڑا آج ہے رات یوں اتفاق
کہ سب ہو گئے جمع اہلِ وفاق

کہ شبخون کر لشکرِ خواب پر
سبھی جا کے بیٹھے لب آب پر

مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ
جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھ

---

۱ تفصیل کیلئے دیکھو رسالۂ اردو جولائی سنہ ۱۹۳۴ء ۲ "ساقی نامہ" رسالۂ اردو جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہو گیا ہے یہ اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔

عداوت کی کب چاند سے تھی امید   ولیکن ہوا مجکو معلوم یہ بھید
کہ واقع ہوئے ہم سے از بس گناہ   کئے نامے کی طرح چہرے سیاہ
ہوئے سب طرح مستحق عتاب   تو لازم ہوا اب نزول عذاب
ولیکن خدا بھیجتا تھا سدا   مناسب ہر اک قوم کے اک بلا
نبی کی ہوئی بسکہ حرمت ضرور   اس امت پہ آیا ہے طوفان نور

چند متفرق اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں بس

تمنا ہے یہ اس کف خاک کوں   کہ چھوڑے نہ اس دامن پاک کوں

ستم سے گذر کچھ تو انصاف کر   خدا سیتی ڈر کچھ تو انصاف کر

مت اس طرح پیارے کسو کو بسر   مبادا کوئی ناتواں جائے مر

جو کھینچا کبھو مہر سے تو نے ہات   ستمگر کو محشر میں نھیں ہے نجات

جو کوئی شخص پانی سوں بیزار ہے   یقیں ہے کہ آب اوس کوں درکار ہے

نہ کچھ ذوق ہے آب و دانہ ستی   بھڑکتا ہے جی آشیانہ ستی

درگاہ | نام درگاہ قلی خاں، درگاہ تخلص، موتمن الدولہ سالار جنگ خطاب۔ ۲۹ رجب ۱۱۲۲ ہجری کو پیدا ہوئے۔ گو اپنے والد، خاندان قلی خاں کے زیر پرورش رہے مگر ان کی حقیقی تعلیم و تربیت مغفرت مآب آصفجاہ اولی کے زیر اثر ہوئی۔ چار سال کی عمر میں جاگیر اور منصب سے سرفراز کئے گئے اور سن رشد سے آصف جاہ بہادر کے ساتھ رہنے لگے۔ ۱۱۵۱ھ میں انھی کے ہمراہ دہلی گئے۔ یہ زمانہ دہلی پر تباہی کا تھا۔ نادر گردی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ نواب آصفجاہ بہادر نے نادر شاہ سے مصالحت کرانے اور اہل دہلی کو قتل و غارت سے بچانے کیلئے جس تدبر کا

ثبوت دیا وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ درگاہ چار سال تک دہلی میں رہے اور یہ زمانہ ان کے ریعانِ شباب کا تھا۔ شاہجہان آباد کی رنگینیوں میں شریک رہے لیکن کتراتے اور دامن بچاتے ہوئے دہلی کے ان تاثرات کو ایک یادداشت کے طور پر مرتب کیا تھا جس کو حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مظہر جانِ جاناں، حزیں، آرزو، راقم اور مفتوں کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ مظہر کبھی کبھی ان کے ہاں بھی آیا کرتے تھے۔

سنہ ۱۱۵۵ھ میں نواب آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دکن کو مراجعت کی، عرصہ تک اورنگ آباد کے صوبہ دار رہے۔ جہاں "باغ دلکشا" میں علمی محفل منعقد کرتے شعراء اور علماء مدعو کئے جاتے۔ آزاد بلگرامی اور شفیق اس صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ "نواب ذوالقدر علاوہ غزل پڑھنے کے اکثر نہایت برجستہ فی البدیہہ شعر بھی کہتے تھے۔"

ایک قصیدے کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند
کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آکے سرہانے یہ پیر نورانی
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے
ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر

شہ سریر کرامت، امیر کل امیر
ولی حضرت مولیٰ، وصی پیغمبر

امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک
کہا ہے لحمک لحمی جسے شہ سرور

میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے۔ نے درگاہ کے مرثیوں پر "مرقع سخن" میں اپنے ایک مضمون کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالی اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "عربی، فارسی یا دکھنی جس کسی زبان میں وہ لکھتے ہیں قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ ڈالئے کہیں تعقید یا ٹھونس ٹھانس نہ ملے گی اس سے انکی غیر معمولی قدرت بیان کا اظہار ہوتا ہے۔ اشعار خود زبان حال سے کہتے ہیں کہ ان کا لکھنے والا ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔ شستہ الفاظ اور برجستہ ترکیبیں انھوں نے ایسی استعمال کی ہیں جن میں پڑھتے وقت ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔" بعض مرثیوں میں عربی، فارسی اور ہندی کے برجستہ الفاظ اور اشعار کا ایسا استعمال کیا ہے جس سے ان کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام

ہے آج کربلا کا بیاباں لہو لہو
صحرائے دلفگار کا داماں لہو لہو

سب دشت و کوہ و جنگل و میداں لہو لہو
وہ رزمگاہ شاہ شہیداں لہو لہو

خلق میں پھر ہے جو شور ماتم
سوگ میں پھر جو ہوا ہے عالم

مشتعل آتش غم شعلۂ ہم — کیا مگر ماہِ محرم ہے علم
ماہِ غم آمد بر خواست فغاں — دیدۂ دل شدہ گریاں بریاں
ان فی الخلق بکاءٌ و حزن — لعلیٍ و حسینٍ و حسنٍ

درگاہ اقدس کا طواف ہے منتہائے دعا — عاصی کوں خاک کر بلا ہر دم اشد التجا
اے صاحب حاجت روا جلدی سیں نوکر کوں بلا — اس تفرقے کوں دور کر صاحب کدھر نوکر کجا
سر کسائیں کے ہِل ادہک تپشیا جان — شاہ تمھارے اوس کوں یہی ہے ارمان
کمینہ بندۂ درگاہ سید الشہداءؑ — برائے خدمت جاروب روز و شب بدعا

درگاہ قلی نے سنہ ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن کئے گئے۔

عزلت سید عبد الولی نام اور عزلت تخلص تھا۔ سنہ ۱۱۰۴ھ میں بمقام سلون ضلع سورت تولد ہوئے۔ آپ کے والد شاہ سعد اللہ سورتی مشہور روزگار عالم بزرگ تھے۔ کتب فارسی کی تحصیل والد ہی سے کی۔ طبیعت نہایت بے تکلف پائی تھی۔ ہر قماش کے لوگوں سے ملاقات تھی۔ صوفی مشرب تھے۔ ڈاڑھی مونچھ منڈواتے تھے جسکی وجہ سے صاحب تحفۃ الشعراء نے انھیں "ملامتیہ مشرب" کا پیرو گردانا اور صاحب گلزار ابراہیم نے "خالی از سبکی نبود" لکھدیا۔ مگر تمام تذکرے متفق ہیں کہ "ظاہر و باطن مجلیٰ است"۔ فارسی اور عربی زبانیں نہایت اچھی طرح جانتے تھے، قرآن کے حافظ اور قاری بھی تھے، فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دہلی جانے سے پہلے فارسی میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں ان اشعار کو درج کیا ہے جو عزلت ہی کے انتخاب کئے ہوئے تھے۔ شفیق ان کا فارسی کلام چار ہزار ابیات کا بتلاتے ہیں۔ آزاد سے پہلی مرتبہ اسوقت ملاقات ہوئی جبکہ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہونیکے بعد بندر سورت پر اترے، شفیق اور گردیزی ان کا احترام کرتے تھے۔ درد و مند، مظہر اور یقین سے ملاقات تھی۔ میر تو ان کے گہرے دوست تھے۔ دوستی بے تکلفی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں "با فقیر بجوششہا میکنند"۔ میر کو عزلت کا اسقدر پاس تھا کہ میر نے نواب خواجہ علیخاں کا شعر ایک مصرعہ اس لئے درج کیا ہے کہ "از معتقدان سید صاحب است"۔

سید صاحب کہنے کو تو عزلت مشہور تھے لیکن انھیں جہاں گرد کہنا چاہیئے۔ سورت سے اورنگ آباد گئے اور پھر وہاں سے ۲۰ رجمادی الاول ۱۱۶۴ھ کو دہلی پہنچے۔ دہلی میں دو سال مقیم رہ کر (۱۱۶۶ھ کے قریبی زمانہ میں) مرشد آباد چلے گئے اور وہاں چندے مقیم رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلّی کے خرمن پر تباہی و بربادی کی بجلیاں گر رہی تھیں۔ مرشد آباد میں ان کی

کافی آؤ بھگت ہوئی۔ علی وردی خاں مہابت جنگ کے مورد عنایت رہے۔ ان کے انتقال کے بعد اورنگ آباد لوٹ آئے یہاں چندے قیام کیا۔ نواب ناصر جنگ شہید کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بلدۂ فرخندہ بنیاد میں ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے۔ نواب صلابت جنگ بہادر نے بڑی قدر و منزلت کی۔ دو گاؤں مرحمت ہوئے۔

عزلت بڑے شاعر دوست بھی تھے چنانچہ قایم نے اسکی تصریح کی ہے کہ "شاعر دوستی در مزاج اوبمرتبہ بود بلکہ برائے مناسبت ایں طائفہ گاہ گاہ خود ہم دو سہ بیت موزوں میکرد۔" خود اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ منعقد کرتے، شعراء کی ضیافت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے خوش صحبت تھے۔ خود خوش ہوتے اور اوروں کو لطف اندوز کرتے۔ انکی شاعر دوستی، رنگین مزاجی اور رندی ان کے کلام میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ ولی دور اول کے قافلہ سالار ہیں تو عزلت دور دوم کے۔ انھوں نے شاہ جہاں آباد کی شاعرانہ سرزمین پر اپنے کمال کے ناقابل فراموش جوہر دکھائے۔ میر صاحب نے ان کی باکمالی اور وسیع المشربی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "بایں ہمہ کمال اینقدر وسعت مشرب بہم رسانیدہ اند کہ در ہر رنگ چوں آب بے آمیز ندہ" دکھنی شعراء کے جو نام قدیم دہلوی تذکروں میں درج ہیں۔ ان کا اصل ماخذ "بیاض عزلت" ہے اس بیاض سے میر نے دکھنی شعراء کی حد تک فائدہ اٹھایا اور گردیزی نے گو استفادہ کیا لیکن میر کی طرح حوالہ نہیں دیا۔ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ قایم نے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

عزلت کو مصوری، خطاطی اور موسیقی میں بھی دخل تھا مصوری اور خطاطی کے چند نمونے موجود ہیں۔ عزلت کے ہاتھ کی ایک تصویر آغا حیدر حسن صاحب کے کتب خانے سے جشن یوم ولی کے سلسلہ میں دکھنی مخطوطات اور مرقعوں کی نمایش میں منظر عام پر آچکی ہے۔ ان کی موسیقی سے آزاد بلگرامی بھی لطف اندوز ہوئے تھے اور اس میں فن کارانہ دسترس کا ثبوت ان کی مثنوی "راگ مالا" سے ملتا ہے۔ مثنوی "راگ مالا" میں چھ راگ ہیں ہر ایک راگ میں پانچ راگنیاں ہیں اور ہر ایک راگنی میں آٹھ حصے ہیں۔ مرحوم عبد الجبار ملکاپوری عزلت کو "طوطی دکن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ امیر خسرو علیہ الرحمہ کی طرح عزلت نے کہہ مکرنیاں پہیلیاں، دوہے، جھولنے اور کبت بھی کہے اور بارہ ماسی تالیف کی شفیق نے اپنے تذکرہ میں اسکی چند مثالیں دی ہیں۔ عزلت کے کمال کا اصلی جوہر ان کی ریختہ گوئی ہے۔ دہلی جانے سے پہلے نہ صرف شعر کہنے لگے تھے بلکہ ان کے اورنگ آباد اور سورت میں کئی شاگرد ہو گئے تھے۔ مرشد آباد جانے تک اپنے اردو کلام کو مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ صاحب گلزار ابراہیم کا بیان ہے کہ "اشعارش مدون بہ نظر ایں خاکسار در آمد"۔ میر انھیں ریختہ گوئی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "مزاج اوشاں میلان ریختہ بسیار دارد، نسبتے تمام بہ سخن دارند از اسالیب کلام شاں واضح میگردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند۔ دردمند کے مشہور "ساقی نامہ" کے جواب میں ایک ساقی نامہ حیدرآباد میں نظم کیا جس میں تین سو اکتیس ابیات ہیں

اس کا تاریخی نام "بیان ظہور" ہے۔ اس میں "طوفان نور" کو رحمت نہیں رحمت ثابت کیا ہے۔ ساقی نامہ کے چند شعر درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

جو ایمان ہے درد کا وے تو جام
کہ ترسا اسے سے ہے ترسا کا کام

بُھلانا مجھے تجھ کو یاد آئے گا
مرے بعد مَل ہاتھ پچھتائے گا

مرے پر مری خاک دیگی صدا
ارے مئے پلائے پلا، سے پلا

ان کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ کیف رندی و سرمستی کا چشمہ ہے اور لطفِ زبان کا گنجینہ!

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیگا

نخلِ امید بے وفاؤں سے
دل سلامت پھرے تو پھل پایا

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہ آئینہ تھا تجھہ خودبیں کے اترانے کے کام آتا

شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھہ پر
پھوٹے آئینہ میں منہ تیری بلا دیکھے

کب لگ احباب کا غم مجکو دکھاویگا فلک
خاک ہو گئے ہیں بہت اور ہیں چلین ہار کئی

بندے ہیں تیری چھب کے مدسے جمال والے
سب گل سے گال والے سنبل سے بال والے

اس کو پہنچی خبر کہ جیتا ہوں
کسی دشمن ستی سُنا ہوگا

سدھارے گُل کہاں سُونے پڑے ہیں گلستاں اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنا

اڑا تھا جیوں شرر دل اپنے دود آہ میں غفلت
مسافر پر پڑی تھی شام منزل پہ کیا گذری

حقیقت و معرفت کا یہ آفتاب ۱۶ر ماہ رجب ۱۱۸۹ھ کو شعاعِ حیات کی آخری کرن ڈالتا اور زندگی کے پچھّمی کروٹیں لیتا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "دائرۂ میر مومن رح" میں غائب ہو گیا۔

بیکل | عبد الوہاب نام، ریختہ میں بیکل، مرثیہ میں ماتمی اور فارسی میں افتخار تخلص کرتے تھے[۵۱]۔ بیکل بخاری سید ہیں سلسلۂ نسب حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال حسین بخاری رح تک پہنچتا ہے۔ احمد نگر میں پیدا ہوئے[۵۲]۔ سید مرتضیٰ خاں حارس قلعۂ دولت آباد کی دختر سے شادی کے بعد دولت آباد جائے قیام ٹھہرا اور اسی بنا پر دولت آبادی[۵۳] مشہور ہو گئے۔

علوم متداولہ کی تحصیل سن شعور کو پہنچکر کی۔ اسی سلسلہ میں شعر بھی کہتے رہے۔ "جذبہ (شاعری) بکار برد کہ از ہمہ کار ہا بیکار

---

۵۱ چمنستان شعراء ۵۲ دکن میں اردو کے قابل مؤلف نے اورنگ آباد کو جائے پیدائش قرار دیا ہے جو غلط ہے (دیکھو تذکرہ بے نظیر) ۵۳ تذکرۂ ریختہ گویاں و گلزار ابراہیم۔

بلاغت۔" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دیوان ترتیب پاگیا۔ اس کے بعد علم ابدان کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا اسلیئے کہ اس کا جاننا "حفظ صحت و دفع امراض و ازالہ اعراض" کے لحاظ سے مقدم ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ وہ "بے نظیر" کی تالیف میں مشغول تھے تحصیل متعد اوقات فن طب بھی جاری تھی اور امید کرتے ہیں کہ "مشق طبابت ظاہری" میں "تدبیر اصلاح باطنی" اور "توفیق ازالہ امراض روحانی" بھی حاصل ہوجائیگی سنہ ۱۱۸۲ھ میں غیور جنگ کی بارگاہ میں متوسل تھے سنہ ۱۱۹۰ھ کے قریبی زمانہ میں فوت ہوئے اور دولت آباد میں حضرت برہان الدین غریبؒ کے روضہ کے قریب مدفون ہیں[۱]

فارسی کلام آزاد بلگرامی کو دکھلاتے تھے۔ آزاد کی رائے ہے کہ "از خوش فکران ایں عصر ہست" ان ہی کے اشارے سے "تذکرہ بے نظیر" کو مرتب کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے یہ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے زبان شگفتہ ہے لیکن بیان پر از استعارہ ہے۔

بیکل کو ریختہ میں عزلت سے تلمذ حاصل تھا اور یہ تعلق سنہ ۱۱۶۴ھ سے پہلے جبکہ عزلت ابھی دہلی نہیں گئے تھے قائم ہوگیا تھا۔ لچھمی نرائن شفیق ان کے استاد بھائی تھے جن سے حضرت آزاد بلگرامی کے مکان پر ملاقات ہوا کرتی تھی ان کے متعلق شفیق لکھتے ہیں کہ "بیحد صاحب فطانت اور ذہین معلوم ہوتے ہیں۔"

بیکل اس دور کی پیداوار میں جبکہ اورنگ آباد شعر و شاعری کا زبردست مرکز تھا اور شمال و دکن کے شعراء کا جائے اتصال۔ اسی بنا پر شمال کی تحریکوں کو سب سے پہلے یاں قبول کر لیا جاتا تھا۔ بیکل پر بھی یہ رنگ غالب ہے۔ انھوں نے شمال کا سفر بھی کیا تھا۔ نواب سراج الدولہ کے عہد میں بنگالہ گئے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں گئے ہوں جبکہ عزلت دلی سے مرشد آباد آچکے تھے۔ علی ابراہیم خاں کے بیان سے ان کی ملاقات کا پتہ نہیں چلتا چہ جائیکہ اصلاح اشعار کا[۲]۔ ریختہ میں صاحب دیوان ہیں ان کے کلام میں صفائی اور اسلوب میں دلکشی موجود ہے ؎

میرا دل گلرخاں لے سات لے گئے — حنا کا رنگ ہاتھوں ہات لے گئے
تری زلفوں نے کئی کئی پیچ دکھلا — دل بیکل کو راتوں رات لے گئے

عشق میں کیا ثابتی ہے مجھ دل بیتاب کو — برقرار آتش اُپر دیکھا اسی سیماب کو

سرو کو رتبہ ترے آگے نہیں اے سبز پوش — ایک تجھ بازار خوبی کا ہے وہ سبزی فروش

نین سے دل کا رتبہ ہے بڑا تجھ او پرستی میں — کہ دل حافظ ہے اس مصحف کا آنکھیں ناظرہ خواں ہیں

تری آنکھوں کی کیفیت نے کھویا ہوش عالم کا — دوانوں کو کہے کیا کوئی ہشوالے ہیں متوالے

---

[۱] محبوب الزمن [۲] طبقات شعراء ہند۔

تری ابرو کی تیغ ہے بارٔ صیقل ـــــ جس کو لگتی ہے خوب لگتی ہے[۵]
جاتا ہے وہ کہ تھا لطف زندگانی ـــــ آتی ہے اجل ہماری جواب نہیں تو پھر کب
عکس رخسار یار گلرو سے ـــــ آئینہ چشمۂ گلاب ہوا

ان کا ایک مشہور شعر زباں زد خاص و عام ہے ؎

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا ؛ سرخ و سفید ماٹی کی مورت ہوئی تو کیا؛

علاوہ ازیں اپنے استاد کی طرح ریختہ میں دوہے، کبت، جھولنے، کہہ کرنی، اور پہیلیاں بھی کہی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار جواں بخت، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر تھے۔ یہ بیچارے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور لال قلعہ کے حاکم تھے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں پر انگریز قابض ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں کا ادب و احترام ہندستانیوں کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ انگریز لال قلعہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے۔ مسٹر ملکرنے بورڈ میں جو بیان دیا ہے وہ قابل ذکر ہے:۔

"عزیزو! میں پچاس سال سے ہندوستان میں رہتا ہوں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے؟ اسکی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک، ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک، ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ ہزلزلہ آئیگا کہ سارا ہندوستان ہل جائیگا یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔"

دلی کی معاشی اور معاشرتی حالت کی رہی سہی بہار انھیں کے دم سے تھی" اور دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ غدر نے سلطنت مغلیہ کی ٹمٹماتی شمع کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا" اور یہ پانچوں باتیں اب نہیں" دلی میں پنجابی اور دیہاتی آ آ کر بس گئے۔ شرفاء ایک ایک کر کے سب لکھنو اور دکن کی طرف چلے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کی وجہ سے اردو شاعری کو بیحد فروغ ہوا وہ خود اچھے شاعر تھے مگر ان پر اس انقلاب کا بہت برا اثر پڑا۔ دلی میں مشاعروں کی رونق شہزادوں کے دم سے تھی۔ ذوق اور غالب بہادر شاہ ہی کے خیال سے دلی میں پڑے رہے۔ باوجودیکہ ذوق کو بہادر شاہ کی ولیعہدی کے زمانہ میں (لکھنو) اور

---

[۵] تذکرہ ریختہ گویاں۔

(صہ) ماہانہ سے زیادہ نہیں ملے۔ مگر خاقانی ہند کا خطاب پایا۔ اسی زمانہ میں دکن میں شمس الامرأ اور چندو لال کی بارگاہوں سے اکثر باہر سے آنیوالے شاعروں کو (صہ) (صہ) روزینہ مقرر تھا۔ ظفر جب سریر آرائے سلطنت دہلی ہوئے تب کہیں "اُستاد شہ" کو خلوت اور جاگیر عطا ہوئی۔ غالب کو بھی اپنی "چہہ ماہی" کی شکایت رہی۔ شمالی ہند کے باکمال شعراء شاہ نصیر، شاہ حفیظ، مشتاق، لطف، منت، بیان، دکن چلے گئے جہاں نواب ارسطو جاہ اور میر عالم اور پھر مہاراجہ چندو لال اور شمس الامراء بہادر اپنی فیاضیاں دکھا رہے تھے۔ اس عرصہ میں اہل دکن اپنے محاورہ کو ترک کرکے دہلی کی زبان میں شعر کہنے لگے۔

نمائش مخطوطات و تصاویر بتقریب جشن یادگار ولی

یوم ولی کے سلسلے میں اس کی مجلس انتظامی نے جب یہ تصفیہ کیا کہ ولی کے زمانہ اور اس سے قبل کی اُردو کتابوں اور اردو مصنفین و مولفین اور شعراء و قدردانانِ سخن کی تصاویر کی نمائش کیجائے تو خیال تک نہ تھا کہ ایسی کامیاب نمائش منعقد کیجا سکے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب (۴۰۰) کے قریب اُردو کتابوں کے قدیم بیش بہا قلمی نسخے ایک جا جمع کئے گئے تھے۔ انمیں متعدد نسخے ایسے بیش بہا اور نادر تھے کہ ان تک عوام کی دسترس ناممکن تھی اور پہلی دفعہ سیکڑوں اصحاب کو ان کی زیارت کا موقع ملا۔ اُن سب کتابوں کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں موجود ہے اور اہل ذوق اصحاب انکے مطالعہ سے اس نمائش کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس نمائش کی غیر معمولی کامیابی کا سہرا عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کے سر ہے کہ اپنے مشہور روزگار کتبخانہ کے نادر اور گراں بہا مطلّا و مذہب قلمی نسخے بھیجے روانہ کرکے نمائش کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ مولوی آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر مرزا حسین علیخاں صاحب اور دیگر اصحاب نے بھی اپنے خانگی کتبخانو قلمی نسخے اس نمائش کے لیے نہایت فراخ دلی کے ساتھ عطا کیے۔ مولوی قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ نے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے قدیم قلمی نسخے بھی روانہ کیے۔ غرض حیدرآباد میں جہاں جہاں قدیم اُردو کتابیں دستیاب ہوئیں اس موقع پر فراہم کی گئیں اور یہ کام جتنا مشکل تھا اُتنا ہی آسان ہو گیا۔ سٹی کالج کے قابل فخر صدر اور بانیٔ یوم ولی مولوی سید محمد اعظم صاحب اور معتمد یوم ولی مولوی سید محمد صاحب نے ان نسخوں کی فراہمی اور انکی حفاظت اور ذمہ داری لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نمائش کی ترتیب و تنظیم اس قدر خوبی کے ساتھ انجام نہ پا سکتی اگر نواب میر سعادت علی رضوی ایم اے صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش، سراج الدین احمد صاحب، خلیل احمد صاحب، خواجہ حمید الدین صاحب، مولوی غلام رسول صاحب اور مولوی عبد الرحمان شریف صاحب نیز دیگر اساتذہ و طلبہ سٹی کالج دو تین روز تک رات اور دن اس کام میں منہمک نہ رہتے۔

ولی کے قلمی نسخوں اور دیگر قدیم دکنی کتابوں کی جو فہرستیں آئندہ صفحات میں شایع کی جا رہی ہیں ان کی ترتیب میں نواب میر سعادت علی صاحب رضوی اور صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش نے جو مدد دی ہے اس کا شکریہ خاص طور پر ضروری ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
صدر مجلس نمائش یوم ولی

کلیاتِ ولی کے قلمی نسخے

اس وقت تک ولی کے جن قلمی نسخوں کا پتہ چلا ہے اُن کی ایک تفصیلی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ولی کے کلیات کے نسخے کن کن مقامات میں کن کن زمانوں میں اور کن اشخاص نے نقل کئے اور اب وہ کہاں موجود ہیں جو اصحاب آیندہ ولی کے متعلق کام کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ مواد خاص طور پر کارآمد ہوگا۔

أ- وہ نسخے جن پر تاریخ کتابت درج ہے

۱- سنہ ۱۱۲ھ

یہ نسخہ اورنگ آباد میں لکھا گیا تھا اور نواب نصیر حسین خاں خیال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲- سنہ ۱۱۲۵ھ

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں ہے۔

۳- سنہ ۱۱۴۱ھ

اس نسخہ میں ولی اور قاضی القضاۃ کی مہریں ثبت ہیں کتب خانہ مولوی حکیم سید محمد قاسم صاحب ناظم سمیّات میں موجود ہے اور اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:-

"مختصر حالات ولی سید عبدالغفار نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید قاسم صاحب شاہ نوری سے پیدائش ولی سنہ ۱۰۷۹ھ، تصنیف پہلے سنہ ۱۱۴۱ھ دہ مجلس کئے، دیوان دکنی نثر وغیرہ۔ دہ مجلس و دیوان محمد ولی (محمد شمس الدین المتخلص دلی) و حضرت استادنا مولانا سید اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث مدرسہ علویہ گجرات متوطن دارالظفر بیجاپور و شاہ نور کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے محمد ولی کی اورنگ آباد میں ولادت ہوئی شوق تحصیل علم گجرات کے مدرسۂ علویہ میں کھینچ لایا۔ بعد الفراغ تحصیل علم بانیٔ مدرسہ سجادہ نشین علوی کے عقیدتمندوں میں داخل ہوئے۔

المرقوم سنہ ۱۳۰۵ھ

سید عبدالغفار شاہ نوری"

۴۔ ۱۱۴۳ھ

۵ رجمادی الاول۔ احمد آباد میں لکھا گیا اور حیدر آباد کے ایک خانگی کتب خانہ میں موجود ہے۔

۵۔ ۱۱۴۴ھ

۲ ربیع الثانی۔ کاتب حفیظ اللہ۔ انڈیا آفس (لندن) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۶۔ ۱۱۴۴ھ

کتب خانۂ گورسرن بلی صاحب آزاد۔

۷۔ ۱۱۴۶ھ

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۸۔ ۱۱۵۳ھ

۲۶ رصفر۔ شمالی ہند میں لکھا گیا اور گارسان دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں موجود ہے۔

۹۔ ۱۱۵۳ھ

مکتوبہ ۲۲ سنہ جلوس محمد شاہی م ۱۱۵۳ھ ۲۰۲ سال قبل کا لکھا ہوا نسخہ جس کے ختم پر یہ عبارت درج ہے:-

"تمت ہذا الکتاب دیوان ولی علیہ الرحمۃ بنیم شب ذیحجہ ۲۲ سنہ جلوس بقصبہ اوندنگاؤں سرکار نیشاپوری صوبہ برار بالا گھاٹ در عمل مرزا ابوالفتح بقلم بندہ تحریر یافت سہ ہزار سہ صد ہشتاد و ہفت بیت۔ ۳۳۸۷ (اشعار)"۔ کتب خانہ حکیم عبدالرزاق صاحب شطاری حیدر آباد

۱۰۔ ۱۱۵۳ھ

۲۶ رصفر۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱۔ ۱۱۵۳ھ

۲ رجب۔ کاتب شیخ امام الدین۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۲۔ ۱۱۵۴ھ

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۳۔ ۱۱۵۵ھ

خلیل اللہ صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

۱۴۔ ۱۱۵۵ھ

۲۶ ربیع الثانی۔ محمد نور الدین علی۔ مقام کتابت گجرات انڈیا آفس (لندن) کے کتب خانہ میں ہے۔

۱۵۔ ۱۱۵۵ھ

مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔

۱۶۔ ۱۱۵۶ھ

۲ ذیقعدہ۔ کاتب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں ہے۔ ۱۷۔ ۱۱۵۷ھ م ۲۷ سنہ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی
کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر

۱۸۔ ۱۱۶۲ھ

کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر۔

۱۹۔ ۱۱۷۰ھ

۵ ذیقعدہ۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۰۔ سنہ ۱۱۸۰ھ

گارسان دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں ہے۔

۲۱۔ سنہ ۱۱۸۵ھ

مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کے کتب خانہ گورکھپور میں ہے۔

۲۲۔ سنہ ۱۱۸۷ھ

۲۸ جمادی الثانی۔ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۳۔ سنہ ۱۱۹۱ھ

کاتب موہن لعل۔ مقام کتابت حیدرآباد دکن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر عثمانیہ کالج کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۴۔ سنہ ۱۱۹۴ھ

گارسان دتاسی کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۵۔ سنہ ۱۲۱۲ھ

کنگس کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۶۔ سنہ ۱۲۱۳ھ

حیدرآباد دکن میں لکھا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۷۔ سنہ [illegible]

۔۔ جمادی الاول۔ کاتب کریم علی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۸۔ سنہ ۱۲۴۱ھ

۲۷ ربیع الثانی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

۲۹۔ سنہ ۱۲۴۵ھ

۲ ربیع الاول۔ مقام کتابت بوئن پلی۔ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

۳۰۔ سنہ ۱۲۴۹ھ

مرتبہ گارسان دتاسی۔

۳۱۔ سنہ ۱۲۵۰ھ

دتاسی کے کتب خانہ پیرس میں موجود ہے۔

۳۲۔ سنہ ۱۲۶۱ھ

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۳۳۔ سنہ ۱۲۸۰ھ

۲۷ ذی الحجہ۔ کاتب غلام محمد۔ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوان ولی کے ایسے نسخے جن پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے

۱۔ انڈیا آفس لندن کے نسخے

۳۴۔ (۱۱۶) اوراق میں، خط نستعلیق۔ اس دیوان پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کالج کی ملک رہا ہے۔

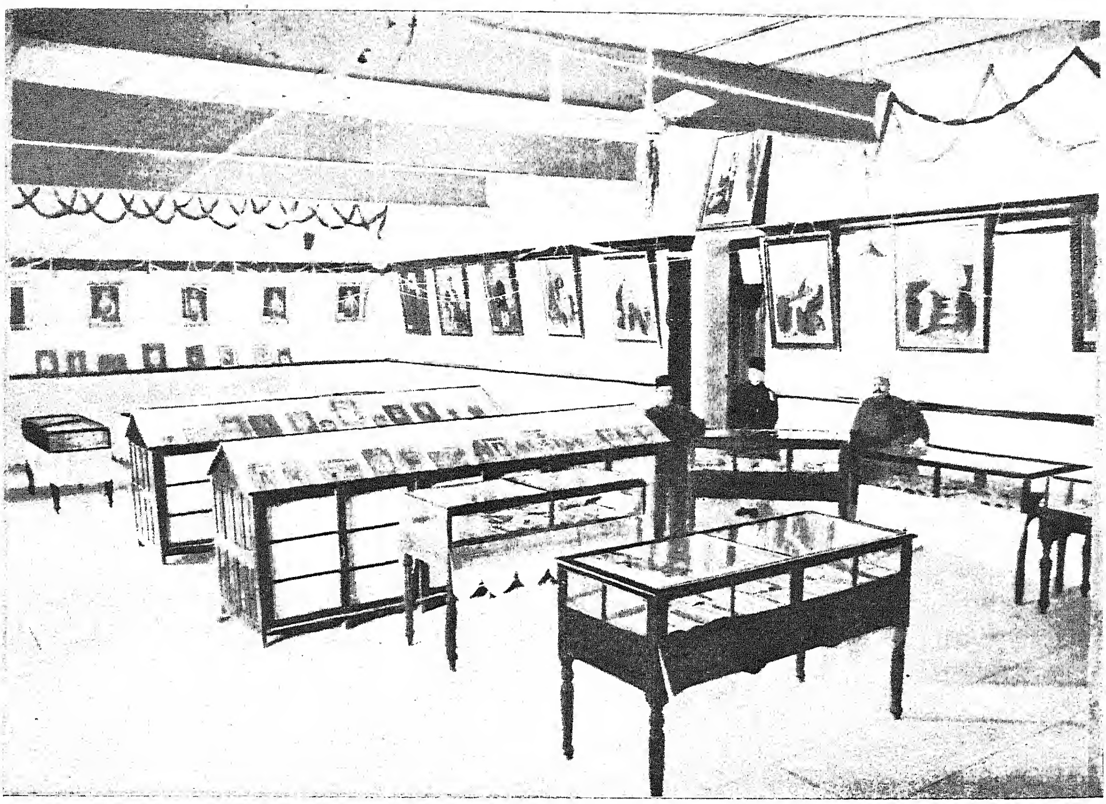

نمائش مخطوطات یوم ولی کا ایک منظر

" بلاک ساختہ عظیم ہاف ٹون ورکس "

۳۵۔ (۱۱۷) اوراق ہیں۔ بموجب فرمودۂ جیو کرجیو۔

۳۶۔ (۱۱۸) اوراق۔ بلحاظ کاغذ و خط تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۳۷۔ (۱۱۹) اوراق خط نستعلیق۔ یہ دیوان ناقص اول و ناقص آخر ہے بلحاظ شان و کاغذ بارھویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۸۔ کنگس کالج کیمبرج کا نسخۂ دیوان ولی۔

۳۹۔ (۹۱) اوراق خط نستعلیق بلحاظ شان و خط تیرھویں صدی ہجری کا ہے۔

۲۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ کا نسخہ

۴۰۔ (۱۲۵) اوراق۔ خط نستعلیق۔ غزلوں کے ختم پر جو (۱۰۱) ہیں "تمت تمام شد دیوان ولی" لکھا گیا ہے۔

۳۔ انجمن ترقی اردو کے نسخے

۴۱۔ اول و آخر قدرے ناتمام مگر خوشخط اور صاف۔

۴۲۔ آخر سے ناتمام اور کرم خوردہ، مگر بدخط اور تاریخ کتابت درج نہیں۔

۴۳۔ جدید قلمی نسخہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے قدیم نسخہ سے نقل کرایا تھا اور استفادہ کی غرض سے مولوی عبدالحق صاحب کو عنایت فرمایا تھا، بالکل محفوظ سالم اور صاف ہے۔

۴۴۔ مولوی غلام سجاد صاحب کے کتب خانۂ بدایوں کا قلمی نسخہ ہے، جس کا اول و آخر ناتمام ہے۔

۴۵۔ مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی الملقب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر رئیس بھیکم پور کے کتب خانہ کا قلمی نسخہ جو بعہد محمد شاہ لکھا گیا۔

۴۶۔ سید محمد بلگرامی صاحب ضلع آرہ کا مرتبہ و نوشتہ نسخہ۔

۴۔ گارسان دتاسی کے کتبخانہ پیرس کے نسخے

۴۷۔ (۱۸۰) صفحات کا نسخہ ہے۔

۴۸۔ (۱۲۵) اوراق۔ یہ دیوان مخطوطات دتاسی میں سب سے زیادہ مکمل ہے۔

۴۹۔ مخطوطہ، قدیم، نہایت صحیح۔ یہ مخطوطہ پرانس صاحب کی ملکیت تھا اور اس نے اپنی ہندوستانی گرامر میں تین غزلیں منتخب کرکے شایع کی ہیں (۲۷۰) اوراق ہیں۔

۵۰۔ یہ مخطوطہ نہایت اچھا نسخہ جو بصورت تحریر لیکن نامکمل یہ مخطوطہ جے ڈبلیو سل صاحب کی ملکیت رہ چکا ہے اور

وناسی کو مشہور مستشرق شکپیر نے دیا تھا۔ (۱۲۶) صفحات ہیں۔

۵۱۔ نفیس تحریر۔ صحیح اور تغیر و تبدل کے ساتھ

(۲۳۲) صفحات ہیں۔

۵۲۔ یہ مخطوطہ مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔

۵۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتبخانہ کے نسخے

۵۳۔ ایک نسخہ جو بیاض کی شکل میں ہے رنگین جدول کیساتھ خوشخط لکھا گیا ہے۔

۵۴۔ خوشخط اور اس کے ساتھ سراج اورنگ آبادی کا دیوان بھی شامل ہے۔

۵۵۔ ایک قدیم نسخہ جس کا کاغذ بھی قدیم ہے۔

۵۶۔ ایک قدیم خوشخط نسخہ جسکے حاشیے پر مرثیے بھی درج ہیں۔

۵۷۔ دیوان ولی کے ساتھ اور چار کتابیں "احوال قیامت" از محیط "معراج نامہ" از بلاقی "بحث کہانی" از افضل "کاک سندیسہ" از اکرم۔

حیدر آباد دکن کے متفرق نسخے

۵۸۔ کتب خانۂ آغا حیدر حسن صاحب۔

شعراء مثلاً نصرتی وغیرہ کی غزلیات بھی موجود ہیں۔

۵۹۔ محمد علیم الدین صاحب کتب فروش اسٹیشن روڈ

۶۰۔ صاف خط نسخہ مملوکہ مولوی سید محمد صاحب

دکنی اُردو کے اُن قلمی نسخوں کی فہرست

جو

بتقریب جشن یادگار ولی اورنگ آبادی

سٹی کالج کی نمایش میں جمع کئے گئے

سنہ ۸۲۵ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک کی اردو کتابیں

نمبر سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	نثر یا نظم	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کہاں سے حاصل ہوئی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱	ارشاد نامہ	خواجہ بندہ نوازؒ وفات ۸۲۵ھ	نثر	قبل سنہ ۸۲۵ھ	.	آغا حیدر حسن صاحب
۲	رسالۂ تصوف	〃	〃	قبل سنہ ۸۲۵ھ	.	نواب سالار جنگ بہادر
۳	تلاوت المعراج	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۶۹ھ	〃
۴	سب رس	میراں جی شمس العشاق وفات ۹۰۲ھ	〃	قبل سنہ ۹۰۲ھ	سنہ ۱۱۱۸ھ	〃
۵	خوب ترنگ	شیخ خوب محمد چشتی	نظم تصوف	سنہ ۹۸۶ھ	سنہ ۱۰۱۰ھ	〃
۶	〃	〃	〃	〃	.	〃
۷	دیوان شاہ علی	شاہ علی جیو گام دھنی	نظم	.	سنہ ۱۱۸۱ھ	〃
۸	〃	〃	〃	.	سنہ ۱۱۸۰ھ	آغا حیدر حسن صاحب

۹	رسالۂ تصنیف تصوف	شاہ برہان الدین جانم وفات ۹۹۰	نثر	•	•	نواب سالار جنگ بہادر
۱۰	ارشاد نامہ	〃	〃	•	سنہ ۱۱۵۱ھ	〃
۱۱	نورس	ابراہیم عادل شاہ	نظم	•	•	کتب خانہ حسین علیخاں
۱۲	ابراہیم نامہ	عبدل بیجاپوری	〃	سنہ ۱۰۱۲ھ	•	نواب سالار جنگ بہادر
۱۳	تحفۂ عاشقاں یا قصۂ گل و ہرمز	عاجز	〃	سنہ ۱۰۱۵ھ؟	سنہ ۱۱۵۳ھ	〃
۱۴	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۶۱ھ	〃
۱۵	دیوان محمد قلی قطب شاہ	محمد قلی قطب شاہ وفات ۱۰۲۰	〃	قبل سنہ ۱۰۲۰ھ	•	آغا حیدر حسن صاحب
۱۶	دیوان محمد قلی قطب شاہ	〃	〃	〃	•	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷	دیوان عبد اللہ قطب شاہ	〃	〃	〃	•	〃
۱۸	بیدن نامہ	مخدوم شاہ	〃	سنہ ۱۰۱۷ھ	•	〃
۱۹	سیف الملوک و بدیع الجمال	ملا غواصی	〃	سنہ ۱۰۳۵ھ	سنہ ۱۰۶۷ھ	〃
۲۰	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۲۱	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۲۲	نصیحت نامہ، علم اخلاق	•	•	•	سنہ ۱۱۵۰ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۳	تحفۃ النصائح	قطب الدین رازی (ملا قطبی)	نظم (اخلاقی)	سنہ ۱۰۴۳ھ	•	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۱۲۲ھ	〃
۲۵	〃	〃	〃	〃	۲۸؟	〃
۲۶	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۱۲۳ھ	〃
۲۷	سب رس	ملا وجہی گولکنڈہ	نثر	سنہ ۱۰۴۵ھ	•	جامعہ عثمانیہ
۲۸	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۰۷۳ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۹	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۱۴ھ	آغا حیدر حسن صاحب

۳۰	سب رس	〃	〃	〃	۱۲۷۵ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۳۱	〃	〃	〃	〃	۱۱۱۷ھ	جامعہ عثمانیہ
۳۲	〃	〃	〃	〃	۱۲۹۱ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۳۳	لیلیٰ مجنوں	عاجز	نظم	۱۰۴۰ھ	۱۱۵۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۳۴	چندر بدن و مہیار	مقیمی	〃	۱۰۴۸ھ	.	آغا حیدر حسن صاحب
۳۵	طوطی نامہ	ملا غواصی	〃	۱۰۴۹ھ	۱۱۳۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۳۶	〃	〃	〃	〃	۱۱۴۱ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۳۷	〃	〃	〃	〃	۱۱۷۴ھ	جامعہ عثمانیہ
۳۸	〃	〃	〃	〃	۱۱۵۰ھ	〃
۳۹	چندر بدن و مہیار	مقیمی	〃	۱۰۴۸ھ	۱۲۵۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۴۰	قصہ ابو تمیم انصاری	صنعتی		۱۰۵۵ھ		جامعہ عثمانیہ
۴۱	〃	〃		〃	۱۲۵۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۴۲	نور نامہ	بلاقی	نظم	۱۰۶۴ھ		〃
۴۳	پھول بن	ابن نشاطی گولکنڈہ	〃	۱۰۶۶ھ	۱۰۷۶ھ	〃
۴۴	〃	〃	〃	〃		〃
۴۵	〃	〃	〃	〃	.	〃
۴۶	شرح شرح تمہید	سید میراں جی خدا نما	نثر	۱۰۶۶ھ		〃
۴۷	فقہ ہندوی	عبد و امین		۱۰۷۴ھ	۱۲۶۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۴۸	احکام الصلوٰۃ	شاہ ملک	نظم	۱۰۷۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۴۹	〃	〃	〃	〃		جامعہ عثمانیہ
۵۰	گلشن عشق	نصرتی بیجاپور	〃	۱۰۶۹ھ	۱۲۶۱ھ	نواب سالار جنگ بہادر

۵۱	״	״	״	״	۱۲۲۸ھ	آغا حیدر حسن صاحب (کاتب وجدی)
۵۲	مجموعۂ مثنویات		״	۱۰۷۷ھ		جامعہ عثمانیہ
۵۳	״	نصرتی	״	״	۱۱۹۳ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۵۴	״	״	״	״	۱۲۲۹ھ	جامعہ عثمانیہ
۵۵	״	״	״	״		״
۵۶	دیوان عبداللہ قطب شاہؒ	سلطان عبداللہ وفات ۱۰۸۳ھ	״	قبل ۱۰۸۳ھ		آغا حیدر حسن صاحب
۵۷	معجزہ حضرت فاطمہؓ		״	۱۰۸۸ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۵۸	رضوان شاہ روح افزا	فائز	״	۱۰۹۴ھ	۱۲۴۵ھ	״
۵۹	علی نامہ	نصرتی	״	۱۰۷۷ھ		״
۶۰	معراج نامہ	بلاقی	״	۱۰۸۰ھ	۱۲۴۹ھ	״
۶۱	״	״	״	״		״
۶۲	״	״	״	״		״
۶۳	رسالہ قربیہ	شاہ امین الدین اعلی	״	قبل ۱۰۸۷ھ		״
۶۴	رسالہ تصوف	״	״	״		״
۶۵	معراج نامہ	مختار	״	۱۰۹۴ھ	۱۲۰۲ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۶۶	قصیدہ	عاجز	״	۱۰۹۹ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۶۷	یوسف زلیخا	ہاشمی	״	״		״
۶۸	״	״	״	״		آغا حیدر حسن صاحب
۶۹	״	״	״	״		جامعہ عثمانیہ
۷۰	دیوان ریختی	״	״			نواب سالار جنگ بہادر
۷۱	خزانہ عبادت	شاہ محمد	״	۱۱۰۰ھ	۱۲۴۱ھ	״

۷۲	قصۂ ملکۂ مصر	عاجز	〃	۱۱۰۰ھ	۱۲۱۶ھ	جامعہ عثمانیہ
۷۳	ہدایت ہندی	شیخ داؤد ضعیفی	〃 مذہبی	〃		نواب سالار جنگ بہادر
۷۴	〃	〃	〃	〃		〃
۷۵	قصۂ منظوم	〃	〃	〃		〃
۷۶	من لگن	قاضی محمود بحری	〃	۱۱۱۲ھ	۱۱۲۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۷۷	〃	〃	〃	〃		نواب سالار جنگ بہادر
۷۸	〃	〃	〃	〃		〃
۷۹	〃	〃	〃	〃		آغا حیدر حسن صاحب
۸۰	بنگاب نامہ	〃	〃	〃	۱۲۱۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۸۱	〃	〃	〃	〃	۱۲۶۳ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۸۲	نور نامہ	عنایت شاہ	〃	〃		نواب سالار جنگ بہادر
۸۳	کنز المومنین	عابد شاہ	نثر		۱۱۱۴ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۸۴	کلیات ولی	ولی محمد اورنگ آبادی	نظم	قبل ۱۱۲۵ھ	۱۳۲۵ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۸۵	〃	〃	〃	〃	۱۱۶۱ھ	〃
۸۶	〃	〃	〃	〃	۱۱۶۳ھ	〃
۸۷	〃	〃	〃	〃		〃
۸۸	〃	〃	〃	〃	۱۱۴۰ھ	گوہر علی صاحب آزاد
۸۹	〃	〃	〃	〃	۱۱۵۲ھ	حکیم عبدالرزاق صاحب شطاری
۹۰	〃	〃	〃	〃		نواب سالار جنگ بہادر
۹۱	〃	〃	〃	〃		〃
۹۲	〃	〃	〃	〃		〃

۹۳	〃	〃	〃	〃	۱۱۸۷ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۹۴	〃	〃	〃	〃	۱۱۹۱ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۹۵	〃	〃	〃	〃	۱۲۱۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۹۶	〃	〃	〃	〃		علیم الدین صاحب تاجر کتب
۹۷	بیاض غزلیات ولی و نصرتی					آغا حیدر حسن صاحب
۹۸	ظفرنامۂ عشق	سید مظفر	〃	۱۱۲۰ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۹۹	مصطفیٰ نامہ	مصطفیٰ	〃	۱۱۲۶ھ	۱۲۶۶ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۰۰	روضۃ الشہداء	سید محمد فیاض ولی ویلوری	〃	۱۱۳۰ھ	۱۱۵۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۱	〃	〃	〃	〃	۱۲۲۴ھ	〃
۱۰۲	〃	〃	〃	〃	۱۲۳۱ھ	〃
۱۰۳	〃	〃	〃	〃	۱۲۵۵ھ	〃
۱۰۴	〃	〃	〃	〃		〃
۱۰۵	پنچھی باچھا	وجدی		۱۱۳۴ھ	۱۲۵۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۰۶	کلیات ایجاد	نقد علی خاں	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۰۷	〃	〃	〃			〃
۱۰۸	سوال و جواب حضرت موسیٰ		نثر		۱۱۷۴ھ	〃
۱۰۹	طوطی نامہ	محمد قادری		۱۱۴۲ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۱۰	تنبیہ	سید محمد خاں عشرتی	نظم	۱۱۴۳ھ	۱۲۸۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۱۱	ایک پلنگ	〃	〃			〃
۱۱۲	چیت لگن	〃	〃			〃
۱۱۳	دیوان قاسم	شاہ قاسم اورنگ آبادی	〃		۱۱۶۰ھ	〃

۱۱۴	پنچھی بچھاچا	شیخ وجیہ الدین وجدیؔ	〃	سنہ ۱۱۵۵ھ	سنہ ۱۲۵۲ھ	〃
۱۱۵	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۴۷ھ	〃
۱۱۶	〃	〃	〃	〃		〃
۱۱۷	جنگنامہ محمد حنیف	میزان	〃		سنہ ۱۱۵۷ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۱۸	دیوان عثمان خاں سرور	عثمان خاں سرور	〃			نصیر الدین صاحب ہاشمی
۱۱۹	محشر نامہ	توفیق	〃	سنہ ۱۱۶۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۰	قصہ ملکۂ مصر	عبد اللطیف	〃	سنہ ۱۱۷۷ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۲۱	دیوان سراج	شاہ سراج الدین اورنگ آبادی		〃		نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۲	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۵۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۳	〃	〃	〃	سنہ ۱۱۶۱ھ	سنہ ۱۱۶۱ھ	پروفیسر حسن علیخاں صاحب
۱۲۴	پنج گنج				سنہ ۱۱۷۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۲۵	بوستان خیال	شاہ سراج الدین	نظم	سنہ ۱۱۷۳ھ	سنہ ۱۲۱۲ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۲۶	بیاض مراثی	نواب درگاہ قلی خاں	〃	سنہ ۱۱۷۷ھ		〃
۱۲۷	روضۃ الاطہار	نوازش علیخاں شیداؔ	〃	سنہ ۱۱۷۳ھ	سنہ ۱۱۷۳ھ	〃
۱۲۸	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۱۰ھ	〃
۱۲۹	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۱۲ھ	〃
۱۳۰	〃	〃	〃	〃		〃
۱۳۱	〃	〃	〃	〃		آغا حیدر حسن صاحب
۱۳۲	〃	〃	〃	〃		ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
۱۳۳	لعل و گوہر	عاجز	〃	سنہ ۱۱۸۰ھ	سنہ ۱۱۸۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۳۴	〃	〃	〃	〃		〃 (مصنف کی تصویر)

۱۳۵	لعل وگوہر	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۶۲ھ	〃
۱۳۶	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۴۰ھ	〃
۱۳۷	〃	〃	〃	〃		〃
۱۳۸	منصور نامہ	فیاض	〃	سنہ ۱۱۸۵ھ		〃
۱۳۹	اعجاز احمدی	نوازش علیخاں شیدا	〃	سنہ ۱۱۸۶ھ	سنہ ۱۲۶۵ھ	〃
۱۴۰	〃	〃	〃	〃		〃
۱۴۱	کلیات تمنا	اسد علیخاں تمنا اورنگ آبادی	〃		سنہ ۱۱۹۴ھ	〃
۱۴۲	مثنوی تصویر جاناں	صاحب	〃	سنہ ۱۱۸۸ھ		〃
۱۴۳	وفات نامۂ خیرالنساءؑ				سنہ ۱۱۸۹ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۴۴	قصۂ بہرام ودلارام	محمد سعید الدینخاں سعید	〃	سنہ ۱۱۹۸ھ	سنہ ۱۲۵۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۴۵	فال نامہ		〃		سنہ ۱۱۹۰ھ	〃
۱۴۶	احوال قیامت	محیط	〃			〃
۱۴۷	چہار کرسی	احمد خاں	〃	سنہ ۱۱۹۰ھ	سنہ ۱۲۵۷ھ	〃
۱۴۸	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۴۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۴۹	دیوان عشق	جمال اللہ عشق اورنگ آبادی	〃	سنہ ۱۱۹۴ھ		آغا حیدر حسن صاحب
۱۵۰	قصۂ لیلی ومجنوں	عبداللہ واعظ	.	سنہ ۱۱۹۶ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۵۱	محفوظ خانی	قدرعالم	نظم	سنہ ۱۱۹۹ھ	سنہ ۱۲۷۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۵۲	〃	〃	〃	〃	〃	جامعہ عثمانیہ
۱۵۳	〃	〃	〃	〃		نواب سالار جنگ بہادر
۱۵۴	مثنوی	〃	〃	〃		〃
۱۵۵	نیرنگ عشق		〃		سنہ ۱۲۰۲ھ	〃

۱۵۶	سراج الایمان	حافظ احمد بن محمد		سنہ ۱۲۰۱ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۵۷	بیاض العارفین	اسحٰق	نظم	سنہ ۱۲۰۶ھ	سنہ ۱۲۳۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۵۸	〃	〃	〃	〃		جامعہ عثمانیہ
۱۵۹	کلام نبی	غلام نبی	〃	سنہ ۱۲۰۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۰	دیوان ممتاز	عمدۃ الامراء	〃	〃		نصیر الدین صاحب ہاشمی
۱۶۱	ریاض الجناں	محمد باقر آگاہ	〃	〃	سنہ ۱۲۴۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۲	انوار محمدی	کرامت علی	〃	سنہ ۱۲۱۲ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۶۳	فوائد در فوائد	محمد باقر آگاہ	〃	سنہ ۱۲۱۰ھ	سنہ ۱۲۷۷ھ	〃
۱۶۴	قصہ حاتم طائی	مہمان	〃	سنہ ۱۲۱۶ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۵	مثنوی حاتم طائی	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۷۳ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۶۶	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۱۶۷	تلاوت الوجود	مخدوم شاہ حسینی رہنما	〃	سنہ ۱۲۱۹ھ		〃
۱۶۸	مکافات حسین محنت نامہ	سلام الدین یکیسو	〃	〃	سنہ ۱۲۰۷ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۶۹	ہشت بہشت	محمد باقر آگاہ	〃	سنہ ۱۲۰۰ھ	سنہ ۱۲۶۹ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۰	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۵۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۱	〃	〃	〃	〃	سنہ ۱۲۶۲ھ	〃
۱۷۲	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۱۷۳	دوازدہ مجلس	محکم	〃		سنہ ۱۲۲۲ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۴	گلشن احساں	احسان علی	〃	سنہ ۱۲۲۴ھ	سنہ ۱۲۲۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۵	فقہ المبین		نثر		سنہ ۱۲۲۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۶	مجموعۂ رسائل فقہ				سنہ ۱۲۲۴ھ	〃

۱۷۷	اسرار عشق	محمد	نظم	۱۲۲۵ھ	۱۳۰۴ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۷۸	محبوب القلوب	باقر آگاہ		۱۲۲۷ھ	۱۲۵۵ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۷۹	دیوان فیض	شمس الدین فیض	نظم	۱۲۳۸ھ		ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۸۰	تحفۃ النساء	باقر آگاہ	”	۱۱۸۵ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۱	گلزار عشق		”	۱۲۲۶ھ	۱۲۴۹ھ	”
۱۸۲	ریاض الجنان	باقر آگاہ	”	۱۲۲۷ھ	”	جامعہ عثمانیہ
۱۸۳	واحد باری	اشرف	”		۱۲۲۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۴	مثنوی حیرت عشق	آگاہ بیجاپوری	”	۱۲۱۴ھ		جامعہ عثمانیہ
۱۸۵	مولود شریف	قاسم	”	۱۲۰۹ھ	۱۲۴۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۶	قصص الانبیاء		نثر		۱۲۴۷ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۸۷	مدینۃ الانوار	نامی	نظم مذہبی	۱۲۱۳ھ	۱۲۱۶ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۱۸۸	”	”	”	”	”	”
۱۸۹	معجزات	حبیب اللہ قادری	”	۱۲۱۴ھ	سنہ	”
۱۹۰	عقائد باقر آگاہ	باقر آگاہ	”	قبل ۱۲۰۰ھ	۱۲۵۳ھ	”
۱۹۱	اسرار احمدی	محمد خاں عرف بدو میاں			۱۲۶۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۲	چہار درویش	شوق	نظم	۱۲۱۴ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۳	ملکہ زناں کام کندلا		نثر		۱۲۳۴ھ	”
۱۹۴	ابلیس نامہ	عاجز	نظم و نثر	۱۲۰۰ھ	۱۲۵۴ھ	”
۱۹۵	عقائد اہل سنت				۱۲۳۸ھ	جامعہ عثمانیہ
۱۹۶	ترجمہ قصیدہ بردہ	عاجز	نظم			نواب سالار جنگ بہادر
۱۹۷	مفتاح الصلوٰۃ	شاہ سعید الدین	نثر	۱۲۴۱ھ	۱۲۶۲ھ	”

۱۹۸	مثنوی سدابہار	موتی سنگھ	نظم	۱۲۴۳ھ	۱۲۶۵ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۱۹۹	کشف الخلاصہ	حافظ شجاع الدین	"	۱۲۵۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۰۰	"	"	"	"	۱۲۶۵ھ	"
۲۰۱	دیوان سلطان	سلطان	"		۱۲۳۹ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۲۰۲	امیر حمزہؓ	قربان حسین	"		۱۲۵۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۰۳	ترجمہ حدیث زوالج	شیخ آدم	نثر		۱۲۶۹ھ	"
۲۰۴	صراط المتقین		"	۱۲۵۳ھ	۱۲۵۴ھ	"
۲۰۵	مہر انگیز و دلارام		نظم		۱۲۶۴ھ	"
۲۰۶	آب حیات	حیات	"		۱۲۶۶ھ	"
۲۰۷	فقہ لازم اسلام	محمد عثمان الیمین	نثر		۱۲۷۰ھ	آغا حیدر حسن صاحب
۲۰۸	معراج نامہ	سیدہ دکھنی	نظم		۱۲۷۴ھ	"
۲۰۹	احکام الصلوٰۃ	غلامی	"	۱۲۵۷ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۱۱	خیالات وصال	شاہ امیر الدین قادری		۱۲۶۷ھ	۱۳۲۴ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۱۲	نغمات الشہدا	غلام غوث سالک		۱۲۸۰ھ	۱۲۸۱ھ	"
۲۱۳	نجات دارین	غلام زین العابدین	نثر	۱۲۸۱ھ	"	نواب سالار جنگ بہادر
۲۱۴	منصور نامہ	کبیر	نظم		"	"
۲۱۵	قصہ شاہ یمن	عاجز	"	۱۲۸۲ھ	۱۲۸۲ھ	"
۲۱۶	دیوان آفاق	آفاق	"		۱۲۳۹ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۱۷	"	"	"			جامعہ عثمانیہ
۲۱۸	تاریخ		"		۱۲۸۹ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۱۹	قصہ بی بی مریمؑ				۱۲۵۰ھ	جامعہ عثمانیہ

۲۲۰	رسالہ فقہ و چہار مسائل	اشرف	نظم		۱۲۶۵ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۱	وفات نامہ حضرت خاتون جنت		؍؍		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۲	گلشن نامہ حضرت خاتون جنت		؍؍		۱۲۷۲ھ	؍؍
۲۲۳	نل دمن		؍؍		۱۲۶۳ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۲۴	قصہ باز و فاختہ		؍؍		۱۲۷۵ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۲۵	تفسیر ہندی	کامل شاہ دکھنی			؍؍	جامعہ عثمانیہ
۲۲۶	روضۃ الشہدا	ولی ویلوری	نظم		۱۲۷۴ھ	؍؍
۲۲۷	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	۱۲۷۵ھ	محمد علیم الدین صاحب تاجر کتب
۲۲۸	چندر بدن و مہیار	واقف	؍؍	۱۲۲۷ھ	۱۲۷۰ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۲۹	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	۱۲۶۰ھ	؍؍
۲۳۰	غوث نامہ	لعل خاں شاہ			۱۲۷۷ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۳۱	راحت دل	اشفاق	نظم	۱۲۴۵ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۲	من موہن	آزاد	؍؍	۱۲۴۷ھ	۱۲۷۵ھ	؍؍
۲۳۳	وفات نامہ آنحضرتؐ		؍؍		۱۲۸۰ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۴	شرح تمثیلات	آزاد	نظم و نثر	۱۲۵۱ھ		نواب سالار جنگ بہادر
۲۳۵	نکات الاسرار	شاہد چشتی	نظم	۱۲۶۲ھ	۱۲۶۲ھ	؍؍
۲۳۶	دیوان شاہد	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍
۲۳۷	ترجمہ گلشن زار	آزاد	؍؍	۱۲۸۶ھ	۱۲۸۷ھ	؍؍
۲۳۸	معجزۂ حضرت خاتون جنتؑ		؍؍		؍؍	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۳۹	وفات حضرت خاتون جنتؑ		؍؍		۱۲۸۳ھ	؍؍
۲۴۰	تنبیہ النساء		؍؍		۱۲۶۶ھ	؍؍

۲۴۱	روضۃ الشہداء	میر حسن جعفری	نظم			نواب سالار جنگ بہادر (دس جلد و نفیس) ر (بارہ جلد و نفیس)
۲۴۲	روضہ ہندی	محکم	ر			
۲۴۳	دیوان ایمان	ایمان			سنہ ۱۲۹۶ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۴	دیوان حسینی	حسینی	نظم		ر	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۵	ہدایت الہندی	شیخ داؤد گھنی	ر		سنہ ۱۲۶۱ھ	جامعہ عثمانیہ
۲۴۶	کنز الایمان	عابد شاہ حسینی			سنہ ۱۲۵۷ھ	ر
۲۴۷	بوستان خیالی	سراج	نثر		ر	نواب سالار جنگ بہادر
۲۴۸	انوار بدریہ	شاہ علی	ر		سنہ ۱۲۵۸ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۴۹	کلام روپ کلا		ر		سنہ ۱۲۴۸ھ	نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۰	دستور الصبیان	لوند راے	نظم		سنہ ۱۲۷۶ھ	ر
۲۵۱	قادر باری	قربان علی خاں	ر		ر	ر
۲۵۲	دیوان تمیز	بدر الدین خاں تمیز	ر		سنہ ۱۲۸۳ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۳	مجموعۂ دواوین	مظفر الدین خاں مزاجی	ر		سنہ ۱۲۹۱ھ	ر
۲۵۴	قصۂ بدر الدین و سمن بو	یار محمد خاں	ر	سنہ ۱۲۸۸ھ		جامعہ عثمانیہ
۲۵۵	حبل الورید				سنہ ۱۳۰۰ھ	ر
۲۵۶	دیوان رباعیات عصر	میر احمد علی عصر	نظم		سنہ ۱۳۱۳ھ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۵۷	دیوان وزیر	آصف یار الملک	ر		سنہ ۱۳۳۱ھ	ر
۲۵۸	دیوان فیض	فیض	ر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۵۹	رسالۃ التصوف	خواجہ حسینی بادشاہ	نثر			ر
۲۶۰	گلبن و ویک	محمد قلی قطب شاہ	نظم			ر
۲۶۱	کلیات ایجاد	ایجاد	نثر			ر

۲۶۲	باب المغفرت	حیات	نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۶۳	تشبیہ الریاحین	سرمد	نظم			〃
۲۶۴	مراۃ توحید رح	〃	نثر			〃
۲۶۵	کرامات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	عطا	〃			〃
۲۶۶	رسالۂ کلمۂ توحید	آزاد	نثر، مذہبی			〃
۲۶۷	جنگ نامہ محمد حنیف		مثنوی			〃
۲۶۸	〃		〃			جامعہ عثمانیہ
۲۶۹	گنج نامہ	خالدی	نظم			〃
۲۷۰	تفسیر یا محمدؐ		نثر			نواب سالار جنگ بہادر
۲۷۱	خوش نامہ	عاجز	نظم			〃
۲۷۲	رسالۂ آزاد	آزاد	نظم و نثر			〃
۲۷۳	قصۂ حضرت عیسیٰؑ	کمترین	نظم			〃
۲۷۴	قصۂ گربہ و موش		〃			〃
۲۷۵	قصۂ منصور		〃			〃
۲۷۶	ترجمہ قصیدۂ اسرار		〃			〃
۲۷۷	خلاصۂ تصوف		نثر			〃
۲۷۸	قصص الانبیاء	غوثی	نظم			〃
۲۷۹	زاد المومنین		〃			〃
۲۸۰	مسائل فقہ		نثر			〃
۲۸۱	صراط المستقیم	خیر الدین لایق	نظم و نثر			〃
۲۸۲	وفات نامہ حضرت فاطمہؓ		نظم			〃

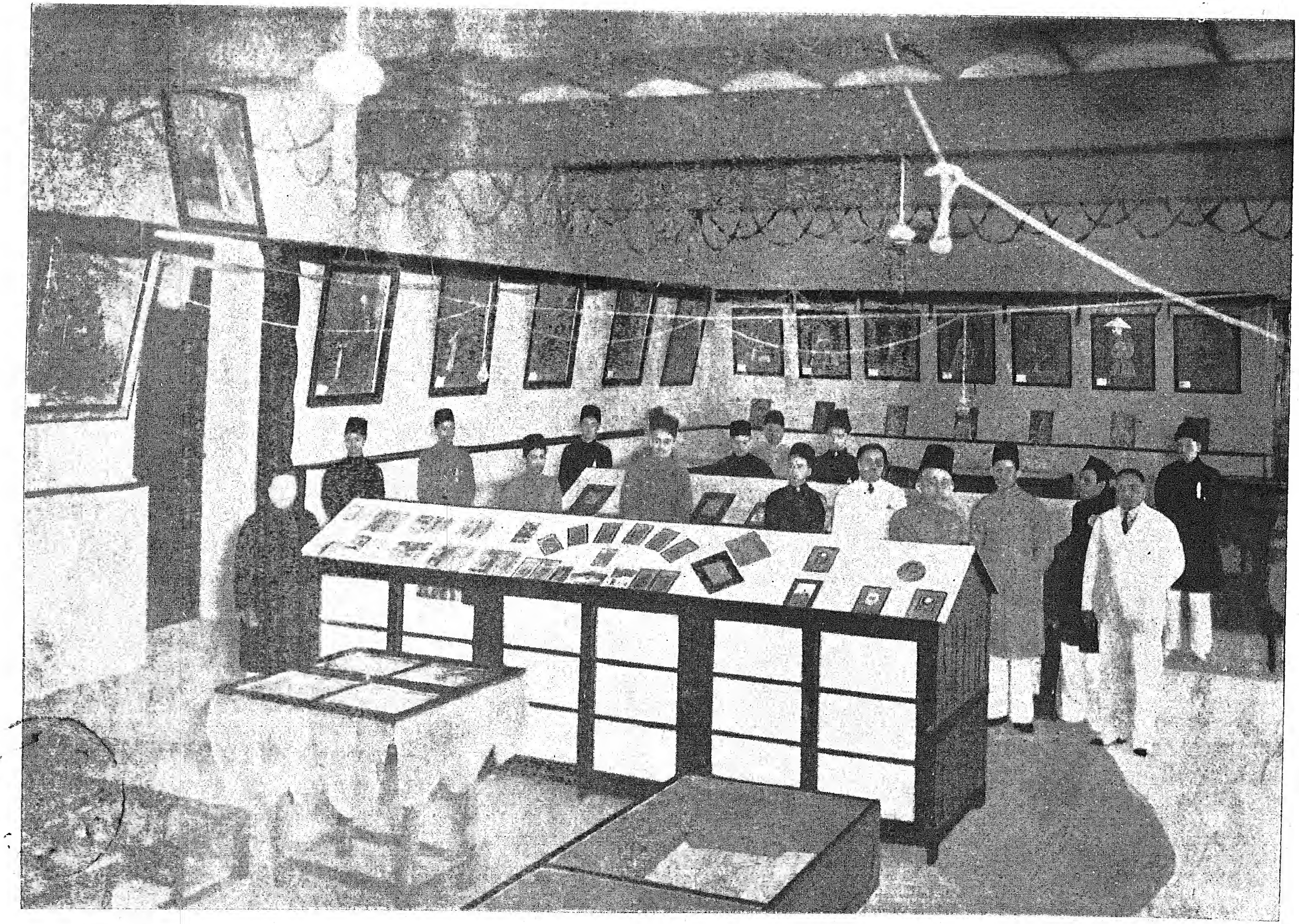

نمائش مخطوطات یوم ولی کا ایک اور منظر

''بلاک ساختہ عظیم ہاف ٹون ورکس''

۲۸۳	قصۂ دنیا		نظم				نواب سالار جنگ بہادر
۲۸۴	مجموعۂ مترجمہ حدیث بشارات	شیخ باقر	نثر				〃
۲۸۵	مجموعۂ معجزات	محی الدین قناعتی	نظم				〃
۲۸۶	سب رس	شاہ محمد ولی اللہ قادری	〃				〃
۲۸۷	معجزنامہ	قادر	〃				〃
۲۸۸	مثنوی آصف	آصف	〃				〃
۲۸۹	کنز الہدایا		〃				〃
۲۹۰	پنج رسالہ منظوم	معظم	نثر				〃
۲۹۱	بیاض مراثی	رضا وغیرہ	نظم				〃
۲۹۲	تنبیہ النساء	شاہ رحمت اللہ	〃				〃
۲۹۳	مجموعۂ المسائل		نثر				〃
۲۹۴	کنز المومنین	نواب الدین خدام اعلیٰ شاہ	〃				〃
۲۹۵	رسائل	شاہ صدر الدین	نظم			بزمانۂ مصنف	آغا حیدر حسن صاحب
۲۹۶	مجموعۂ دواوین	بہاری لعل رمز	〃				ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۲۹۷	دیوان آصفی	آصفی حسام الملک خانخاناں	〃				〃
۲۹۸	اساس فقہ						جامعہ عثمانیہ
۲۹۹	رسائل قادریہ						〃
۳۰۰	تاریخ سلاطین بہمنیہ						〃
۳۰۱	مجموعۂ ملفوظات اولیائے دکن						〃
۳۰۲	شمائل نامہ						〃
۳۰۳	مجموعۂ مثنویات دکن						〃

۳۰۴	رسالۂ تصوف دکھنی					جامعہ عثمانیہ
۳۰۵	رموز العارفین					״
۳۰۶	رسالۂ کلمۃ الاسرار					״
۳۰۷	مثنوی چھو منتر	ذوالفقار علی خاں صفا				״
۳۰۸	اعجاز احمدی	نوازش علی خاں شیدا				״
۳۰۹	شمائل الاتقیاء	میراں یعقوب				״
۳۱۰	ترجمہ حملۂ حیدری					״
۳۱۱	بیاض کلام شعرائے دکن		نظم			״
۳۱۲	قواعد عروض	محمد باقر آگاہ				״
۳۱۳	انتخاب کلام شعرائے دکن		نظم			״
۳۱۴	مثنوی دکھنی درسیر		״			״
۳۱۵	فقہ دکھنی	باقر آگاہ	״			״
۳۱۶	جنگ سلوک					نصیر الدین صاحب ہاشمی
۳۱۷	فقہ ہندی	عہدی				״
۳۱۸	نورس					مرزا حسین علی خاں صاحب
۳۱۹	نوحہ جات و سلام آصفی	آصفی				عباس حسین صاحب نقوی
۳۲۰	تاج الحقائق					بذریعہ غفور احمد صاحب مجددی
۳۲۱	دیوان ولی	ولی	نظم			
۳۲۲		״	״			
۳۲۳	دیوان عصر	عصر	״			
۳۲۴	رباعیات عصر	״	״			
۳۲۵ لہ	״	״	״			

لہ۔ نوٹ۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو نمائش کے دو روز قبل تک وصول ہو چکی تھیں بعد میں اور متعدد کتابیں وصول ہوئی تھیں جنکی تفصیلی فہرست تیار نہ ہوسکی اس لیے یہاں درج نہ ہوسکیں۔

فہرست نمائش تصاویر قلمی

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ بانی گولکنڈہ۔
۲۔ فرزندان سلطان قلی قطب شاہ۔
۳۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔
۴۔ 〃 〃 〃 دیگر
۵۔ ابوالحسن تانا شاہ
۶۔ 〃 〃 〃
۷۔ 〃 〃 〃
۸۔ مادنا۔ دیوان قطب شاہی۔
۹۔ 〃 〃 〃 مکرر
۱۰۔ بھاگمتی قطب شاہی۔
۱۱۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۱۲۔ نورس پیکر۔
۱۳۔ جشن طرب نورس۔
۱۴۔ چاند سلطانہ۔
۱۵۔ 〃 〃 〃 مکرر
۱۶۔ 〃 〃 〃 〃 دیگر

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانہ آغا حیدر حسن صاحب

۱۷۔ سکندر عادل شاہ بیجاپوری۔
۱۸۔ میر مومنؒ حیدر آبادی۔
۱۹۔ حضرت علیؓ عمل عبدالولی عزلت۔
۲۰۔ حضرت محبوب سبحانیؒ۔
۲۱۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔
۲۲۔ شیخ فریدالدینؒ شکر گنج۔
۲۳۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا۔
۲۴۔ حضرت قطب الدینؒ بختیار کاکی۔
۲۵۔ حضرت نصیر الدینؒ چراغ دہلوی۔
۲۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔
۲۷۔ بوبوجی خانم زوجہ یوسف عادل شاہ۔
۲۸۔ محمد عادل شاہ۔
۲۹۔ محمد عادل شاہ اور انجا رانی۔
۳۰۔ جمشید قطب شاہ۔
۳۱۔ محمد قلی قطب شاہ۔
۳۲۔ 〃 〃 〃 دیگر

۳۳۔ ابراہیم عادل شاہ اول۔
۳۵۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔
۳۶۔ نواب آصفجاہ اول۔
۳۷۔ نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی۔
۳۸۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث۔
۳۹۔ نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع۔
۴۰۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس۔
۴۱۔ ماہ لقابائی چندہ۔
۴۲۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ۔
۴۳۔ میر عالم بہادر دیوان دکن۔
۴۴۔ مادنا۔ دیوان گولکنڈہ۔
۴۵۔ شاہ ہاشم بیجاپوری۔
۴۶۔ شاہ بہاؤالدین باجن۔
۴۷۔ سکندر جاہ۔
۴۸۔ ماہ لقابائی۔

قدیم قلمی تصاویر از کتب خانہ سید قاسم صاحب

۴۹۔ خواجہ عثمان ہارونؒ۔

۵۰۔ عبدالرحمٰن جامیؒ۔

۵۱۔ مہارانی۔

۵۲۔ شاہ عبدالرزاق قادری بیجاپوری۔

۵۳۔ شاہ رضا حسینی۔

حال کی قلمی تصاویر از کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر

۵۴۔ سلطان قلی قطب شاہ۔

۵۵۔ جمشید قلی قطب شاہ۔

۵۶۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۵۷۔ محمد قلی قطب شاہ۔

۵۸۔ محمد قطب شاہ۔

۵۹۔ عبداللہ قطب شاہ۔

۶۰۔ ابوالحسن تاناشاہ۔

۶۱۔ آصفجاہ اول۔

۶۲۔ میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی۔

۶۳۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث۔

۶۴۔ نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع۔

۶۵۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس۔

۶۶۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس۔

۶۷۔ نواب میر عثمان علیخاں ظل اللہ خلد اللہ ملکہ۔

۶۸۔ مہاراجہ چندولال۔

۶۹۔ نواب مختار الملک۔

۷۰۔ مہاراجہ نریندر پرشاد۔

۷۱۔ نواب عماد السلطنۃ۔

۷۲۔ نواب منیر الملک۔

۷۳۔ نواب آسمان جاہ۔

۷۴۔ نواب وقار الامراء۔

۷۵۔ مہاراجہ کشن پرشاد۔

۷۶۔ نواب سالار جنگ بہادر۔

۷۷۔ نواب خورشید جاہ۔

۷۸۔ نواب معین الدولہ بہادر۔

حال کی قلمی تصاویر جو سٹی کالج کی جانب سے تیار کرائی گئیں

۷۸۔ سلطان قلی قطب شاہ۔

۷۹۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۸۰۔ جمشید قلی قطب شاہ۔

۸۱۔ ابراہیم قلی قطب شاہ۔

۸۲۔ محمد قلی قطب شاہ۔

۸۳۔ محمد قطب شاہ۔

۸۴۔ عبداللہ قطب شاہ۔

۸۵۔ ابوالحسن تاناشاہ۔

۸۶۔ ابراہیم عادل شاہ نورس۔

۸۷۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی۔

حال کی قلمی تصاویر جو قیوم صاحب کی بنائی ہوئی ہیں

۸۸۔ اجنتا کی پیدائش۔

۸۹۔ چاند بی بی معرکہ قلعہ احمد نگر میں۔

۹۰۔ ٹیپو سلطان شہید۔

۹۱۔ پرتھال اور برہمن۔

دیگر تصاویر جو مختلف اصحاب نے پیش کیں

۹۲۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔

۹۳۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ۔

۹۴۔ اعلیحضرت میر محبوب علیخاں غفران مکاں۔

۹۵۔ ہز ہائینس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر

۹۶۔ آنریری جنرل شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر۔

۹۷۔ شہزادی درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ۔

۹۸۔ شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ۔

۹۹۔ نواب مکرم جاہ بہادر۔

۱۰۰۔ نواب سالار جنگ بہادر۔

انتخاب کلام ولی

کیتا ہوں ترے ناؤں کوں میں ورد زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں
اُس گرد کوں میں کُحل کروں دیدہ جاں کا

مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہل حیا دیکھ[1]
تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی ؛
یو بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اس کوں
کھایا ہے جو کُئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا

کہتا ہے ولی دل ستی یو مصرع رنگیں ؛
ہے یاد تری مجکو سبب راحت جاں کا

الٰہی! رکھ مجھے تو خاک پا اہل معانی کا
کہ کُھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

عزیزاں بعد مرنے کے نہ پوچھو تم کہ تنہا ہوں
لکھا ہوں پردۂ دل پر خیال اُس یار جانی کا

پرت کی بزم میں تا سرخ روئی مجکو ہو حاصل
نین سوں اپنے دے ساغر شراب ارغوانی کا

ترے مکھ کی صفائے حیرت افزا لکھ سکے کیونکر
قلم ہے جوہر آئینۂ نا صاف مانی کا

شراب جلوۂ ساقی سوں مت کر منع اے زاہد
یہی ہے مقتضا عالم میں ہنگام جوانی کا

ہوا ہے دل مرا اشتاق تجھ چشم شرابی کا
خراباتی اُپر آیا ہے شاید دن خرابی کا

کیا بیہوش مجھ دل کو انیندی نین ساقی نے
عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابی کا

نہ جاؤں صحن گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجکو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ترے غم میں نکلتا ہے جو باہر نین سوں آنسو
دو جا گوہر کہاں ہے جگ میں اسکی آبداری کا

[1] بمبئی کے چھپے ہوئے دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ اس صاد صداقت کی طرف اہل حیا دیکھ

طالب نہیں ماہ و مشتری کا
دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

کفار فرنگ کوں دیا ہے
تجھ زلف نے درس کافری کا

پایا ہے جو کوئی دولت فقر
مشتاق نہیں سکندری کا

پھیکی لگے اُس کوں شان دولت
چاکھا جو مزہ قلندری کا

کہتا ہے **ولی** پکار یو بات
بندہ ہوں پیا کی دلبری کا

یکایک مجھ دسا ایک شہ جواں اسوار تازی کا
کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطاب عاشق نوازی کا

نزک میرے کرم کو کر فصاحت ہور بلاغت سوں
کہا وہ سرو قد مجکوں سخن یو سرفرازی کا

محبت یار بے پروا کی سینے میں ہے رات ہور دن
یہی مطلب ہے رات اور دن نمازی اور نیازی کا

مجھے بولیا کہ تو واقف نہیں عشق حقیقی سوں
تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

سنیا ہوں جب سوں یہ نکتہ **ولی** شیریں سخن سیتی
لگیا ہے تب سوں شیوہ جی کو میرے عشق بازی کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام
ذکر اُس زلف کی درازی کا

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی
جب سوں دیکھا سوار تازی کا

تیں دکھا کر آپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

آج تیری نگہہ نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

گر نہیں راز فقر سوں آگاہ
فخر بیجا ہے فخر رازی کا

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالع مطلع الانوار کا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں
کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

صُبح تیرا درس پایا تھا صنم
شوق دل مشتاق ہے تکرار کا

ماہ کے سینے اُپر اے شمع رُو
داغ ہے تجھ حُسن کی جھلکار کا

دل کو دیتا ہے ہمارے پیچ و تاب　　پیچ تیرے طرّۂ طرار کا
اے ولی کیوں سن سکے ناصح کی بات　　جو ہے دیوانہ پری رخسار کا

یاد کرنا ھر گھڑی اُس یار کا　　ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں　　تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
عاقبت ہووے گا کیا معلوم نہیں　　دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی　　بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سری جن پر نثار　　مدعا ہے چشم گوھر بار کا

جیوں لالہ بجز آتش خاموش لب یار　　مرہم نہیں عالم میں ولی داغ جگر کا

اپس کی زلف کا فر کیش کی جھلکار ٹک دکھلا　　کہ زاہد بے خبر دم مارتا ہے پارسائی کا
مرے دل کی حقیقت یوں ہوی ہے شہرۂ عالم　　کہ جیوں مشہور ہے مذکور تیری دلربائی کا

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا　　ہوا زھا وا اٹھائی پر مگس کا
اپس گھر میں رقیباں کوں نہ دے بار　　چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا
نگہ سوں تیری ڈرتے ہیں نظر باز　　سدا ہے خوف دزداں کوں عسس[۱] کا
بجز رنگیں ادا دوجے سوں مت مل　　اگر مشتاق ہے توں رنگ و رس کا

چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ و رس کا　　اس سیر جاں فزا سوں سینہ کھلیا ہوس کا
تجھ مکھ کے دیکھنے کوں اے آفتاب طلعت　　مشتاق دل سوں میرے شعلہ اُٹھا ہے رس کا
دریا میں بیم کے یہاں گرداں ہے کشتی عقل　　اس موج شعلہ زن میں کیا آسرا ہے خس کا

۱؎ کوتوال

ہر پھر ولی ترے کن آتا ہے جیوں کہ سائل   ترے مٹھے بیاں کا جب سوں پڑیا ہے چسکا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اُس کا   بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُس کا
ہوا ہے مجکو شمع بزم یکرنگی سوں یو روشن   کہ ہر ذرّے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا
کرے عشاق کوں جیوں صورت دیوار حیرت سوں   اگر پردے سوں وا ہووے جمال بے حجاب اُس کا
اگرچہ حسب ظاہر میں ہے فرقت درمیاں لیکن   تصور دل میں میرے جلوہ گر ہے صبح و شام اُس کا
محبت کے مرے دعوے پہ تا ہووے سند مجکوں   لکھیا ہوں صفحۂ سینہ پہ خون دل سوں نام اُس کا
کفر کوں توڑ دل سوں دل میں رکھ کر نیت خالص   ہوا ہے رام بن حسرت سوں جا لچھمن سوں رام اُس کا

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا   دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا
حسن کے خضر نے کیا لبریز   آب حیواں سوں جام تجھ لب کا
منطق و حکمت و معانی پر   مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

نہیں درکار تا بولے بیاں اپنی زباں سیتی   عیاں ہے اشک کے طومار سوں احوال عاشق کا
نہ جاوے ملک بیتابی سوں یک لحظہ کدھی باہر   زمین بیقراری میں گڑیا ہے نال عاشق کا
ولی یو مصرع رنگیں ہوا ہے وردِ جانِ دل   فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سوں پیو کا   کرتا ہوں تب سوں ورد الف لام میم کا

پری رویاں کے کوچے میں خبرداری سوں جا اے دل   کہ اطراف حرم میں ڈر ہمیشہ ہے حرامی کا
حقیقت سوں تری مدت سوں ہم واقف ہیں اے زاہد   عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا   مفت ہے دیکھنا سری جن کا

جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں کر مجھے
گھیر رکھتا ہے دور دامن کا

اے زباں کر مدد کہ آج صنم
منتظر ہے بیان روشن کا

حکمت عشق بوعلی سوں نہ پوچھ
نہیں قانوں شناس اس فن کا

آئینہ تجھ سے ہو کے ہم زانو
حیرت افزا ہوا ہے گلشن کا

دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند
خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

لگتا ہے مجکو پنجہ خورشید رعشہ دار
دیکھا ہوں جب سوں دست نگارین نگار کا

ہر ذرہ اُس کی چشم میں لبریز نور ہے
دیکھا ہے جن نے حُسن تجلی بہار کا

طاقت نہیں کسی کو جو یک حرف سُن سکے
احوال گر کہوں میں دل بیقرار کا

پڑیا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ مُکھ کی لالی کا
بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا

ترا قد مصرع برجستہ دیوان خوبی ہے
تری یو بیت ابرو شعر دستا ہے ہلالی کا

ترے لب کی حلاوت نے کیا مجھ طبع کو شیریں
ہوا ہے نقل مجلس ذکر مجھ شیریں مقالی کا

نزاکت تجھ کمر کی دل نشیں ہے اس سبب ساجن
ہوا ہے شہرہ عالم میں مری نازک خیالی کا

رنگیلے شوخ کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں
توایو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا

ولی تجھ شعر کو سنکر ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

عبث غافل ہوا ہے گا فکر کر پی کے پانے کا
صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

چراغ دل اگر گل ہے تو کر جیوں گل اُسے روشن
کہ یہ تحفہ ہے سالک کوں نزک حق کے لے جانے کا

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش
قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

لاگی ہے لگن تم سے چھُڑا کون سکے گا
اب مجکوں وطن اپنے لیجا کون سکے گا

مارا ہے جو ظالم نے ادایاں سوں ہمن کو
اس جگ میں مری داد دلا کون سکے گا

پھرتی ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے
بن نیندان انکھیاں کو پکڑ کون سکے گا

جس وقت اے سری جن تو بے حجاب ہوگا
ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا

مت جا چمن میں لالن بلبل پہ مت ستم کر
گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا

مت آئینہ کو دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

نکلا ہے وہ ستمگر تیغ ادا کوں لے کر
سینہ کا عاشقاں کے اب فتح باب ہوگا

رکھتا ہے کیوں جفا کوں مجھ پر روا اے ظالم
محشر میں تجھ سوں میرا آخر حساب ہوگا

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہونگا
جادو ہے تری نین غزالاں سوں کہوں گا

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
جا کشور ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

تعریف ترے قد کی الف وار سری جن
جا سرو گلستاں میں خوش الحاں سوں کہونگا

زخمی کیا ہے دل تری پلکاں کی انی نے
یو زخم ترا خنجر و پیکاں سوں کہوں گا

دیکھا ہیں تجھے خواب میں اسے ماہ یہ خوبی
اس خواب کو جا یوسف کنعاں سوں کہونگا

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن
اے چمن زار حیا دل کے گلستاں میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بد خو
دیو مختار ہوا ملک سلیمان میں آ

کتاب حسن کا یہ مکھ صفا ترا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دستا

ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چیں پیشانی
اپر ابرو کی کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دستا

ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی
یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا

اشارت کر انکھاں سوں گرچہ ہوں بیمار ہیں لیکن
ترا لب اے مسیح وقت قانون شفا دستا

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن / مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

مت آتش غفلت سوں مرے دل کوں جلا جا / مشتاق ہوں تجھ درس کا ٹک درس دکھا جا
آزردہ نہ ہو، غصہ نہ کر، بات مری سُن / ڈرتا نہیں یک بات کی سو بات سُنا جا
جلتا ہوں میں مدت ستی اے حُسن کے دریا / ٹک مکھ کوں دکھا، آگ، مرے دل کی بجھا جا
خواہش ہے مجھے ورد کے پڑھنے کی ہمیشہ / یکبار کسو طرز سوں ٹک اسم بتا جا

دل کو لگتی ہے دلربا کی ادا / جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا
گرچہ سب خوبرو ہیں خوب ولے / قتل کرتی ہے میرزا کی ادا
حرف بیجا بجا ہے گر بولوں / دشمن ہوش ہے پیا کی ادا
نقش دیوار کیوں نہ ہو عاشق / حیرت افزا ہے بیوفا کی ادا
گُل ہوے غرقِ آب شبنم میں / دیکھ اُس صاحب حیا کی ادا
اشک رنگیں میں غرق ہے نس دن / جن نے دیکھی ہے تجھ حنا کی ادا
اے ولی درد سر کی دارو ہے / مجکو اُس صندلی قبا کی ادا

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا / نہیں دیکھتا سُرج کی جھلکار کا تماشا
رشتے کوں بندگی کے ڈالیا اپس گلے میں / دیکھا جو تجھ صنم کے زنار کا تماشا

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا / اُس کوں پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا
کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف / بس ہے موحداں کوں منصور کا تماشا

تیرے شکر لب کو اب مثل عسل بولنا / بلکہ عسل ہے نقل اُس کوں اصل بولنا

تجھ حسن عالم تاب کا جو عاشق و شیدا ہوا — ہر خوبرو کے حسن کے جلوے سوں بے پروا ہوا
ہیں صفحۂ گل کے جوہراں میرے سخن سوں جلوہ گر — از بسکہ وسعت مشربی سوں دل مرا دریا ہوا
پایا ہے جگ میں اے ولی وہ لیلی مقصود کوں — جو عشق کے بازار میں مجنوں نمن رسوا ہوا

تجھ مکھ کے مصحف کے بھتر آیت جو دیکھی قہر کی — ہیبت سوں جیوں زیر و زبر دل ٹوٹ، سی پارا ہوا
غافل نہ رہ اے سنگدل ہرگز ولی کے حال سوں — جس آہ کی آتش کوں سن خارا کا دل پارا ہوا

جب صنم کو خیال باغ ہوا — طالب نشۂ فراغ ہوا
فوج عشاق دیکھ ہر جانب — نازنیں صاحب دماغ ہوا
رشک سوں تجھ لباں کی سرخی کے — جگر لالہ داغ داغ ہوا
دل عشاق کیوں نہ ہوں روشن — جب خیال صنم چراغ ہوا
اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ — دل صد برگ باغ باغ ہوا

مسجود آفتاب ہوا ہے شرف سوں آج — وہ نقش پا کہ زینت روئے زمیں ہوا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
مدت ستی مشتاق ہیں عشاق جفا کے — بیداد کہ وہ ظالم بیداد نہ آیا
جاری کیا ہوں جوئے رواں اشک رواں سوں — افسوس کہ وہ غیرتِ شمشاد نہ آیا
جس غم منیں موزوں کیا ہے آہ کا مصرع — وہ مصرعِ دلچسپ پری زاد نہ آیا
پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولی کی — لیکن وہ صنم سُننے کو فریاد نہ آیا

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا — میرا سخن راست اُسے راس نہ آیا
بیگانی لگی بات یگانے کی عجب ہے — آخر کو اُسے غیر سوں وسواس نہ آیا

بلبل کی نمط نالہ و زاری میں ہوں شب و دن — افسوس وہ گلدستۂ خوش باس نہ آیا
اُس یار وفادار سوں مجھ آس تھی لیکن — ہرگز وہ بجھانے کو مری پیاس نہ آیا

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا — فسخ و باطل خطِ تدبیر کیا
بند کرنے دلِ وحشی زدہ کوں — دامِ رہ زلفِ گرہ گیر کیا
جز الم اُس کو نہ ہووے حاصل — عشقِ بے پیر کوں جن پیر کیا
گریہ و گرز ملامت سوں ولی — خانۂ عشق کوں تعمیر کیا

کشورِ دل کوں ترے ناز نے تسخیر کیا — فوج مجنوں کوں تری زلف نے زنجیر کیا
عاشقِ زار سمجھ مجھ سوں ہوا ہے بیزار — نقدِ دل دے کے میں دلدار کو دلگیر کیا
گردِ غم، آبِ نین، درد کے معمار نے لے — خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

براگی جو کہاتے ہیں، اُسے گھر بار کرنا کیا — ہوی جوگن جو کوئی پی کی اُسے سنسار کرنا کیا
جو پیوے پرت کا پانی اُسے کیا کام پانی سوں — جو بھوجن دکھ کا کرتا ہے اُسے آدھار کرنا کیا

معنی طرف چلیا ہے صورت سوں یوں مرا دل — سورت ستی چلیا ہے کعبے جہاز گویا
ہر یک نگہہ میں تیری ہے نغمۂ محبت — ہر تار تجھ نگہہ کا ہے تارِ ساز گویا

باعثِ نشۂ دو بالا ہے — حُسنِ صورت کے ساتھ حُسنِ ادا
اے ولی مجھ سخن کو وہ بوجھے — جس کو حق نے دیا ہے فکرِ رسا

حق نے لَولَاكَ لَمَا حق میں محمد کے کہا — اُن سوا کون سے مُرسل نے یہ رتبہ پایا

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب — دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب
جاتا ہے دن تمام اُسی مکھ کی یاد میں — ہوتا ہے فکر زلف میں احوال شب عجب

بیتاب ہو کے مشکل گدایاں نزیک جا — بیباک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
دونین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال — سُن یو سوال دل میں رہا پستہ لب عجب
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں — جس دیکھنے سوں دل میں ترے ہے طرب عجب
اس دولت عظیم کوں یوں مفت مانگنا — لگتی ہے مجکوں بات تری بے ادب عجب

مجھے اسباب خود بینی سوں دائم نکس ہے دل میں — کیا جو ترک زینت کوں اُسے درپن سوں کیا مطلب
سخن صاحب سخن کا سُنکے ملنے کی ہوس مت کر — جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب
ولی جنت منیں رہنا نہیں درکار عاشق کوں — جو طالب لامکاں کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

ہمیشہ ہے بہار سرو آزاد — نہ جاوے دولتِ حُسن خداداد
وفا کو ترک مت کر ہرگز اے دل — محبت ہے وفا بن سست بنیاد

مت پست فطرتاں سوں مل اے سرو نازنیں — تجھ قد کا نام جگ میں ہے نام خدا بلند

سُخن شناس کے نزدیک کم نہیں زر زید — کسی کے مطلب رنگیں کوں جو کیا ہے شہید
یہ زلف و خال سیہ نے دیا ہے جگ کوں فریب — دغا کے دینے میں یک رنگ ہیں یہ پیر و مرید
کھُلا ہے عقدۂ دل تجھ پلک کی سوزن سوں — ترے نین کا اشارہ ہے قفل دل کی کلید

سجن تجھ گلبدن کا آج نہیں ثانی چمن بھیتر — غلط بولا چمن کیا بلکہ جنات عدن بھیتر

اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر　　بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
راست کیشاں سوں اے کماں ابرو　　کج ادائی نہ کر خدا سوں ڈر
مت تغافل کوں راہ دے اے شوخ　　جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل　　آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
عاشقاں کو شہید کر کے صنم　　کف حنائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیر آستانۂ یار　　جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

رحم بیجا ستم برابر ہے　　توں رقیباں اُپر کرم مت کر

عالم میں ہے وہ تیر ملامت کا نشانہ　　جس تن سوں، ترے غم کا گیا تیر گزر کر
تجھ حسن کی جھلکار سوں کیا بدر کوں نسبت　　جو کوئی کہ تجھے بدر کہے اُس کو بدر کر
اُس ظالم خونخوار کوں جی پیش کیا ہوں　　جس عشق نے عالم کوں دیا زیر و زبر کر

دل لگا یار سوں اُس دل کا چھڑانا مشکل　　عشق کا زخم لگا اس کا سلانا مشکل
حسن ہے دام بلا زلف ہیں دو کالے ناگ　　جس کے تئیں ناگ ڈسا اُس کا جلانا مشکل
آتش عشق نے بھتوں کا کیا خانہ خراب　　آگ دریا کوں لگی اُس کا بجھانا مشکل
یاد کرنے کوں لیا ہاتھ میں من کا منکا　　دل اُپر بوجھ پڑے من کا پھرانا مشکل
راز مخفی ولی ظاہر نہ کسو سوں کرنا　　ہاتھ سوں بات گئی اُس کا پھر آنا مشکل

جیوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم　　جیوں شمع سر بلند ہیں ہر انجمن میں ہم

قسمت تری ہے حق پہ نہ ہونا امید یہاں　　نہیں اس قفل کوں غیر توکل کلید یہاں
سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ　　آخر ہے روزہ دار کوں اک روز عید یہاں

ظلمات میں یہ غم کے ملے گا تجھ آب خضر — دامن تلے ہے رات کے روز سفید یہاں
سب کام اپس کے سونپ کے حق کو نچنت رہ — یہ ہے تمام مقصد گفت و شنید یہاں

دل ہوا ہے مرا خراب سخن — دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں — تا قیامت کھلا ہے باب سخن
گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے — جن نے دیکھا ہے آب و تاب سخن
ہے تری بات اے نزاکت فہم — لوح دیباچۂ کتاب سخن

یک بار مری بات اگر گوش کرے توں — ملنے کو رقیباں کے فراموش کرے توں
ہے بسکہ تری نین میں کیفیت مستی — یک دید میں کونین کو بیہوش کرے توں
اے سرو گل اندام اپس نقش قدم سوں — بر جا ہے اگر صحن کوں گل پوش کرے توں
اے جان ولی وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے توں

چلنے منیں اے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں — بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر — جب اوٹ میں پردے کی چہرے کوں دکھاوے توں
لوئی فلک مکھ میں انگشت تحیر لے — جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں بجاوے توں
یک تان سنانے میں جی جان لیا سب کا — اب دل سوں گزر جاویں، گر بھاؤ بتاوے توں

کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرو عریاں کے حضور — خود بخود رسوا ہے اس کوں پھر کے رسوا کیا کروں

خدایا ملا صاحب درد کوں — کہ میرا کہے درد بے درد کوں
کرے غم سوں صد برگ صد پارہ دل — دکھاؤں اگر چہرۂ زرد کوں

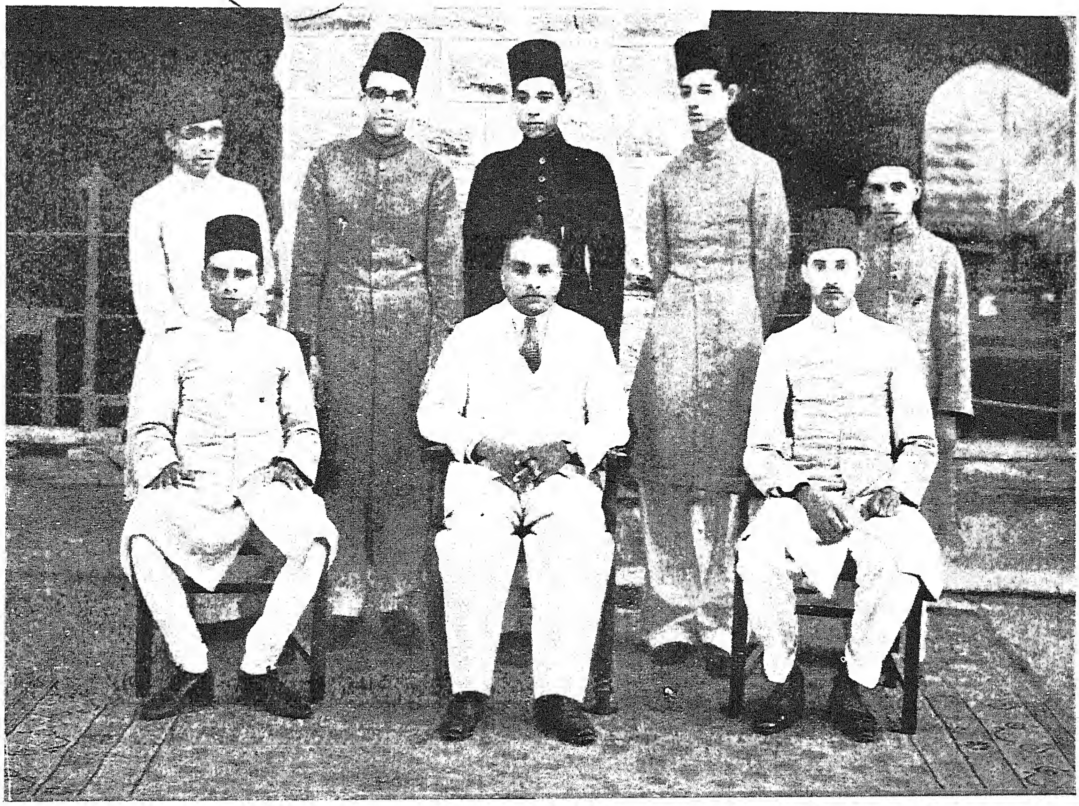

مجلس ادارت الموسی سنہ ۱۳۴۶ ف

''بلاک ساختہ ہاف ٹون ورکس''

یکبارگی ہوتا ہے ولی زر کے نمن زرد — جب باندھ کے آتا ہے تو دستار زری کوں

پڑے سنکر اچھل جیوں مصرعِ برق — اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں — شہیدِ شاہدِ گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رُو کے ملنے کا نہیں شوق — سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترکِ نرگس کا تماشا — طلبگارِ نگاہِ باحیا ہوں
نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس — کہ میں اُس سرو قد کا مبتلا ہوں

پیدا ہوا ہے جگ میں ولی صاحبِ سُخن — میری طرف سوں جا کے کہو انوری کے تئیں

تیری تواضع دیکھ کر بجا ہے اے جانِ ولی — گر بوعلی سینا لکھے دفتر ترے اخلاق میں

دل نے تسخیر کیا شوخ کوں حیرانی میں — آرسی شہرۂ عالم ہے پری خوانی میں
خط کے آنے نے خبردار کیا گلرو کوں — نشہ ہوش ہے اس بادۂ ریحانی میں
جوہر آئینہ تجھ خط کی سنا جب سوں خبر — صبح گوہر کی نمن غرق ہوا پانی میں
خط کا آخر کوں ہوا رخ پہ پری رو کے گزر — مور کوں راہ ملی ملکِ سلیمانی میں
دلِ بے تاب کہ اک آن نہیں اُس کوں قرار — زلفِ دلدار سوں ہمسر ہے پریشانی میں

کیوں کہ سیری ہو حُسن سوں تیرے — دھوپ کھانے سوں پیٹ بھرتا نہیں

مجھ کوں تجھ بن کسی سوں کام نہیں — فکرِ ناموس و ننگ و نام نہیں
صفِ عشاق کوں بکعبہ قسم — غیر آوارگی امام نہیں

گرچہ چھِمن ترا ہے رام ولے — اے سجن تو کسی کا رام نہیں
زندگی جامِ عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عشق اُس کا ہے ناتمام جسے — پی کی خاطر کا اہتمام نہیں

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو — صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اُس کوں کہہ سکیے — جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

گردِ خجلت کوں ندامت کے انجھو ساتھ ملا — مور درِ حمتِ حق اس ستی تعمیر کرو
عشق کہتا ہے ولی آکے بہ آواز بلند — اے جواناں تمھیں سب درد کوں مل پیر کرو

چاہو کہ پی کے پگ تلے اپنا وطن کرو — اول اپس کوں عجز میں نقش چرن کرو

سفرِ عشق کا اگر ہے خیال — ہمت دل کوں زاد راہ کرو
عاشقاں! عاشقی کے دعوے پر — آہ و زاری کوں دو گواہ کرو
گل و بلبل کا گرم ہے بازار — اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

پاکبازاں میں ولی ہے مشہور — اُس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرو

فکرِ جمعیت اپس دل میں کئے ہیں زہاد — زلف کو کھول غریبوں کو پریشاں نہ کرو

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو ہشیار رہو ‏ کب لگ رہیگا خواب میں بیدار رہو بیدار رہو
گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہد معنی کا رُو ‏ ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار رہو بیزار رہو
وہ نو بہار عاشقی ہے جیوں سحر جگ میں عیاں ‏ اے دیدہ وقت خواب نہیں بیدار رہو بیدار رہو

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ ‏ کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر ‏ ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ
سلونی سانوری پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے ‏ کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی ‏ آپ بس نہیں پر بسی ہے پر بسی
کل رقیبوں میں کرم میرے اُپر ‏ جزرسی ہے جزرسی ہے جزرسی
رات دن جگ میں رفیقِ بیکساں ‏ بےکسی ہے بیکسی ہے بےکسی
شست ہونا عشق میں تیرے صنم ‏ ناکسی ہے ناکسی ہے ناکسی
باعثِ رسوائی عالم ولی ‏ مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

اُس کوں حاصل جگ میں ہو کیوں کر فراغ زندگی ‏ گردشِ افلاک ہے جس کوں ایاغ زندگی
بے عزیزاں سیر گلشن ہے گُلِ داغِ الم ‏ جنت احباب ہے معنی میں باغِ زندگی
آسماں میری نظر میں کُلبۂ تاریک ہے ‏ گر نہ دیکھوں تجکوں اے چشم و چراغِ زندگی
لالۂ خونیں کفن کے خال سوں ظاھر ہوا ‏ بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغِ زندگی
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شب قدرِ حیات ‏ ہے نگاہِ کرمِ گُل رُویاں چراغِ زندگی

جسے عشق کا تیر کاری لگے ‏ اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک ‏ جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار ‏ جسے عشق کی بیقراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں　　پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن　　رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

تعریف اُس پری کی جسے تم سُناؤ گے　　تا حشر اُس کے ہوش کوں اُس میں نہ پاؤ گے

چھوڑ اے شوخ طرز خود کامی　　مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی

تجھ لب و زلف کے تماشے کوں　　چل کے آئے ہیں مصری و شامی

اے ولی غیر عشق حرفِ دگر　　پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کوں　　کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز　　اے باعثِ جمعیت ایام جوانی

نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے　　بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے

تغافل شوخ کا عاشق کے حق میں　　ستم ہے ظلم ہے جور و جفا ہے

نہ جاوے تجکوں چھوڑ اے گلشن ناز　　مرا دل بلبلِ باغ وفا ہے

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے　　مجھے فکر سخن کرنا روا ہے

تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ　　تری یہ کم نگاہی نیمچا ہے

نہیں واں آب غیر از آب خنجر　　شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے

غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے　　نگاہِ پاکبازاں کیمیا ہے

دیکھا ہوں جسے وہ مبتلا ہے　　خوباں کی نگہ نہیں بلا ہے

گر تجھکوں ہے عزم سیر گلشن　　دروازۂ آرسی کھلا ہے

اک دل نہیں آرزو سے خالی — بھر جا ہے محال اگر خلا ہے
تسخیر کیا ہے گوشِ گل کوں — بلبل کا ولی عجب گلا ہے

ساقی و مطلوب آج ہیں ہم رنگ — نشۂ بے خودی دوبالا ہے
کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیما ہے

عشق کے مفتی نے یوں فتوے دیا — دیکھنا خوباں کا درس خوب ہے
لختِ دل پر خط لکھا ہوں یار کوں — داغِ دل مہرِ سرِ مکتوب ہے
غمزہ و ناز و ادائے نازنیں — ظلم ہے طوفان ہے آشوب ہے
لکھ دیا یوسف غلامی خط تجھے — گرچہ نورِ دیدۂ یعقوب ہے

عاشقاں کی قید تیرا حُسن عالمگیر ہے — بلبلاں کوں بند کرنے، موجِ گل زنجیر ہے
تجھ نین کی ہے نگاہِ راست تیرِ بے خطا — کج ادائی تجھ بھنواں کی جوہرِ شمشیر ہے

موسمِ خط میں نہ کر نکر اے گلِ رنگیں ادا — سبزۂ گلزارِ خوبی کا ہنوز آغاز ہے
زندگی میں طائرِ دل کوں خلاصی کیوں کہ ہو — پنجۂ عشقِ ستمگر چنگلِ شہباز ہے
دردمنداں کوں سدا ہے قولِ مطربِ دل نواز — گرمیٔ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

شوق کے مرکب کوں راہِ عشق میں — اے سجن تیری نگہ مہمیز ہے
ہر پلک تیری کہ ہے تیغِ فرنگ — عاشقاں کے مارنے کوں تیز ہے
ہاتھ میں میرے نہ سمجھو تم بیاض — شوخ کے ملنے کی دست آویز ہے

خاطر سوں گئی ہے خواہشِ اسبابِ دنیوی کی — ہمت برہ کی رہ میں مجھ زادِ راہ بس ہے

جو صاف دل ہیں اُن کوں درکار نہیں ہے زینت
جیوں آرسی، ہُمد کی سر پر کلاہ بس ہے

اسباب جنگ رکھنا درکار نہیں ہے ہم کوں
دشمن کے مارنے کوں اک تیر آہ بس ہے

نہیں آرزو کہ بیٹھوں مسند پہ سلطنت کی
تیری گلی میں آنا، یہ دستگاہ بس ہے

درکار نہیں ہے مسجد سجدے کوں عاشقاں کے
محراب تجھ بھواں کی اے قبلہ گاہ بس ہے

مت تیر اور کماں کی کر فکر اے خوش ابرو
عاشق کے مارنے کوں سیدھی نگاہ بس ہے

دل لے گیا ہمارا جادو سوں وہ پری رُو
دیوانگی ہماری اس پر گواہ بس ہے

جس کو تجھ حُسن کی نہیں ہے خبر
بے گماں وہ جہاں میں غافل ہے

عشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

اے ولی طرز عشق آساں نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے
سنبھال کشتی دل کوں قلندری یہ ہے

نکال خاطر خاتر سوں جام جم کا خیال
صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے

تو جان بوجھ، اجانا ہوا سو میں بوجھا
کہ زندگی منیں مقصود زرگری یہ ہے

خیال یار کوں رکھ اپنے دل میں محکم کر
کہ عاشقاں کے نزک شیشۂ پری یہ ہے

بسا عزیز ہیں تجھ مکھ کے آفتاب پرست
تو جلوہ گر ہو کہ اب ذرہ پروری یہ ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کہ حاصل ہو مجکوں جمعیت
زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے

کیوں کہ ملنا صنم کا ترک کروں
دلبری اختیار کھوتی ہے

عشق بے تاب جاں گدازی ہے
حُسن مشتاق دل نوازی ہے

اشکِ خونیں سوں جو کیا ہے وضو — مذہبِ عشق میں نمازی ہے

جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ — وہ زمانے کا فخرِ رازی ہے

پاک بازاں سوں یوں ہوا معلوم — عشق مضمونِ پاکبازی ہے

جا کے پہنچی ہے حدِ ظلمت کوں — بس کہ تجھ زلف میں درازی ہے

تجربے سوں ہوا مجھے ظاہر — نازِ مفہومِ بے نیازی ہے

اے ولی عشقِ ظاہری کا سبب — جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

کوچۂ یار عین کاسی ہے — جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

پی کے بیراگ کی اُداسی سوں — دل بھی بیراگی و اُداسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال — ہندوے ہر دوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی — پاس تل اُس کے جیوں سناسی ہے

گھر ترا ہے یہ رشک دیوا چیں — اس میں مدت سوں دل اُدہی ہے

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے — نین جامی، جبیں فردوسی، و ابرو ہلالی ہے

ریاضی فہم و گلشن طبع و دانا دل، علی فطرت، — زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زُلالی ہے

نگہ میں فیضی و قدسی سرشت، طالبِ شیدا — کمال بدر دل اہلی و انکھیاں سوں غزالی ہے

توہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت — ترے ابرو یہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل — توہر اک بیت عالی اور ہر اک مصرع خیالی ہے

باعثِ دلربائی عاشق — خوش نگاہوں میں خوش نگاہی ہے

مت تصور کرو مجھ دل کوں کہ ہر جائی ہے — چمنِ حسن پری رو کا تماشائی ہے

اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق . کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

شکر، وہ جان گئی، پھر آئی عیش کی آن گئی پھر آئی
تیرے آنے ستی اے راحت جاں شہر کی جان گئی پھر آئی
پھر کے آنا ترا ہے باعثِ شوق جس طرح تان گئی پھر آئی

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے تیری نگاہ گرم سوں گُل گل پگھل گئے
صافی ترے جمال کی کاں لگ بیاں کروں جس پر قدم نگاہ کے اکثر پھسل گئے

در نعت حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دو نین کر ابر بہار پیچ کھا سینے میں دل کوں سنبلستانی کرے
مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاویگا جو کوئی مثل اسماعیل اول جی کوں قربانی کرے
جوش دے یکبارگی دریا کوں دل کے لہو ستی گوہر انجھواں کوں رو رو رنگ مرجانی کرے
جو اپس تن کو گلاوے عشق میں ہر صبح و شام وہچہ کامل ہو سو جیسے ماہِ تابانی کرے
سرخرو ہو آبرو دو جگ میں پاوے اے عزیز دل کو لوہو کر اول لوہو سوں جو پانی کرے
عشق کی آتش میں جالے تن کوں جو کوئی رات دن وہ قیامت لگ سو جیوں سورج درخشانی کرے
وہچہ پاوے مطلب راضیۃ مرضیۃ محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
ورد پڑھنے درد کا انجھواں کی تسبی ہاتھ لے دل کوں کرسی پارۂ غم ذکرِ قرآنی کرے
عشق سوں فارغ جو کوئی وہ نجسِ اکبر ہے مدام ساتویں کھنڈ پر اگر ایوان کیوانی کرے
وہچہ دانا ہے تجے کر دوں دوں کوں اے عزیز مٹ کے دنیا کوں جو کوئی جگ میں خدا دانی کرے
اپنے مطلب کے سوں لیلیٰ کا دہی دیکھے جمال عشق میں دل کو جو مجنوں بیابانی کرے

حشر میں شیریں ہو وہ حق سوں سُنے شیریں بچن
شوق میں دل کوں جو فرہاد کُہستانی کرے

بوریائے بے ریا کوں تخت سوں بوجھے ادھک
تُس اُپر ہو کر سلیماں شکر رحمانی کرے

جیوں انگوٹھی میں نگینہ یوں کرے تسخیر خلق
تخت دل کوں جو بہ از تخت سلیمانی کرے

زندگی پاوے ابد کی جگ منیں وہ خضر وقت
جو اپس کوں فدوی محبوب سبحانی کرے

یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے

وہ اچھے آزاد جو بازار میں تجھ حُسن کے
بندگی میں آپ کو جیوں ماہ کنعانی کرے

زینوا الحانکم کا گر سُنے داؤد ناد
ہووے خوش، دربار پہ تیرے خوش الحانی کرے

نوح تجھ رحمت کی کشتی باج کہیں پاوے نہ ٹھاؤں
تجھ غضب کا گر سمندر جوشِ طوفانی کرے

رتبہ عالی میں دیکھے حق نزیک اپنا کلام
گر کلیم اللہ آ تیری ثنا خوانی کرے

جسم کوں مت روح سوں آوے بہت مشتاق ہو
گر تری امت خلیل اللہ کی مہمانی کرے

تب مسیحا فقر کے خط کوں سکھے گا تجھ نزیک
مشق کرنے فقر کی جب لوح پیشانی کرے

جس مکاں میں ہے تمھاری فکر روشن جلوہ گر
عقل اول آ کے واں اقرار ناد انی کرے

حکمتاں کی سب کتاباں دھوسٹے یکبار گی
گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

تجھ قدم پر جو اپس کا سیس راکھے جیوں سرج
وہ قیامت لگ اپس چہرے کوں نورانی کرے

کیا ملک کیا انس و جن یہ جگ میں کس کوں ہے سکت
خط بنا تجھ کھ کے جو تفسیر قرآنی کرے

دیکھ طوبیٰ قد ترا جنبش میں آوے شوق سوں
جب گلستان ارم کی تو خراسانی کرے

عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

مثنوی

الٰہی! دل اُپر دے عشق کا داغ
یقیں کے نین میں سٹ کحل مازاغ

الٰہی! عشق میں مشتاق کر مجھ
اپس کے عشق کا مشتاق کر مجھ

شریعت کا جہاں ہے شارع عام
یہ تن کا وھانچہ کر آغاز و انجام

عیاں کر دل اُپر رازِ طریقت
سنے پر کھول ابواب حقیقت

پر کھنے معرفت کا جو ہر صفات   اپس کے فرض سوں کر دل کوں صراف
چمن میں شوق کے دل کھول جیوں گل   اسی گل کے اُپر کر دل کوں بلبل
مجھے دے نقش گل سوں دل میں داغاں   مرے مقصد کے روشن کر چراغاں
برہ کی بارگہ میں مجکوں جا دے   مجھے اس شوق کی عشرت سدا دے
یہ دل معمور کر جیوں شیشۂ مل   پریشانی نہ دے مانند سنبل
محبت کی عطا کر مے پرستی   اپس کی معرفت کی بخش مستی
جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ   اپس کی یاد سوں آباد کر مجھ
برہ کے باغ میں دے آبداری   ہمیشہ رکھ جھڑی نیناں کی جاری
مجازی کی مجالس سوں جدا رکھ   مجھے اس پنتھ سوں نا آشنا رکھ
حقیقت کی زلف کا کھول بستار   سو یک یک تار کا مجھ کر گرفتار
شتابی سوں دے لے ساقی مہرباں   برہ کا جام جیوں سورج درخشاں
کہ خورشید نبوت کی مدح میں   کنول کا دل کھلا سینہ کے دوح[1] میں
محمد وہ کہ جس کے حق میں لولاکؑ   کہا ہے خالق املاک و افلاک
عجب گلزار ہے وہ مظہرِ گل   کہ ہے جس باغ کا خورشید اک گل
وہی ہے بیدلاں کا دل کشا باغ   وہی ہے عاشقاں کا مرہم داغ
اُسی کا ذکر ہے ایمانِ مومن   اُسی کی یاد اطمینانِ مومن ؛
وہی ہے باغِ اقدس سرورِ دیں   کہ جس کے باغ کا رضواں ہے گل چیں
کھلا کونین میں وہ دین کا گل   دو جگ مشتاق اُس کے مثل بلبل
دو عالم جسم وہ ہے جانِ عالم   نبیاں امرا وہ ہے سلطانِ عالم
دکھایا عاشقاں کوں عشق کی راہ   کیا عارف کوں عرفاں بیچ آگاہ
ہوا جو کوئی اُس گل سوں معطر   رہا وہ مست ہو، تا روزِ محشر

---

[1] منتخب اللغات میں اس لفظ کے معنی کسی چیز کا زمین میں پوشیدہ کرنے کے لکھے ہیں مگر یہاں ربط کلام سے دُوحہ باغ کا مخفف قیاسی معلوم ہوتا ہے۔

کیا حق اُس ابوالارواح خاطر
مرتب چار دیوار عناصر

ہوا جب چار باغ دین روشن
شریعت سا کھلا اُس بیچ گلشن

سنواری گرد اُس کے چار دیوار
حقیقت میں سمجھ ہیں یار وہ چار

وہ ہیں مقبول درگاہِ صمد کے
وہی ہیں منتخب اس چار حد کے

دے، اے ساقی پیالے جام دو چار
کہ مائل ہوں اُسی مے کا میں لاچار

جو بخشے وہ مجھے یک جوش مستی
فراموشی میں بھوے خود پرستی

مثنوی در تعریف شہر سورت

عجب شہراں میں ہے پُر نور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دہر

اہے مشہور اُس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور
اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور

شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب
ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب

سرج سن آب اُس کی جگ میں کانپا
سمندر موجزن رگ رگ میں کانپا

کنارے اُس کے اک دریائے تپتی
کہ دنیا دیکھنے کوں اُس کے تپتی

کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں عرق
ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق

شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ
دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ

کہ آبِ خضر کی ہے اُس میں تاثیر
ہوا دیتی ہے اُس کی یاد کشمیر

وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم
صبح اور شام جپ کرتا ہے عالم

عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ
انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ

نزک قلعے کے بار اگھاٹ ہے وہاں
کہ دائم گلرخاں کی ہاٹ ہے وہاں

رہے اس حاشیے پر جائے آرام
طلسمی باغ واں ہوتا ہے ہر شام

اے، بلبل پاک بینی سوں نظر کر
کثافت کی نظر سوں بس حذر کر

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گُل
ہر اک گُل کے نزک وہاں پر ہے سنبل

جو کُئی دیکھا ہے اُن کا باغِ رخسار
ہوا اک دید میں وہ محوِ دیدار

جو ہیں وہ محض تصویرات اخلاص
سو عاشق پروری میں وہچہ ہیں خاص

کہاں ہے ساقی اخلاص انگیز
محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز!

صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ
کروں اُس دردے کوں مرہم داغ

اچھے سورت حقیقت کی نشانی
کہ ہیں معمور وہاں اہلِ معانی

شرافت میں یہ ہے جیوں بابِ مکہ
تو ہے سب ملک پر اُس کا جو سکہ

اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز
نہ دیکھا کوئی ایسا مُلک زرخیز

کہ اُس بھیتر کتے ایسے ہیں تجّار
کہ تاروں کوں نہیں اُن کے نزک بار

اِتی آتش پرستاں کی ہے بستی
سکھے نمرود واں آتش پرستی

فرنگی اِس میں رتے ہیں کا پوشش
عدد وہاں جنکی گنتی میں ہے بیہوش

وہاں ساکن اِتے ہیں اہلِ مذہب
کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب

اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم
ولے بنیش میں رنگا رنگِ عالم

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت
ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

ختم ہے امرداں پر رہ صفائی
ولے ہے بیشتر حُسنِ نسائی

سبھا اِندر کی ہے ہر اک قدم میں
چھپا اِندر، سبھا کو لے عدم میں

کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل
کہ ہیں سب گوپیاں وہ نقل، یہ اصل

زُلف اور مُکھ کے طالب سوں پچھو بات
جسے ہر دن ہے عید، ہر رات شبرات

ہزاراں اس سبب شیدا ہیں بُلبل
کہ ہیں وہاں غنچۂ لب دائما گل

نہ کئی دقت سوں کھینچے شوخ چنچل
وہ مکھ کے باغ کن دیوار انچل

نظر بھر کر دیکھو ہر گل بدن کوں
کہ ہے پڑدے سوں بے پروا اُتن کوں

رہے وہاں عاشقاں کو عام آواز
کہ نہیں پردہ بغیر از پردۂ ناز

کسی کوں نہیں نظر بازی بنا چین
کھُلے ہیں رات دن سب غرفۂ نین

ہر اک لب ہیں سوں جیوں یاقوت انمول
کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

وہ باتاں نہیں سراپا ہے مٹھا قند
کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند

پڑا شیریں بچن سُن اُن کے بس جو
پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُن کو نکلنا کام دشوار
رہا تھا آخری دم تک گرفتار

شہر بھیتر جو آوے نھان کا دن
ہندو کی قوم کے اشنان کا دن

ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج
تجلی کے سمندر کی اُٹھے موج

نین کی بیٹھ کشتی پر تو لے پاک
یہ طے کر ہیچ میں موج خطرناک

مہرباں ہو کے لے ساقیٔ کوثر
کرم سوں کشتی مے مجکوں دے بھر

اپس کے لُطف سوں کرنے عطائے
جو اِس نشئے میں دریا کوں کروں طے

عبث باتاں ہیں بس کر اے ولی تو
نہ کر مقصد سوں اپنے کاہلی تو

قطعات در فراقِ گجرات

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منیں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اِس کے زخم کا جہان منیں
شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں
جیوں بال ہے اگن کے اُپر بیقرار دل

اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا
آخر کوں اِس فراق میں کھینچا خمار دل

میرے سینے میں آکے چمن دیکھ عشق کا
ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی
دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں
ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل

سب عاشقاں حضور، اچھے پاک سُرخ رو
اپنا اپس لہو سوں کیا ہے نگار دل

حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں
پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

مجمر نہیں ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں
اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں
اس میکدے سوں اُٹھکے چلا سدھ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں   پھر اُس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

حُسن دلبر کا خواب میں دیکھا   نورِ حق تھا حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا   یہ تماشا جاب میں دیکھا

مُستزاد

بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کوں بدن میں   گُل پیرہناں کا
جیوں غنچہ کیا بند محبت کے چمن میں   رنگیں دہناں کا
مجھ دل کی نمن عشق سوں گردش میں ہمیشہ   تنہا نہیں خورشید
مشتاق ہو پھرتا ہے سدا ماہ گگن میں   سیمیں بدناں کا
مت پوچھ کہ ہے آپ سوں وحشت منیں آہو   اے کُشتۂ خوباں
پھیلا ہے سحر جا کے یہ اطراف ختن میں   جادو نیناں کا
رکھتا ہے محبت کا سدا داغ جگر پہ   ہر لالۂ رنگیں
تجھ عشق سوں کیا حال ہے ٹک دیکھ چمن میں   خونیں کفناں کا
فرہاد کی آتی ہے صدا روح صبا ہو   مجھ شعر کو سننے
مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں   شیریں بچناں کا

ولہ

لاگی ہے لگن تم سوں چھڑا کون سکے گا   ہے کس میں یہ قدرت
اب مجکوں وطن اپنے لجا کون سکے گا   کر دل سوں رفاقت
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر   اے ہند کے بانکے

دامن کوں ترے ہاتھ لگا کون سکے گا　　ہنیں زور نہ طاقت
ہوں خاک تمھاری ہی گلی کا اے سری جن　　ہنیں کام کفن سوں
اب مجکوں جنازے میں اُٹھا کون سکیگا　　یوں گر ہے حقیقت
مت مار ولی کوں میں یہ کہتا ہوں کہا کر　　سُن بات ہماری
اس ہجر کے طومار کو پا کون سکے گا　　بن غمزہ نظرانت

مخمسات

تجھ قد نے مجھ نگاہ کوں عالی نظر کیا　　تجھ مکھ نے شوق بدر کوں دل سوں بدر کیا
لب نے ترے عقیق کوں خونیں جگر کیا　　مستی نے تجھ نین کی مجھے بے خبر کیا
دل کو مرے بھواں نے تری جیوں بھنور کیا

تجھ چشم تیرہ باز کی جرات کوں دل میں رکھ　　تیری بھواں کی تیغ کی دہشت کوں دل میں رکھ
پلکاں کے خنجراں کی صلابت کوں دل میں رکھ　　تیری نگہ کے تیر کی ہیبت کوں دل میں رکھ
سورج نے تن اپس کا سراسر سپر کیا

ہے تجھکوں مرتبے منیں کیواں سوں برتری　　تجھ مکھ کوں دیکھ دنگ ہیں کیا حور کیا پری
ناہید میں کسی نے نہ دیکھی یہ دلبری　　تجھ مہر کا ہوا ہے دل و جاں سوں مشتری
جب سوں ترے جمال پہ مہ نے نظر کیا

تیرا فراق تھا دل و سینہ پہ شل سِل　　مدت سوں دل رہا تھا ترے غم میں پا بگل
دیکھا نہ تھا میں خواب میں آرام ایک پل　　تب سوں ہوا ہے محمل لیلیٰ کی شکل دل
جب سوں ترے خیال نے دل میں گزر کیا

تیرے درس میں علم معانی پڑھا ہے جی　　تجھ مکھ کو دیکھ شرح بھی شمسیہ کی لکھی ہے
لیلاوتی تو خواب میں پائی ہے منتہی　　ہر شب تری زلف سوں مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

شہرت کا تیری جگ میں بجا ہر طرف ہے ہل　　تجھ سرو قد کوں دیکھ ہوے بند جزو و کل

سرشار تجھ نین کے نشے سوں ہے جام مل   حق تجھ عذار دیکھے سو چا ہے رنگ گُل
پیدا اثر سے لباں ستی شہد و شکر کیا
تیری معاونت میں ہیں نت مرتضیٰ علیؑ   تو اس سبب سوں ملک سخن میں ہوا بلی
خورشید کی نمن ہے تری طبع منجلی   تیرا یہ شعر جگ میں مؤثر ہے اے ولی
تو دل منیں ہر ایک کے جا کر اثر کیا

رُباعیات

میخانۂ جگ کا جسے سر جوش کیا   اُس ہاتھ سوں عالم نے قدح نوش کیا
اُس سیّدِ عالم کوں جو دیکھا یکبار   یکبارگی عالم کوں فراموش کیا

دل، جام حقیقت ستی جو مست ہوا   ہر مستِ مجازی سوں زبردست ہوا
یہ باغ و سما نظر میں تنکے سوں کم   اور عرش عظیم پگ تلے پست ہوا

یہ ہستی موہوم دسے مجکوں سراب   پانی کے اُپر نقش ہے یہ مثلِ حباب
ایسے کے اُپر دل کوں نہ کر ہرگز بند   آپس کوں نہ کر خراب اے خانہ خراب!

تجھ مکھ کا ہے یہ پھول چمن کی زینت   تجھ شمع کا شعلہ ہے اگن کی زینت
فردوس میں نرگس نے اشارے سوں کہا   "یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت"

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف   رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں، موجود سوں کیا نسبت ہے   اولیٰ ہے کہ مائل ہو تو موجود طرف